تحقیق وتعارف

پروفیسر حنیف نقوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

تحقیق وتعارف

پروفیسر حنیف نقوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے۔ اظہار کے سانچوں پر قابو پانے میں صدیاں لگی ہیں۔ اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں۔ زبان کا سفر حقیقت سے مجاز تک کا نہایت بامعنی سفر ہے۔ مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں۔ مفروضے سے معروضے کی منزل مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے۔ فکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں ردوقبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جذبے، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے۔ زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے۔ ایک دن میں زبان بنتی ہے نہ قواعد۔ نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں پیچیدگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ زبان نامیاتی حقیقت ہے۔ اسی لیے نئے نئے سیاق میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر لفظ معنوی امکانات میں ایک سے زائد سیاق رکھتا ہے۔ ہر لفظ اپنے ساتھ مختلف تصورات لے کر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی سادہ اور مجرد، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ہر لفظ اپنی تخلیق کے بعد جب کچھ زمانی عرصہ گزار لیتا ہے تو اس کے معنوی حدود متعین ہو جاتے ہیں اور اس کی سند لغت فراہم کر دیتا ہے۔ اردو نے اپنا ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر

کرتے ہیں۔

اردو میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو پکی روشنائی عطا کر کے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔کونسل نے متنوع موضوعات پر کافی کتابیں شائع کی ہیں۔ پروفیسر حنیف نقوی کی یہ کتاب 'تحقیق وتعارف' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔نقوی صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ان کا شمار اردو کے صف اول کے محققین میں ہوتا ہے۔ان کی اس کتاب میں تحقیق کے نادر حوالے موجود ہیں۔لہٰذا یہ کتاب تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے ساتھ عام قارئین کے لیے بھی دلچسپ ثابت ہوگی ۔امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

(ڈائرکٹر)

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	مقدمہ	۷
۲	بیاضِ آبرو	۹
۳	سوداؔ کا سالِ وفات	۳۷
۴	میرؔ کا دیوانِ چہارم	۴۳
۵	مثنویِ ہدایت در تعریف بنارس	۶۱
۶	منظوماتِ آگاہؔ کے نثری دیباچے	۷۵
۷	فسانۂ عجائب کا حقِ اشاعت	۹۳
۸	شبستانِ سرور کا ماخذ	۱۰۳
۹	غالبؔ اور عیوبِ قوافی	۱۱۵
۱۰	مرزا دبیرؔ۔ شعرائے اردو کے تذکروں میں	۱۲۱
۱۱	منشی انوار حسین تسلیمؔ	۱۴۵
۱۲	محاکمۂ تسلیمؔ بہ مقدمۂ دبیرؔ و انیسؔ	۱۵۵

۱۳	منشی عبدالعزیز اعجازؔ	۱۶۷
۱۴	مکاتیبِ حالی	۱۷۵
۱۵	منشی بنواری لال شعلہؔ	۱۹۱
۱۶	اودھ اخبار کی ادبی قدر و قیمت	۲۱۳
۱۷	مولانا محمد علی جوہرؔ کے خاندان کا رام پور سے تعلق	۲۳۹
۱۸	اقبالؔ سے منسوب ایک غزل	۲۴۷
۱۹	اقبالؔ کے ایک فارسی قطعے کی تضمین	۲۵۹
۲۰	کچھ کالڑا صاحب کے بارے میں	۲۷۳
۲۱	پروفیسر مختار الدین احمد	۲۸۳

مقدمہ

پیشِ نظر مجموعہ چھوٹے بڑے بیس مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں قدیم ترین مضمون 'منظوماتِ باقر آگاہ کے نثری دیباچے' ہے جو ۱۹۶۸ء میں 'علی گڑھ تاریخِ ادب اردو' کی دوسری جلد کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس واقعے پر دس سال گزر جانے کے بعد جب اس دفتر کے گاؤخورد ہو جانے کا یقین ہو گیا تو اسے ماہ نامہ 'نیا دور'، لکھنؤ میں اشاعت کے لیے بھیج دیا گیا اور یہ اس جریدے کے جنوری ۱۹۷۹ء کے شمارے میں شائع ہو گیا۔ 'پروفیسر مختار الدین احمد' اس سلسلے کا آخری مضمون ہے جو مرحوم کی وفات (۳۰ر جون ۲۰۱۰ء) کے چند دنوں بعد لکھا گیا اور ہفت روزہ 'ہماری زبان'، نئی دہلی کے ۱۵ر تا ۲۱ر ستمبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس طرح ان دونوں مضامین کے درمیان کم و بیش بیالیس سال کا وقفہ حائل ہے۔ اتنے طویل عرصے میں کسی بھی مصنف یا مضمون نگار کے اندازِ فکر و نظر اور معیارِ نوشت و خواند میں نمایاں فرق کا وقوع ناگزیر ہے۔ یہ فرق ان مضامین کے رنگ و آہنگ میں بھی یقیناً محسوس کیا جائے گا۔ علاوہ بریں اس مجموعے میں چند ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو کسی خاص مقصد یا وقتی محرک کے تحت لکھے گئے تھے۔ دائرۂ گفتگو کی حد بندی کے باعث ان میں بھی تشنگی کا احساس ہونا لابدی ہے۔ اس کے باوجود امید یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی یہ تحریریں اپنے قارئین کو مایوس

نہیں کریں گی۔ راقم کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس کے معروضات صرف پیش پا افتادہ معلومات کا مجموعہ نہ ہوں، ان میں کسی نہ کسی حد تک پڑھنے والوں کی ضیافت علمی کا سامان بھی موجود ہو۔

کسی بھی تحریر کو پرکشش اور بااثر بنانے میں معانی ومطالب کی دلچسپی اور بصیرت آفروزی کے پہلو بہ پہلو موزوں ترین الفاظ کا انتخاب اور مناسب ترین پیرایۂ بیان کا استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مرحلۂ دشوار عام حالات میں بہ یک جست طے کر لینا غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل مصنفین کے علاوہ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے ہر مصنف کی یہ کوشش ہونا چاہیے کہ وہ اپنی تحریروں کے نقشِ اوّل کی تکمیل کے بعد موقع بہ موقع ان کی بازخوانی کے وقت تازہ ترین معلومات کی روشنی میں ضروری حذف واضافہ کے ساتھ ساتھ ان کی نوک پلک کی درستی پر بھی بہ طورِ خاص نگاہ رکھے۔ چنانچہ یہ مضامین بھی مکمل نظر ثانی کے بعد اس مجموعے میں شامل کیے گئے ہیں۔ اصلاح وترمیم کے اس عمل کا دائرہ اگرچہ کیفیت اور کمیّت دونوں ہی کے اعتبار سے بہت محدود رہا ہے تاہم اپنی بساط کے مطابق اربابِ معنی کی نکتہ چینی کے سدِّ باب اور اصحابِ صورت کی حرف گیری سے تحفّظ کا پورا اہتمام کر لیا گیا ہے۔ اس سب کے باوجود ''گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں'' کی صداقت اپنی جگہ قائم ہے، اس لیے قارئین سے التماس ہے کہ وہ بلا تکلف راقم کو اس کی کوتاہیوں سے آگاہ فرمائیں تاکہ اگر ممکن ہو تو آئندہ ان کا ازالہ کیا جا سکے۔

حنیف نقوی

بنارس

۲۵/دسمبر ۲۰۱۱ء

بیاضِ آبرو

راقم السطور کے ذاتی ذخیرۂ نوادر میں ایک قدیم بیاض محفوظ ہے، جو بہ حالت موجودہ ۱۹×۱۲ سینٹی میٹر سائز کے اٹھانوے اوراق پر مشتمل ہے۔ نظر بہ ظاہر اس کے شروع کے ایک دو ورق ضائع ہو چکے ہیں۔ بیاض کی عام حالت بھی اچھی نہیں۔ کرم خوردگی اور بوسیدگی کے زیر اثر بیشتر اوراق اپنی عمر پوری کر چکے ہیں۔ بیاض میں کسی جگہ ایسی کوئی تحریر موجود نہیں جس کی بنیاد پر اس کی ترتیب و تحریر کا صحیح زمانہ متعین کیا جا سکے۔ تاہم کئی ایسی داخلی اور خارجی شہادتیں موجود ہیں، جن کی مدد سے اس کی قدامت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ ورق نمبر ۱۳الف پر آبرو کی ایک غزل ''ریختہ ابرو ساہب حنک'' کے زیر عنوان نقل ہوئی ہے۔ ''ساہب'' دراصل ''صاحب'' اور ''حنک'' اصلاً ''جُنگ'' ہے۔ ''جُنگ'' اصطلاحاً اس ''بیاضِ بزرگ'' کو کہتے ہیں، جس میں ہر قسم کے اشعار درج ہوں۔ اس اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیاض کے اصل مرتب شاہ مبارک آبرو ہیں جو ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ (۲۰ دسمبر ۱۷۳۳ء) کو اپنا سفرِ زندگی تمام کر چکے تھے۔ چونکہ علمی ضابطۂ اخلاق کے تحت بیاض نگار کا اپنے قلم سے خود کو ''صاحبِ جُنگ'' لکھنا بعید از قیاس ہے، اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ آبرو کی اصل بیاض نہیں، اس کی نقل ہے۔ اس قیاس کو اس بات سے بھی

تقویت ملتی ہے کہ اس میں بہ کثرت اشعار ناموزوں ہیں اور ان ناموزوں اشعار کی نسبت براہِ راست آبؔرو کی طرف نہیں کی جاسکتی۔ خود آبرو کی محولۂ بالا غزل کے ایک شعر میں قافیے اور اس سے پہلے لفظ میں تقدیم وتاخیر اصل متن سے انحراف میں دست غیر کے دخل پر دلالت کرتی ہے۔ اسے اتفاق یا سہوِ قلم قرار دے کر نظر انداز کیا جاسکتا تھا، لیکن یہی غزل غالباً غلطی سے چھٹے ورق پر دوبارہ نقل ہوگئی ہے اور یہ نقص وہاں بھی موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ غلطی کی یہ تکرار خود شاعر کی لغزشِ قلم کا نتیجہ نہیں ہوسکتی۔

یہ بیاض اردو، فارسی اور ہندی کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔ اردو کے جن شاعروں کا کلام شاملِ انتخاب ہے، ان میں آبؔرو اور ناجؔی کے بعد کی نسل سے تعلق رکھنے والے تنہا شاعر مرزا مظہر جانِ جاناں (متوفّی ۱۰ر محرم ۱۱۹۵ھ مطابق ۶ر جنوری ۱۷۸۱ء) ہیں اور ان کی بھی جو غزل نقل کی گئی ہے وہ بالیقین ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) سے قبل لکھی جا چکی تھی۔ بیاض کی قدامت کا یہ دوسرا ثبوت ہے۔

بیاض میں بعد میں بھی چند اضافے کیے گئے ہیں، جن کا خط اور روشنائی بیاض کے اصل خط اور روشنائی سے مختلف ہے۔ ان اضافوں میں سوؔدا کا کچھ اردو کلام اور شاہ جلال الدین خرؔد کے فارسی اشعار شامل ہیں۔ ورق ۲۶ب اور ۲۷الف پر ''قصیدۂ رفیع السوؔدا خسرو و درویش'' کے زیرِ عنوان چھبیس اشعار کا ایک قطعہ جو کلیات کے عام نسخوں میں ''درسوالِ بادشاہ و جوابِ درویشِ گوشہ نشینِ بے پروا کہ ترکِ دنیا کردہ بود'' کے عنوان سے شامل ہے، نقل کیا گیا ہے۔ ورق ۲۷الف پر اس قطعے کے معاً بعد یہ اندراج ملتا ہے:

''تمام شد قصیدۂ خسرو درویش من تصنیف مرزا رفیع السودا بدستخط شیخ حسین علی ولد شیخ حسن علی ابن شیخ مسند علی، ساکن قصبہ مارہرہ مکان قاضی محلّہ بوقت قاضی غلام معین الدین صاحب برائے خاطر عزیز میر برکت علی تحریر یافت/ مکان کابر محلّہ ارقام یافت/ بمکتب میانجیو عزت علی صاحب دام برکاتہٗ/ سنہ ۱۲۱۹ فصلی شہر ذی الحجہ بتاریخ سیزدہم روز دوشنبہ وقت فجر کہ آفتاب بہ ترقی آمدہ بود۔''

ورق ۳۳ ب کی ایک تحریر سے اس بیاض کی ملکیت سے متعلق مندرجہ بالا اندراج کی توثیق ہوتی ہے۔ اس تحریر کا خط سابق الذکر تحریر سے بالکل مختلف ہے اور یہ بہ صورتِ ذیل تین سطروں میں منقسم ہے:

مالکِ ایں کتاب شعر و کبت غزل رباعے
سید برکت علی ولد سید مدد علی ساکن قصبہ مارہرہ ایم
ہر کہ دعوے کند باطل گردد

ورق ۴۹ الف پر شاہ جلال الدین خرد کے دیوان سے ایک فارسی غزل نقل کرنے کے بعد آخر میں تاریخِ تحریر اس طرح درج ہے:

''تمام شد غزل دیوان خرد بتاریخ بیست چہارم شہر
رمضان المبارک سنہ ۱۲۲۷ھ تحریر یافت بروز پنجشنبہ
بوقت یک پہر روز برآمدہ۔''

یہ بہ ظاہر سید برکت علی کے قلم کی تحریر ہے۔

سودا اور خرد کے اشعار سے متعلق منقولۂ بالا اندراجات جن میں اول الذکر تقویمِ عیسوی کے مطابق ۳۰ر دسمبر ۱۸۱۱ء کی اور ثانی الذکر یکم اکتوبر ۱۸۱۲ء کی تحریر ہے، اس بیاض کے اس سے قدیم تر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ پہلی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت شیخ حسین علی نے سودا کا قطعہ اس بیاض میں نقل کیا تھا، یہ میر برکت علی ساکنِ مارہرہ کی ملکیت میں تھی۔ دوسری تحریر سے اس اطلاع کی توثیق کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید برکت علی سید مدد علی کے فرزند تھے۔ سید برکت علی موصوف کا اصل وطن قصبہ سہسوان ضلع بدایوں تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی میر نیاز علی کے فرزند میر خلیل احمد عاقل سہسوانی (متوفّٰی ۲۳ر اگست ۱۹۲۶ء) میرے خسرِ محترم سید محمد طاہر نقوی کے، جن کی وساطت سے یہ بیاض مجھ تک پہنچی ہے، حقیقی نانا تھے۔ میر برکت علی کے سنینِ ولادت و وفات نامعلوم ہیں، لیکن ان کے چھوٹے بھائی میر نیاز علی نے خاصی طویل عمر پاکر بروزِ جمعہ ۲۷ر رجب ۱۲۹۰ھ مطابق ۲۰ر ستمبر ۱۸۷۳ء کو وفات پائی۔ تاریخِ اودھ کی ممتاز شخصیت

مقرب الدولہ، منتظم الملک میر محمد حسین خان بہادر شمشیر جنگ (متوفّٰی یکم مئی ۱۸۸۷ء) میر برکت علی کے حقیقی ماموں زاد بھائی اور ہم زلف تھے۔[۱]

بیاض از اول تا آخر نہایت پختہ شکست آمیز نستعلیق خط میں لکھی ہوئی ہے۔ بعض تحریروں کی روش سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناقل واضح اور صاف لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اس کی عجلت پسندی اسے اس کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ کم سواد اور موزونیِ طبع سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی غیر محتاط اور حد درجہ غلط نویس بھی ہے۔ الفاظ کی کمی وبیشی اور تقدیم وتاخیر کی اسے مطلق پروا نہیں ہوتی۔ کسی لفظ کو غلط پڑھ کر غلط لکھ لینے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ ک اور گ، یائے معروف اور یائے مجہول اور نقطوں کے ذریعے اپنی شناخت کرانے والے حروف میں فرق نہ کرنا یا شوشوں اور دائروں کی صحت کا لحاظ نہ رکھنا، کاتبوں کا عام وتیرہ رہا ہے۔ لیکن اس بیاض کا ناقل حروف کی مابہ الامتیاز علامتوں کو مسخ کرنے میں متعارف حدود میں سے کسی حد کا پابند نہیں۔ اس کی تحریر میں جو نقائص بہت نمایاں ہیں اور اشعار کی صحیح قرأت میں دشواری پیدا کرتے ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ کاف بیانیہ (کہ) کو اکثر اگلے لفظ کے حرفِ اول سے ملا دیتا ہے۔ مثلاً: کجیسے (کہ جیسے) ککو یا (کہ کو یا)، کدکہنی (کہ دکھنی)، کبتہا (کہ بیٹھا)، کمسافر (کہ مسافر)

۲۔ اس معمول کے برخلاف کبھی کبھی ''کہ'' کی بجائے ''کے'' لکھتا ہے مثلاً: اعجاز حسن دیکھکے مجہ ناتواں اوپر (دیکھ کہ مجھ ناتواں)، سچ کہ کے بے سبب یہ (سچ کہہ کہ بے سبب یہ)، بس کے خوفِ رقیباں ہے (بس کہ خوفِ رقیباں ہے)

۳۔ ہائے ہوّز اور حائے حطی، ث، س اور ص اور دوسرے ہم صوت حروف میں امتیاز نہیں کرتا۔ ''ساہب'' کی مثال ابتدائی سطور میں گزر چکی ہے، کچھ اور مثالیں درجِ ذیل ہیں:

طرہ، ترہ (طرح)، صورہ (سورہ)، ہسار (حصار)، سباحت (صباحت)، سفائی (صفائی)، خلاسی (خلاصی)، موسلی (مصلّی)، عسا (عصا)، صالم (سالم)،

صہرا(صحرا)، صحرہ(شہرہ)، وہشت(وحشت)، صحبا(صہبا)، واستے(واسطے)، مثت(مست)،مسل(مثل)،ضرف(ظرف)،عزر(عذر)،تہمل(تامل)

۴۔ بعض اوقات دو یا تین لفظوں کو اس طرح ملا کر لکھتا ہے کہ اصل الفاظ کی طرف انتقالِ ذہن کے تمام امکانات مفقود ہو جاتے ہیں۔مثلاً:

رختریکا(رخ ترے کا)، آہونمیں(آہ ہوں میں)، تمارکیشو(تمھارے گیسو)، قرآنوکتاب(قرآن وکتاب)، بنائہی(بنائی ہے)، لکہتہا(لکھے تھا)، کاتیہی(کاٹی ہے)، کیوندری(کیوں ڈرے)، بیدل(یہ دل)، متکہو(مت کہو)، متمل(مت مل)، جونبرق(جوں برق)

۵۔ لفظ کو پورا لکھنے کی بجائے اس کا آخری حرف اور کبھی کبھی آخر کے دو حرف غائب کر دیتا ہے۔مثلاً:

برم سجی(بر میں سجی)، زچپتری(رخ پہ ترے)، ہم پکرتے ہیں(ہم پہ کرتے ہیں)، سرم ہوگئی(سرمہ ہوگئے)، ویران میں(ویرانے میں)، کیونک جاؤں(کیونکے جاؤں)، جہاں مو(جہاں موں)، رکون رنج(روکو نہ رنج)، تصویر لیک پہارے(تصویر لے کے پھاڑے)، کہنچکا(کھینچے گا)، جولاوے نام ترے کو(جولاوے نامے تیرے کو)، کدیکہے(کے دیکھے)، پردیس نکل کر(پردے سے نکل کر)، لال زار(لالہ زار)، کیا(کویا)

۶۔ جب چاہتا ہے لفظوں کو خلافِ قاعدہ توڑ کر لکھتا ہے۔مثلاً:

دیکہ تا(دیکھتا)، سے تی(سیتی)، جست جو(جستجو)، برداس تہی(برداشت ہے)، پونچہ نے(پونچھنے)، چہبے لا(چھبیلا)، رنگے لا(رنگیلا)، تجہ جار حسن(تجّارِ حسن)، ولے کن(ولیکن)

۷۔ ایک لفظ کے آخری اور اس سے اگلے لفظ کے ابتدائی حرف کے اشتراک کی صورت میں صرف ایک حرف پر اکتفا کر کرتا ہے۔مثلاً:

غمیں(غم میں)، رنجیدہوں(رنجیدہ ہوں)، سیہوں(سیہ ہوں)، سیاہی(سیاہ

ہے)، پیادہو(پیادہ ہو)، تہی (تب بھی)

۸۔ طویل الصّوت کسرۂ اضافت کو بالعموم 'ئے' سے بدل دیتا ہے۔مثلاً:

خداوندے زمیں (خداوندِ زمیں)، خاکسارے پاے ہرسگ (خاکسارِ پاے ہرسگ)، دلبرے عیار (دلبرِ عیّار)، قمارے عشق (قمارِعشق)، رنکے ملاحیت (رنگِ ملاحیت)، لیلے زمستان (لیلِ زمستاں)، نکہے التفات (نگہِ التفات)

بیاض کا تقریباً نصف حصّہ ہندی اور فارسی کے منتخبات پر مشتمل ہے۔اس میں بھی فارسی کا حصہ برائے نام ہے۔ ہندی شعرا کا تمام تر کلام ان کے ناموں کے حوالے کے بغیر نقل کیا گیا ہے۔صرف ایک جگہ کبیرؔ کا اور ایک جگہ مظہرؔ کا نام بہ طور عنوان لکھا ہوا ملتا ہے۔ چند دوہوں میں تلسیؔ اور کبیرؔ کے نام آ گئے ہیں، جن کی بنیاد پر ان کی ملکیت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ فارسی کے کلام میں امیر خسروؔ اور اشرفؔ (شاگردِ ولیؔ) کی تین تین غزلیں ہیں، صادقؔ (مجہول الاحوال) کی ایک نعتیہ غزل اور احمدؔ جام، شاہ جلال الدین خردؔ، اسیرؔ اور نظامؔ (مجہول الاحوال) کی ایک ایک غزل، حافظؔ شیرازی کی ایک غزل کی تضمین اور مختلف نامعلوم الاسم شعرا کی چند رباعیاں اور متفرق اشعار شامل ہیں۔خردؔ کی غزل جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، بعد کا اضافہ ہے۔اردو کے جن شاعروں کا کلام شاملِ انتخاب کیا گیا ہے، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔	ولیؔ دکنی	۱۹غزلیں	(۱۴۶ اشعار)
۲۔	مدنؔ	۳۱غزلیں	(۲۰۱ اشعار)
۳۔	اشرفؔ	۶غزلیں	(۶۴ اشعار)
۴۔	عمرؔ	۸غزلیں	(۴۴ اشعار)
۵۔	آبروؔ	۴غزلیں	(۳۳ اشعار)
۶۔	مسکینؔ	۳غزلیں	(۲۱ اشعار)
۷۔	نقشبندیؔ	۳غزلیں	(۱۹ اشعار)
۸۔	مرہونؔ	۲غزلیں	(۱۲ اشعار)

۹۔	ناجیؔ	ایک غزل	۷ شعر
۱۰۔	احمدیؔ	ایک غزل	۷ شعر
۱۱۔	مفتوںؔ	ایک غزل	۷ شعر
۱۲۔	ممنونؔ	ایک غزل	۵ شعر
۱۳۔	درویشؔ	ایک غزل	۵ شعر
۱۴۔	قطبیؔ	ایک غزل	۵ شعر
۱۵۔	عاشقؔ	ایک غزل	۵ شعر
۱۶۔	عبدلؔ	ایک غزل	۵ شعر
۱۷۔	رضیؔ	ایک غزل	۵ شعر
۱۸۔	مظہرؔ	ایک غزل	۵ شعر
۱۹۔	مختلف نامعلوم الاسم شعرا:	۳۳ متفرق اشعار، ایک مخمس (۵ بند)	

سوداؔ کے کلام میں جو بعد کا اضافہ ہونے کی بنا پر ہمارے دائرۂ گفتگو میں نہیں آتا، بادشاہ و درویش والے متذکّرہ قطعے کے علاوہ مثنوی در ہجوِ حکیم غوث کے کچھ اشعار بھی شامل ہیں۔ کلیاتِ سوداؔ نسخۂ جانسن کے مطابق یہ مثنوی ۱۷۶ ابیات پر مشتمل ہے۔ ناقل نے ان میں سے صرف ابتدائی سولہ شعر نقل کیے ہیں۔

مندرجہ بالا فہرست میں شامل شاعروں میں ولیؔ، آبروؔ، ناجیؔ اور مظہرؔ کے علاوہ تقریباً سبھی گم نام اور غیر معروف ہیں۔ شعرائے اردو کے تذکروں میں ان میں سے صرف احمدیؔ، اشرفؔ، رضیؔ، عاشقؔ اور عمرؔ کے نام ملتے ہیں۔ احمدیؔ کا ذکر صرف میرؔ نے کیا ہے۔ انھوں نے احمدیؔ گجراتی کا عنوان قائم کر کے ان کی ایک غزل کے پانچ شعر نقل کیے ہیں، جن میں مقطع شامل نہیں۔[۲] مرتبِ تذکرہ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ شاعرِ مذکور کا تخلص دراصل احمدؔ تھا۔ چنانچہ 'نکات الشعرا' کے اس اندراج سے اختلاف کرتے ہوئے حاشیے میں تحریر فرماتے ہیں:

''میرؔ اور شفیقؔ نے احمدیؔ لکھا ہے، لیکن قائمؔ، شوقؔ اور حسنؔ

نے ''احمؔ گجراتی'' لکھا ہے۔ احمؔ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کاتب نے اضافت کے بجائے 'ی' لکھ دی ہے۔''[۳]

اس بیاض میں احمدیؔ کی غزل ''ریختۂ احمد'' کے زیرِ عنوان نقل کی گئی ہے، لیکن مقطعے میں تخلص احمدیؔ نظم ہوا ہے۔ اگر اول الذکر اندراج کو کاتب کی غلطی نہ قرار دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ احمؔ گجراتی اور احمدیؔ گجراتی اصلاً دو مختلف شاعر نہیں۔ ایک شاعر کے اس طرح دو تخلص کرنے کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ 'نکات الشعرا' کے نسخۂ پیرس میں اور تذکرۂ شورش، میں بھی جس کے مآخذ میں 'نکات الشعرا' شامل ہے، شاعرِ مذکور کا تخلص احمؔ ہی لکھا ہوا ملتا ہے۔[۴] اس سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ احمؔ اور احمدیؔ درحقیقت ایک ہی تخلص کی دو صورتیں ہیں۔[۵]

اشرفؔ کا پورا نام محمد اشرف اور وطن گجرات تھا۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نسبی اور وطنی نسبتوں کے ساتھ ان کا مکمل نام سید محمد اشرف احمد آبادی لکھتے ہیں۔ اشرفؔ ولیؔ کے شاگرد تھے۔ اب تک ان کے دیوان کے تین نسخے دستیاب ہو چکے ہیں، جو پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم کے ذاتی کتب خانے، بھولا ناتھ لائبریری احمد آباد اور انجمن ترقیِ اردو (؟) کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ ہیں۔[۶]

رضیؔ کا نام ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے 'ولی گجراتی' میں حافظ رضی الدین اور 'سخنورانِ گجرات' میں محمد رضی لکھا ہے۔[۷] 'گلشنِ گفتار' کی رو سے دوسری روایت قابلِ ترجیح ہے۔ ہاشم علی (مرثیہ گو) کی ایک تحریر رضیؔ کے حافظِ قرآن ہونے کی تائید کرتی ہے۔[۸] وہ احمد آباد کا متوطن اور ولیؔ کا شاگرد تھا۔ اس کا کلام انتہائی کم یاب ہے۔ سید محی الدین قادری زورؔ نے اس کے نو مرثیوں کی نشاں دہی کی ہے۔ جو کل ۱۸۷ اشعار پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے 'گلشنِ گفتار'، 'حدیقۂ احمدی' اور ایک قدیم بیاض کے حوالے سے چار غزلیں نقل کی ہیں، جن کے اشعار کی مجموعی تعداد بائیس ہوتی ہے۔

عاشقؔ تخلص کے متعدد شاعر گزرے ہیں، لیکن اس بیاض میں فردیات کے تحت ایک ایسا شعر منقول ہے جسے افضل بیگ قاقشال نے میر یحییٰ مخاطب بہ عاشق علی خاں ایماؔ

سے منسوب کیا ہے۔۹ میر فتح علی گردیزی، علی ابراہیم خلیلؔ اور مردان علی خاں مبتلاؔ کے مطابق ان میر یحییٰ کا تخلص عاشقؔ تھا۔۱۰ ممکن ہے کہ وہ فارسی میں ایماؔ اور اردو میں عاشقؔ تخلص کرتے ہوں۔ قاقشال نے یہی شعر ایماؔ سے پہلے شاہ فضل اللہ نقشبندی متخلص بہ فضلیؔ کے کلام میں بھی نقل کیا ہے۔۱۱ ان دونوں انتسابات میں سے اگر اول الذکر انتساب درست ہے تو بر بنائے قیاس اس بیاض میں عاشقؔ کے نام سے منقول غزل انھی میر یحییٰ مخاطب بہ عاشق علی خاں کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے۔

عمرؔ کا اصلی نام معتبر خاں تھا۔ گردیزی کے مطابق وہ ولیؔ کے دامنِ فیض کے تربیت یافتہ اور منصب دارانِ ''سرکارِ والا'' میں سے تھے۔۱۲ علی ابراہیم بھی انھیں منصب دارانِ دکن وشاگردانِ ولیؔ میں شمار کرتے ہیں۔۱۳ مولوی عبدالجبار خاں کا بیان ہے کہ عمرؔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے اور عالم گیری منصب داروں میں تھے۔ انھوں نے ۱۱۸۷ھ (۷۴-۱۷۷۳ء) میں وفات پائی۔۱۴

مدنؔ کا نام ایک شاملِ انتخاب غزل کے مطابق مدار بخش تھا۔ ان کے ذکر سے شعرائے اردو کے تمام تذکرے خالی ہیں۔ بعض غزلوں کے مقطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ولیؔ سے فیضِ تلمذ حاصل تھا۔ یہ مقطعے درج ذیل ہیں:

مدنؔ تو ذریعہ ساں ہو کر پکڑ دامن ولیؔ شہ کا کہ دکھنی شعر میں وہ آفتاب عالی جناب ہے گا

مدنؔ ہے گرچہ جاری نہر مجھ پاس ولے سرچشمہ رکھتا ہوں ولیؔ کا

فضل حافظ ولیؔ کے سیتی یارو! مدنؔ کا شعر اب اتمام ہے گا

آخری شعر سے ولیؔ کے بارے میں ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ وہ حافظِ قرآن بھی تھے۔ غالباً اسی رعایت سے مدنؔ نے ایک مقطعے میں ان کا ذکر ان کے تخلص کی بجائے حافظ کہہ کر کیا ہے:

ایسا شیریں شعر دوجا وہ بولے مدنؔ جس کو ملے حافظ سا استاد

اسی غزل کے آخری شعر میں ولیؔ کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے:

ہوا درجا ولایت کا سجن کوں ولی کیوں کر نہ ہو ولیوں کی اولاد

مدنؔ اپنے زمانے کے مشہور صوفی بزرگ میر فخر الدین اورنگ آبادی کے سلسلۂ ارادت سے وابستہ تھے۔ان کا ذکر انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے:

جس کے دیکھے سے ہوے ضلالت ہو برطرف　　اس فخرِ دیں کو دین کا میں راہبر کہوں
کیوں افتخار دین کا حاصل نہ ہو مدنؔ　　رکھتے ہیں من میں رات دن اس فخرِ دیں کو ہم

افضل بیگ قاقشال کے مطابق میر فخر الدین اورنگ آباد میں بارہ پُلے کے دروازے کے پاس رہتے تھے۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور فخرؔ دیں تخلص کرتے تھے۔۱۵

نقشبندی کے بارے میں بھی کسی تذکرے سے کچھ نہیں معلوم ہوتا۔اشرفؔ نے اپنی دو غزلوں کے مقطعوں میں ان کا ذکر احترام وعقیدت کے ساتھ کیا ہے۔اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی مدنؔ اور اشرفؔ وغیرہ کے ہم عصر اور کوئی صوفی بزرگ تھے۔اس زمانے میں شاہ فضل اللہ نقشبندی نام کے ایک صوفی شاعر گزرے ہیں، لیکن وہ فضلیؔ تخلص کرتے تھے۔تمام تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر اسی تخلص سے کیا ہے، اس لیے بیاض میں شامل کلام کو ان کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔اشرفؔ نے نقشبندی کا ذکر اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے:

اشرفؔ بہ جنابِ نقشبندی　　باشم بہ ادب، نبود دستم

جب سنے تو شعر اشرفؔ نقشبندی (کے) کہے
فضل اس پر دم بہ دم از حیدرِ کرار ہے

مسکینؔ، مرہونؔ اور مفتوںؔ نے اشرفؔ، عمرؔ اور مدنؔ کے ساتھ ہم طرح غزلیں کہی ہیں۔ایک جگہ ان تمام شاعروں کی ایک ہی زمین میں کہی ہوئی غزلیں یکے بعد دیگرے نقل کی گئی ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بہ طورِ خاص کسی مشاعرے کے لیے کہی گئی تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اشرفؔ، عمرؔ اور مدنؔ کی طرح مسکینؔ، مرہونؔ اور مفتوںؔ بھی ولیؔ کے شاگرد ہوں۔اس سلسلے میں مزید تحقیق وجستجو کی ضرورت ہے۔

عبدلؔ 'ابراہیم نامہ' کا مصنّف تھا، جس کا سالِ تصنیف ۱۰۱۲ھ (۴-۱۶۰۳ء)

ہے۔ممکن ہے کہ بیاض میں منقول غزل اسی کی ہو۔لیکن اس سلسلے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔قطبی کے بارے میں بھی کسی قسم کی قیاس آرائی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ انجمن ترقیِ اردو، پاکستان کی فہرستِ مخطوطات کے مطابق اس تخلص کے ایک شاعر کی دو منظوم تصانیف 'مینانامہ' اور 'چڑیا نامہ' انجمن کے کتب خانے میں موجود ہیں[۱۶]، لیکن ان کا زمانۂ تصنیف معلوم نہیں۔درویش اور ممنون الحق ممنون کے سلسلے میں بھی صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں بہ ظاہر اشرف اور مدن وغیرہ کے ہم عصر تھے۔ان کے کلام کی لسانی خصوصیات بھی ولی اور تلامذۂ ولی کے عہد سے ان کے تعلق کی تائید کرتی ہیں۔

شاملِ بیاض شعرا میں سے ولی کا کلام عام طور پر دستیاب ہے، اس لیے اس کی چنداں اہمیت نہیں۔آبرو اور ناجی کے دیوان بھی شائع ہو چکے ہیں، لیکن ان کی غزلوں میں بعض ایسے اشعار کی موجودگی کی وجہ سے جو مطبوعہ دواوین میں موجود نہیں اور بعض اشعار کے متن میں اختلاف کے سبب ان کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔باقی تمام شاعروں کا کلام جنسِ نایاب کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے ولی کے علاوہ دوسرے تمام شعرا کے منتخبات کا ایک انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جاچکا ہے، املا اور تحریر کے مختلف النوع نقائص کی بنا پر بیاض کے مندرجات کی صحیح قرأت دشوار ہے، اس لیے انتخاب میں بالعموم وہی شعر شامل کیے گئے ہیں جن کا متن نقائص سے پاک ہے یا نقص کی صورت میں قیاسی تصحیح کے قرائن بالکل واضح ہیں۔تاہم متن کی عمومی کیفیت کی وضاحت کے لیے پہلے ولی کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جن کی تصحیح 'کلیاتِ ولی' مرتبہ ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی (تازہ ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۸۲ء) کے حوالے سے کی گئی ہے:

خوش لبانکے تو کیا کروں تعریف — وصلع میں میرزا ہے امرت لال
خوش لباسی کی — وضع میں

ماہِ نو ہے تمہن کو سب کا غرور — اس سبب کم نما ہے امرت لال
کی نمن ہے سب کو عزیز

اوس سوں بیکار تو کدہی نکرے　　جس ستے آشنا ہے امرت لال
بیگانگی کبھو

تجہ سنبل پر پیچ کے خوبے میں کیا سیر　　فوزاں کے نمک سیں صف دریا پہ لکھا ہوں
کی خوبی میں کتک سطر　　موجاں کی نمن صفحۂ

میں عاشق یکرنگ ترے رنگ سیں ہوا ہوں　　تیرے رنگ خوبی گل رعنا پہ لکھا ہوں
مجھ　　سوں دورنگ ہوا توں　　تیری یہ دورنگی

مدنؔ

لعلی ترے لب کی (میں) بدخشاں کو لکھوں گا　　تجھ زلف کی سیاہی (میں) ہندوستاں کو لکھوں گا
سب جگ ہے زلیخا کے نمن عاشق اسی کا　　اس کی میں صفت یوسفِ کنعاں کو لکھوں گا

☆☆☆☆☆

ترا مکھ چاند سوں روشن گویا وہ آفتاب ہے گا　　ترا قد سرو یا دو الفِ قرآن و کتاب ہے گا
ترے مکھ پہ نقاب ایسا جھلکتا ہے پری پیکر　　گویا درمیان پانی کے وہ عکسِ ماہتاب ہے گا
جبیں تیری گویا بجلی ہے یا تختی ہے روپے کی　　نین تیرے چکارے جن ستی آہو خراب ہے گا

☆☆☆☆☆

کیا سرو کیا صنوبر سب نیں کیا نظارا　　جب آ چمن موں نکلا وہ یاسمیں ہمارا
جب سوں شمع رخاں سوں ملتا ہوں اے عزیزاں　　ہرگز نہیں رہا ہے مجھ دل منیں اندھارا
گلشن موں جب تو نکلا مشتاق ہو کے دل سوں　　اے گل ترے دیکھن کو بلبل بہت پکارا

☆☆☆☆☆

ویرانے میں نہ جاوے ہرگز وہ ڈھونڈنے کوں　　جس کوں وہ گنج گھر میں اپنے گڑھا ملے گا
حضرت کے فضل سیتی معلوم یوں ہوتا ہے　　اس مدنؔ کو مراتب آخر بڑا ملے گا

☆☆☆☆☆

گرد ہو بیٹھا ہوں، نکلے ہو سجن اس راہ میں　　کون ہے تا آ چھڑاوے ہاتھ دامن گیر کا
لے کر ابرو کی کماں ہم کو ڈراتے ہو سجن!　　کیوں ڈرے جو کوئی نشانہ ہے تمھارے تیر کا

☆☆☆☆☆

میں جس چمن میں جا کر وہ نونہال دیکھا ہر سروِ گل جبیں کو وھاں پائمال دیکھا
جب آسماں پہ دیکھا سب طرف میں نظر کر خورشید مکھ سجن کا خوش بے زوال دیکھا
جس انجمن کے بھیتر بولا ہے وہ سریجن اس کے لباں سے ظاہر آبِ زلال دیکھا
ہر بار ہو پیادہ پکڑی رکاب مہ نے جب آ خرام کرتا ابرو ہلال دیکھا
اے مدؔن آخر اس کو شادی ملے گی ہر دم
جن راہ عشق کی میں اول (ملال) دیکھا

☆☆☆☆☆

دیکھی ہے جب سے جگ منیں اس منہ جبیں کی چھب روشن ہوئی ہے جب سوں تمامی زمیں کی چھب
دنیا میں نہیں رہا ہے کہیں نامِ دردِ سر ظاہر ہوئی ہے جب سوں رنگِ صندلیں کی چھب
آئینہ دیکھتا ہے ایسا بار بار آج شاید پیاری لگتی ہے اس نازنیں کی چھب

☆☆☆☆☆

صحت ہوئی ہے آہ کے کرنے سوں مرد ماں! مجھ درد پر اگر چہ نہیں ہے کوئی طبیب
فریاد ہر چمن موں کرے ہے گا تب (سوں) جا گل سیتی جب سوں دور پڑا ہے یوں عندلیب
جو کچھ ہوا ہے شامتِ مجھ نفس (سوں) ہوا نہیں تو سوائے کرم نہ کرتا تھا وہ حبیب

☆☆☆☆☆

عاشقاں پر ہے جفا کار صنم یا قسمت ہے رقیباں سے بہت یار صنم یا قسمت
خار در خار ہے تجھ عشق سوں سینہ میرا جب سیں دیکھا رخِ گلزار صنم یا قسمت

☆☆☆☆☆

جب سوں تجھ لب کا میں ہوا محتاج تب سوں شکّر تری کھڑا محتاج
بادشاہا مدؔن کے حال پہ دیکھ تیرے در پر ہے جیوں گدا محتاج

☆☆☆☆☆

ہم جل کے کوہِ طور پہ اب سرمہ ہو گئے　　کاجل نمن ہمن کو لگا جا نین کے بیچ
وہ غلط ہیں کہ کہتے ہیں تعریف مشک کی　　شہرہ پڑا ہے زلف تری کا ختن کے بیچ
ظلمت ہے رات، منزل ہے دور، راہ سخت　　اے ماہتاب مکھ کو دکھا اس رین کے بیچ
دل چاک کر سجن کو اپس میں ملا رکھا　　رہتی ہے جوں قلم میں سیاہی شکن کے بیچ
یوسف کے عشق بیچ زلیخا نمن مرے　　تب جانیے کہ پہنچا محبت کے فن کے بیچ

☆☆☆☆☆

سدا میں غم کو کھینچا کوہ بنیاد　　مگر آخر کو ہوئے گا یہ دل شاد
سدا ہے اس دعا کا ورد ساقی　　شرابِ شوقِ تو در جامِ من باد
پڑی لیلےٰ تری شہرت جہاں میں　　مگر مجنوں ہوے گا سن کے شمشاد

☆☆☆☆☆

ہم سے بیٹھے ہو تم سجن مر مر　　تاب نھیں غم ستی مجھے جُھر جُھر
(مڑ مڑ)
تیغ غفلت تری کی قاتل ہے　　جیوں گا کب تئیں صنم کھر کھر
(کُڑھ کُڑھ)

☆☆☆☆☆

اول کرے ہیں جگ منیں دل باغ باغ عیش　　ہر اہلِ دل کوں دیتا ہے آخر کوں داغ عیش
مدت ہوئی کہ غم کا گزرتا ہے روزگار　　گویا کہ اس زمانے میں نہیں ہے سراغ عیش
عالم موں عاقبت کو کھینچے گا مدنؔ وہ غم　　جس کو ملا ہے جگ میں نہایت فراغ عیش

☆☆☆☆☆

انچھر پرم کا جو پڑھا اس کو سبق سوں کیا غرض　　جن صفحۂ دل پر لکھا تن کو ورق سوں کیا غرض
ساری خلق سوں کیا غرض مشتاق تیرے کو سجن　　مشتاق تیرے کو سجن ساری خلق سوں کیا غرض
تجھ زلف مکھ کے دھیان موں رہتا ہوں ہر شب تار موں　　بیتاب مجھ سے کو مدنؔ صبحِ شفق سوں کیا غرض

☆☆☆☆☆

چاہتے ہیں دو جہان میں تجھ نازنیں کو ہم
تجھ بن لے کیا کریں گے بہشتِ بریں کو ہم

روشن ہوئی ہے تب سوں ہماری یو بزمِ طبع
جب سوں لیا ہے دل کے اندر مہ جبیں کو ہم

خالی ہے باغ تیری لٹک چال بن سجن
پھر دیکھ کیا کریں گے یو سروِ چمیں کو ہم

نہیں کام تخت و تاج سے ہم کوں ترے بنا
لے کر تجھے قبول کریں گے زمیں کو ہم

☆☆☆☆☆

تعریف اس جبیں کی میں مطلع فجر کہوں
اس کے لباں کو لعل کہوں یا گہر کہوں

اس مہ جبیں کے نور کا کہاں لگ بیاں کروں
تارا کہوں، چراغ کہوں یا چندر کہوں

جو حسن تجھ ادا میں (ہے) میزاں وزن کرے
دونوں جہاں سوں اس کو میں صاحب ہنر کہوں

سارے جگت کے سر پہ رہے کیونکہ دردِ سر
رنگِ ملاحیت کو میں صندل اگر کہوں

تجھ چشم کے خمار سیتی اب ہوا ہوں مست
برجا ہے گر میں اپنے تئیں بے خبر کہوں

☆☆☆☆☆

ہزار دیوانہ گشتہ عاقل بہ چشمِ مستِ تواے پری رو
مگر یہ انکھیاں تری سریجن اپس میں رکھتی ہیں طرحِ جادو

کجا بگویم حقیقتِ دل کہ کرد عشقِ تو ناتوا تم
کبھو نہ پوچھی ہمارے دل کی رکھو ہو ساجن یہی تو بدخو

گشند ہر دم زہِ کماں را زنند تیرے ز نوکِ مژگاں
کہیں بھی کرتے ہیں ظلم اتنا جو ہم پہ کرتے ہیں یہ دوابرو

☆☆☆☆☆

کیا ہوئے گر سریجن مجھ پاس آئے جاوے
ہاں دیکھنا صنم کا کس کے تئیں نہ بھاوے

اک آتشِ ہجر سیں جلتا رہوں ہوں نس دن
تواے رقیب مجھ کو اب بول مت سناوے

تیغ ابرواں تری سوں نامرد ٹل گئے ہیں
جز عشق باز کب کوئی اپنا گلا کٹاوے

☆☆☆☆☆

عروسِ صبح جو زلفاں سنوارے
برآویں عاشقاں کارن تمھارے

اگر خواہش نہ تھی مجھ کوں ہجر کی
جو ہونی تھی سو ہوئی اب کون ٹارے

بھیا جو رخ ترے کا مہر روشن
ہوئے ہیں غرقِ دریا سب ستارے

مدن تابش عشق دلدار کے سیں
بھئے ہیں عاشقاں جل بل انگارے

☆☆☆☆☆

اے بادِ سحر موہنِ دلدار کہاں ہے　　منزل گہِ عاشق کشِ عیّار کہاں ہے
مت بادِ خزاں دہر سیں رنجیدہ ہو مدّن　　گلزارِ جہاں میں گلِ بے خار کہاں ہے

☆☆☆☆☆

خماری تجھ نین کی دیکھ کر آج　　دو عالم مست غافل ہو رہا ہے

☆☆☆☆☆

عزیزو! کام مشکل ہو رہا ہے　　مرا دل آج بیدل ہو رہا ہے
اتا تجھ ہجر میں روئی ہیں انکھیاں　　بہت رونے سے تن گِل ہو رہا ہے
نہ پوچھو آج اس دل کو مدّن کے　　سراپا نیم بسمل ہو رہا ہے

☆☆☆☆☆

عزیزو! کام حائل ہو رہا ہے　　دل اس کے غم سے مائل ہو رہا ہے
مرا یہ حال ہے، اے جانِ عاشق!　　طرف میری سیں غافل ہو رہا ہے
مدّن یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے　　کہ سب تن گل گیا، گِل ہو رہا ہے

☆☆☆☆☆

صحرا میں کیونکہ جاؤں دل کے جنگل کے آگے　　بجلی نہ یاد لاؤں شوخِ چنچل کے آگے
نامرد ہیں رقیباں غُرّش مری سوں ڈرتے　　کیوں شیر ہو نہ آؤں روباہِ شل کے آگے
جگ کے مصوّراں نے توڑا ہے موقلم کوں　　تصویر کے پھاڑے تیری شکل کے آگے

ہر موے تن زباں کر بولوں جو شکر ہر دم
ہرگز میں بر نہ آؤں اس کے فضل کے آگیا

اشرفؔ

میں دوستی تری سوں افسانہ ہو رہا ہوں　　از بہرِ سوختن خود پروانہ ہو رہا ہوں
جن نے دیکھا ہے تجھ کو کرتا ہے گریہ دائم　　دیکھے سیں میں جو تیرے باران ہو رہا ہوں

آیا ہے وہ سریجن احوال پوچھنے کو — باقی دمم جو ہے گا قربان ہو رہا ہوں
رو را مپوش از من عاجز فقیر تیرا — میں عاشقی میں تیری شہدان ہو رہا ہوں

☆☆☆☆☆

عید ہے، دلبر کے یاراں جان ایثاری کرو — آپ سے اپنے گلے کوں ذبحِ خوں خواری کرو
بحرِ وحدت سے ہوئے قطرات کثرت کے بہت — قطرہ از دریا ملاؤ، چشمۂ جاری کرو
آپ تو، معشوق، عاشق، عشق تیرا نام ہے — نور اپنے سے عجب تم نوری و ناری کرو

☆☆☆☆☆

صنم آؤ جو ٹک طرفم شتاب آہستہ آہستہ — نظارے میں کٹے عمرم خراب آہستہ آہستہ
نشستہ ہو گلی تیری میں مشتاقم کہ کد آوے — ٹک آؤ طرف میرے پی شراب آہستہ آہستہ
تری رفتار کے اوپر دوانا ہے کھڑا اشرفؔ — کھڑے ہوتے گئی عمرم چو خواب آہستہ آہستہ

☆☆☆☆☆

مرا دل غم سے گھائل ہو رہا ہے — صنم کے رخ پہ مائل ہو رہا ہے
سجن کے ہجر میں بیتاب ہے دل — کہ جاں مجھ تن میں زائل ہو رہا ہے

☆☆☆☆☆

خال و خط تیرا بیاں میں کیا کروں از سر بہ پا — خوب رویانِ جہاں کا مقتبس انوار ہے
وصل تیرا جب ملے مجھ کوں جہاں کے بیچ یار — گلشنِ جنّاتِ تجری تحتہا الانہار ہے
سب جہاں تیری عبارت معنیِ خوبی کا ہے — نور تیرا بیچ عالم مخفی اور اظہار رہے
تجھ محبت میں پھروں دیوانہ و مجنوں ہوا — تجھ گلی بھیتر گدائی جو کروں کیا عار ہے

عمرؔ

سجن تم سے ہمارا کام ہے گا — دوو جگ میں تمھارا نام ہے گا
بھیا ہے داغ لالے کے جگر میں — ترا چہرہ عجب خوش فام ہے گا

☆☆☆☆☆

بدخشاں میں سنی سرخی لباں کی حسد سیں خون روتا لال ہے گا
سنی ہے گی خبر آنے ترے کی آبرو اس بات سے خوش حال ہے گا

☆☆☆☆☆

غریبوں، عاجزوں اور بیکسوں پر لطف کر اے صنم غم کے پھنسوں پر
کسوٹی زر کی ساجن کی جبیں ہے کسو سونا کسوٹی کے کسوں پر

☆☆☆☆☆

زلف کے دام میں میں آپھنسا ہوں بہت بیتاب بلکہ اَدسا ہوں
ہنسو مت مجھ پہ ہرگز اے عزیزو! تمام عالم ہنسا، میں نہیں ہنسا ہوں

☆☆☆☆☆

شیشے میں مے (ہے، مے) میں اثر، میں اثر میں ہوں جل میں کنول، کنول میں بھنور، میں بھنور میں ہوں
رہتا ہے دل ہمیشہ سرا سیمہ عاشقاں دل میں عشق، عشق میں خطر، میں خطر میں ہوں
یہ راہ عاشقی کی بہت پیچ تاب ہے درعشق آبرو عمر، عمر بہ ضرر، میں ضرر میں ہوں

☆☆☆☆☆

گل نے پھاڑا رشک سیتی جان کو دیکھ کر اس لپٹی مسکان کو
خوش گلو تیرے سیں اے نازک بدن داؤد آوے سیکھنے الحان کو
جب سیں مہرِ رخ ترا روشن ہوا ماہ تب سیں مانتا ہے آن کو

آبرو

یار غافل کو مرے درد سوں ہشیار کرو بے خبر جان نہ جا، جا کے خبردار کرو
درد بوجھو دل خونخوارۂ عاشق کے اکے سر چڑھا گل کی طرح طرۂ دستار کرو
قدر کی اگر
آبرو غم کے بھنور بیچ پڑا ہے آکر یک نظر لطف کی لازم ہے، اسے پار کرو ۱۷

☆☆☆☆☆

اسبابِ غم ہوئے (ہیں) سامانِ عیش ہم کوں — خونِ جگر (ہے) صہبا، بخت سیہ گھٹا ہے
ظالم تری نگہ نے ٹکڑے کیا ہے دل کو — خنجر ہے یا کٹاری، شمشیر یا پٹا ہے
خوبصورتی کے اوپر اتنی نہ کر غروری — غافل سنبھل! گرے گا اونچا نپٹ اٹا ہے
ہم راہ میں کھڑے ہیں تم دیکھتے بھی ناہیں — لہاں اپس کے دل میں کافر کفر ٹھٹھا ہے (کذا)
جوں جال میں زلف کی کرتے ہیں بے قراری (کذا) — یوں زلف سوں تمھاری دل آج چھٹپٹا ہے
اے بوالہوس سکار آخر خراب ہوگا (کذا) — کچھ عاشقی نہیں ہے یہ کام اٹپٹا ہے
عاشق کو آبرو ہے گالی و مار کھانا — نامرد وہ کہاوے جو عشق سیں ہٹا ہے ۱۸

مسکینؔ

قدش کیا خوش خرام (و) خوش ادا ہے — کہ سرو آزاد جس اوپر فدا ہے
نہ مے کا ذکر کر مجھ پاس ساقی — کہ مجھ کو چشمِ میگوں کا نشا ہے
ہوا ہوں مست دیوانہ بہ شوقش — مجھے زنجیرپا کرنا بجا ہے

☆☆☆☆☆

ترے مکھ کی جھلک ایسی گویا وہ آفتاب ہے گا — صفائی دیکھ کر اس کی جگر عاشق (کا) آب ہے گا
کہا میں بار ہا اس کوں، مہر سوں دیکھ مجھ اوپر — نہیں آزار کر ہم کو دلم تجھ بن خراب ہے گا
پیالے نین تیرے کا تصور رات دن کر کے — ہوا ہے مست یہ دل، آج پیالا پُر شراب ہے گا

نقشبندیؔ

نازنیں کے عشق کے غلبات میں — مجھ کوں جاں کندن ہے ہر یک رات میں
اے خداوندِ زمین و آسماں — مجھ کوں شرمندہ نہ کر عرصات میں
قیمتش بالا بود از نرخِ شعر — وصف قامت کا ہے جن ابیات میں
نقشبندیؔ از برائے صیدِ تو — جال کر زلفاں کا وہ ہے گھات میں

☆☆☆☆☆

نہیں رہا ہے انکھیوں میں نم میاں — بس کہ ہے مجھ دل میں تیرا غم میاں
نہیں (ہے) جمعیّت ہمارے دل کے بیچ — بس کہ تیری زلف ہے برہم میاں

بہرِ آدابِ سلامت باغ میں ہر شگوفہ ہو رہا ہے خم میاں
زخمِ خنجر، مژہ اور چشم کوں تجھ تبسم بیچ ہے مرہم میاں
با رقیباں لطف و احسان و کرم نقشبندیؔ سیں نہایت کم میاں

☆☆☆☆☆

نیستی چاہے تو ہستی مت کرے فکر از بالا و پستی مت کرے
عاقبت کوں دل ستی ہوئے گا کام ہرگز اے جاں تن پرستی مت کرے
تا حشر اٹھنا نہیں ہے گور سیں بس جہاں میں خوابِ مستی مت کرے
رائگاں مت کھو عمر غفلت (کے بیچ) اس گراں پونجی کو سستی مت کرے
نقشبندیؔ تن کے ویرانے کے تئیں گنج اگر چاہے تو بستی مت کرے

مرہونؔ

ابرو و تیغِ آب دار ایک اس طرف، ایک اس طرف کرنے کو عاشق کے فگار ایک اس طرف، ایک اس طرف
تجھ حسن کے گلشن منے اے سروقد، گل پیرہن انکھیاں دو نرگس پرخمار ایک اس طرف، ایک اس طرف
بشگفت در باغِ حیا از بس نسیمِ حسنِ او رخسار دونوں گل انار ایک اس طرف، ایک اس طرف
زلفیں ہیں یا سنبل کہوں، قلّاب یا زنجیر ہیں صندل کو یا لپٹے ہیں مار ایک اس طرف، ایک اس طرف
مرہونؔ کہو کیوں کر کہے، احوالِ دل دلبر سیتی بیٹھے ہیں دشمن نابکار ایک اس طرف، ایک اس طرف

ناجیؔ

آج باندھا شوخ نے چیرا گلالی الحفیظ عاشقوں کے قتل کوں کیا سج نکالی الحفیظ
آؤنے تیرے سے گل اندر چمن مرجھا گئے دیکھ کر یہ ماجرا، کہتا ہے مالی الحفیظ
کون ہے مجھ خوں کا پیاسا جن کھلائے تجھ کو پان کیا بلا لاوے گی تیرے لب کی لالی الحفیظ
کون میرے درد کی دارو کرے اب آن کر ناگ ہو ڈستی ہے تیری زلف کالی الحفیظ
اب جوانی وقت میں کرتا ہے عالم کو خراب کیا بلا ہوئے گا وقتِ خوردسالی الحفیظ
دیکھ تیرے قد کے تئیں یہ فاختہ بیتاب ہے سرو پر گرتی پھرے ڈالی بہ ڈالی الحفیظ
ایک دل تھا سو بھی لے کر شوخ بے کس کر گیا جز خدا کوئی نہیں ناجیؔ کا والی الحفیظ ۱۹

احمدیؔ

آج نکلا شکار کوں پیارا — ہوا ہمراہ چاند اور تارا
ٹک نہ دیکھا صنم نے میری طرف — جیتا میں عاجزی سے کہہ ہارا
تیر کھینچا سجن نے دیکھ شکار — کر خطا اس کے تئیں، مجھے مارا
دیکھ تل دل ہوا ہے مثلِ سپند — جان جل بل ہوا ہے انگارا
احمدیؔ سے نہ کر غروری سجن — دیکھ حالِ سکندر و دارا

ممنونؔ

سچ کہہ کہ بے سبب یہ پرخاش، جنگ کیا ہے — ملنے سے میرے تجھ کوں کہہ عار، ننگ کیا ہے
مردم کشی کو ظالم ہتھیار ہاتھ مت لے — تیری بھنواں کے آگے تیغِ فرنگ کیا ہے
ڈوبے ہیں جا سمندر موتی ز شرمِ دنداں — تیرے لباں کے آگے لعلوں کا رنگ کیا ہے
مکھ سوں نقاب الٹ کر، زلفوں کو شانہ کر کے — جب تو کمر کو باندھے تب روم، زنگ کیا ہے
اوروں کی اور تینے ہنس کر شتاب دیکھا
ممنونِ حق کے حق میں آخر درنگ کیا ہے

درویشؔ

کیا بپت ہے، نپٹ خرابی ہے — میں مصلّی، صنم شرابی ہے
جو ہوا مست اس شرابی کا — دائم اس کا جگر کبابی ہے
خال مت بوجھو، اس کے ابرو پر — نقطۂ بیتِ انتخابی ہے
پیچشِ حالِ عاشقوں کی دلیل — زلفِ پیتم کی پیچتابی ہے
درد سر کا دیا تجھے درویشؔ — نازنیں غمزۂ گلابی ہے (؟)

قطبیؔ

شوخی سجن (کی) دیکھو ماتا گمان کا ہے — نینا پلک کٹاری یہ کس کو مارتا ہے
(ترکش کمان کا)
پگڑی کے پیچ کھل کے گل بیچ پڑی ہے سیلی — بانکی اداسوں آتا دلبر پٹھان کا ہے

ہر تیر اس نگہ کا لگتا نشانِ دل پر ہاتھوں میں خوش رنگیلا قبضہ کمان کا ہے
اس زلف ناگنی سوں ہرگز نہیں خلاصی ہونٹوں کی لالی دیکھو پیاسا وہ جان کا ہے
قطبی فقیر دائم دیوانہ ہے درس کا تجھ واسطے نکارا خوبی جہان کا ہے

عاشق

سپہ کے فرزند تجھے ہے لازم برس تو بس لکھا پن کو رکھنا (کذا) اگر چہ سندر پری چہ باشد پلک اٹھا کر اسے نہ دیکھنا
تمان کا جہا سائے سجو ہمیں وزرس نفانہ کرنا (کذا) اپن کو سج کر یونہی نکل جیسے جو چلتا ہے فیل مکنا ۲۰

نکلنا کہ جیسے

عبدل

..... کہ دلدارم سدا مجھ پر غصا کرتا شدم آشفتہ میں اس کا، سدا مجھ پر غصا کرتا
.....کہ باطن بیچ عبدل سوخت ہووے..... دلِ خواہش گرفتہ اس کا سدا مجھ پر غصا کرتا ۲۱

رضی

عذابِ روزِ قیامت کی مجھ کو نا پرواہ شہیدِ خنجرِ جانانہ ہوں، کفن کی قسم
رضی (میں) جب سے دیکھا پیچتابِ طرۂ زلف ہزار چاک سوں جوں شانہ ہوں، شکن کی قسم ۲۲

مظہر

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ
مرتا ہوں میر زائی گل دیکھ ہر سحر سورج کے ہاتھ چوری (و) پنکھا صبا کے ہاتھ

(چونری)

کب چھوٹتا ہے پھر کے جو مفلس رکھے گرو اب تو پھنسا ہے آ کے دل اس بے وفا کے ہاتھ
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سوں میتا لگا ہے جب سیتی مجھ بے نوا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک اپس کے تئیں یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ ۲۳

مدن، عمر، مرہون، مسکین، اشرف اور مفتوں کی ہم طرح غزلیں جو غالباً کسی خاص مشاعرے کے لیے کہی گئی تھیں اور اس بیاض کے ورق ۸۳۔الف سے ورق ۸۴الف تک مسلسل نقل ہوئی ہیں، ان سے منتخب دو دو اشعار درجِ ذیل ہیں:

مدنؔ

سورج ہے مکھ ترا از بس جھلک موں ترے مکھ پر چندر ہالا کروں گا
سحر پرداز ہیں انکھیاں سجن کی سجن کے پاس بنگالا کروں گا

عمرؔ

جو کوئی بد نظر دیکھے صنم کو جگر اس کے منے بھالا کروں گا
بزرگی ہے تمھیں حق کی طرف سے تمھارے نام کی مالا کروں گا

مرہونؔ

رومال اپنے کے تئیں انجھواں سرخ سوں شبیہِ گلشنِ لالا کروں گا
ترے جادو نین کا آج شاگرد ملک کانور و بنگالا کروں گا
(کامروپ)

مسکینؔ

صنم کو سب سے میں بالا کروں گا رقیبوں کے جگر بھالا کروں گا
تری لالی لباں کی دیکھ کر میں تصدّق تختۂ لالا کروں گا

اشرفؔ

پیا کے دیکھنے نس دن تپوں ہوں برہ کی آگ تن کالا کروں گا
ستم کی فوج لے آئے رقیباں برہ کی آہ کا بھالا کروں گا

مفتوںؔ

بہ ملکِ دل چڑھا ہے لشکرِ غم مقابل آہ کا بھالا کروں گا
صنم کی زلف کی جادوگری پر تصدّق سحرِ بنگالا کروں گا

حواشی

۱ سید برکت علی اور ان کے خاندان سے متعلق یہ تفصیلات خاندانی یادداشتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل مصادر پر مبنی ہیں:

(الف) مجموعۂ لغاتِ مرادف، مرتبہ سید خلیل احمد عاقلؔ سہسوانی، مطبعِ یوسفی، سہسوان، ۱۹۲۳ء۔

(ب) خزینۃ الانساب، مولفہ سید نظر احمد افسوںؔ سہسوانی، مطبعِ نظامی، بدایوں، ۱۹۵۹ء

۲و۳ نکات الشعرا، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقیِ اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ۹۷

۴ نکات الشعرا، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، ادارۂ تصنیف، ماڈل ٹاؤن، دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ۹۹ وتذکرۂ شورش، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، یو۔پی اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ص ۸۰

۵ زیر بحث شاعر احمدؔ گجراتی بہ ظاہر احمدؔ گجراتی مصنفِ 'یوسف زلیخا' و 'لیلیٰ مجنوں' سے مختلف شاعر معلوم ہوتا ہے۔

۶ بہ حوالہ کلیاتِ ولی، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، یو۔پی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء مقدمۂ مرتب، ص ۷

۷ ولیؔ گجراتی، ادبی پبلشرز بمبئی، ۱۹۷۴ء، ص ۹۲ وسخنورانِ گجرات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۹۰

۸ بہ حوالہ سخنورانِ گجرات، ص ۹۱

۹ تحفۃ الشعرا، مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل، ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد، ۱۹۶۱ء، ص ۱۵۲۔ بیاض میں یہ شعر بہ صورتِ ذیل منقول ہے:

طبیبِ عشق سوں پوچھا زلیخا نے دوا اپنا
کہا تم کو بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم بھرنا

قاقشال نے متن کے معمولی اختلافات کے ساتھ اسے اس طرح نقل کیا ہے:

طبیبِ عشق سیں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا
کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا

۱۰ تذکرۂ ریختہ گویاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقیِ اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۱۱۸، گلزارِ ابراہیم، مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد، دائرۂ ادب، پٹنہ، ۱۹۷۴ء، ص ۳۲۸ و گلشنِ سخن، مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، انجمن ترقیِ اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۷

۱۱ تحفۃ الشعرا، ص ۱۵

۱۲ تذکرۂ ریختہ گویاں، ص ۱۱۶

۱۳ گلزارِ ابراہیم، ص ۳۲۶

۱۴ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن، مطبعِ رحمانی، حیدر آباد، جلدِ دوم، ص ۸۲۴

۱۵ تحفۃ الشعرا، ص ۲۰

۱۶ فہرستِ مخطوطاتِ انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی (اردو) جلدِ اول، مرتبہ افسر صدیقی امروہوی و سید سرفراز علی رضوی، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۴۴۱

۱۷ آبرو کے تینوں شعر اختلافِ متن کی بنا پر اس انتخاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

۱۸ بیاض میں یہ غزل بارہ اشعار پر مشتمل ہے جب کہ دیوانِ آبرو مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن میں صرف آٹھ شعر ملتے ہیں۔ دیوان کا ساتواں شعر بیاض میں موجود نہیں۔ اس طرح بیاض میں زائد اشعار کی تعداد پانچ ہو جاتی ہے۔ اس انتخاب میں شعر نمبر ۱ و شعر نمبر ۷ کو اختلافِ متن کی وجہ سے شامل کیا گیا

ہے۔ باقی پانچوں اشعار دیوان کے مندرجات پر اضافہ ہیں۔

۱۹ دیوانِ ناجیؔ مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق میں بھی یہ غزل سات اشعار پر ہی مشتمل ہے، لیکن بیاض اور دیوان میں صرف تین شعر مشترک ہیں۔ یعنی اول الذکر میں چار ایسے شعر منقول ہیں جو آخر الذکر میں موجود نہیں۔ اس انتخاب میں ان زائد شعروں (نمبر۴ تا ۷) کے علاوہ باقی تین اشعار (شعر نمبر ۱، ۲ و ۳) اس لیے شامل کیے گئے ہیں کہ ان کا متن متداول متن سے نمایاں طور پر مختلف اور قابلِ ترجیح ہے۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی نے اپنے تحقیقی مقالے 'بمبئی میں اردو'، مطبوعہ بمبئی، ۱۹۷۰ء میں ناجیؔ کی اس غزل کے مندرجہ ذیل چار شعر قاضی قاسم مہدی متخلص بہ قاسمؔ سے منسوب کیے ہیں:

کوئی نگہ ظالم کی نے فتنہ سے خالی الحفیظ — کیا بلا ہے آبِ تیغِ پرتگالی الحفیظ
تھا وہ میرے خوں کا پیاسا جن کھلایا تجھ کو پان — کیا بلا لائے گی تیرے لب کی لالی الحفیظ
اس صنم میرے کے سر اوپر نہیں پھینٹا سیہ — آفتاب اوپر گھٹا امڑی ہے کالی الحفیظ
آج کیفی ہے سجن، جانا نہیں مجکو حضور — بے تامل سب کے تئیں دیتا ہے گالی الحفیظ

یہ چاروں شعر 'دیوانِ ناجیؔ' میں موجود ہیں۔ دوسرا شعر دیوان اور بیاض دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن ان اشعار کا متن متداول متن سے خاصا مختلف ہے، اس کے باوجود ان کے ناجیؔ کا کلام ہونے میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ قاسمؔ بعد کے شاعر ہیں۔ وہ تیرھویں صدی ہجری کے ربعِ اول میں بہ قیدِ حیات تھے۔ علاوہ بریں ان کے کلام کا جو انتخاب ڈاکٹر میمونہ دلوی نے پیش کیا ہے (صفحات ۸۱ و ۸۲)، اس میں دوسروں کا کلام بھی شامل ہے۔

۲۰ عاشقؔ کی اس غزل کا متن اس حد تک مسخ ہو گیا ہے کہ کوئی شعر صحیح طور پر نہیں پڑھا جا سکتا۔

۲۱ عبدلؔ کی اس غزل کے پانچوں اشعار کے پہلے مصرعے ناقص الاول ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس بیاض سے یہ شعر نقل کیے گئے ہیں، اس میں یہ حصہ یا

تو کرم خوردہ تھا یا کسی اور وجہ سے پڑھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

۲۲ رضیؔ کی یہ غزل پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ پانچوں شعر 'گلشنِ گفتار' اور 'سخنورانِ گجرات' میں موجود ہیں۔ یہاں صرف دو شعر نقل کیے گئے ہیں جن کا متن قدرے مختلف ہے۔

۲۳ مظہرؔ کی یہ مکمل غزل 'نکات الشعرا' کے نسخۂ پیرس (مکتوبہ ۱۱۷۸ھ مطابق ۱۷۶۵ء) کے علاوہ کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ بالخصوص تیسرا شعر اس نسخے کے علاوہ کہیں اور منقول نہیں۔ اس اعتبار سے یہ بیاض اس شعر کا قدیم ترین ماخذ قرار پاتی ہے۔ قاقشال نے بھی مظہرؔ کی اس غزل میں پانچ شعر نقل کیے ہیں۔ (تحفۃ الشعرا، ص ۱۶۹) لیکن ان کے نقل کردہ اشعار میں دوسرا شعر مظہرؔ کا نہیں، قائمؔ چاند پوری اور میرؔ کی روایت کے مطابق یکرنگؔ کا ہے۔ قائمؔ نے یکرنگؔ کا کلام ان کے دیوان سے انتخاب کیا تھا۔

(ماہ نامہ ''آج کل''، نئی دہلی، شمارہ اپریل ۱۹۸۶ء)

سوداؔ کا سالِ ولادت

مرزا محمد رفیع سوداؔ کب پیدا ہوئے اور انتقال کے وقت ان کی واقعی عمر کیا تھی، یہ مسئلہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ مولانا محمد حسین آزادؔ سے ڈاکٹر خلیق انجم تک متعدّد اہلِ علم نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے لیکن وہ کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ آزادؔ کے نزدیک ان کا سالِ ولادت ۱۱۲۵ھ ہے۔[۱] لیکن اس بیان کے پس پشت کوئی شہادت موجود نہیں۔ شیخ چاند نے ۱۱۰۶ھ کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔[۲] مگر یہ فیصلہ جس دلیل پر قائم ہے وہ اپنی اصل کے اعتبار سے خلافِ واقعہ اور ناقابلِ قبول ہے۔ قاضی عبدالودود کی تحقیق کے مطابق سوداؔ کا سالِ ولادت ۱۱۲۸ھ ہے۔ ان کے اس موقف کی بنیاد یہ ہے کہ 'مجمع الانتخاب' کے مؤلّف شاہ کمال کے بقول میر سوزؔ نے انھیں بتایا تھا کہ سوداؔ ان سے عمر میں ایک سال چھوٹے تھے۔ چوں کہ سوزؔ کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا ہے اور ''ایک یا ایک سے زیادہ'' تذکروں کی رو سے وفات کے وقت ان کی عمر اسی (۸۰) سے متجاوز تھی جسے پچاسی سال مان لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سوزؔ ۱۱۲۷ھ میں اور سوداؔ اس کے ایک سال بعد ۱۱۲۸ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔[۳] قاضی صاحب کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے بجا طور پر یہ بات کہی ہے کہ وفات کے وقت میر سوزؔ کی عمر پچاسی (۸۵) سال کی بجائے

اکیاسی یا بیاسی سال کیوں نہ مانی جائے جو زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس حساب سے مرزا کا سالِ ولادت ۱۱۳۱ھ کے قریب ہوگا۔[۴]

پیش رو مصنّفین و محقّقین کے مختلف بیانات کے تجزیے کے بعد خود ڈاکٹر خلیق انجم نے جو رائے قائم کی ہے، وہ نقش علی کے تذکرے 'باغِ معانی' اور میر حسؔن کے 'تذکرۂ شعرائے اردو' کے اندراجات پر مبنی ہے۔ نقش علی نے سوداؔ سے اپنے ذاتی روابط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس وقت ان کی عمر پچپن سال کو پہنچ چکی ہے۔ چونکہ قاضی عبدالودود کے بقول اس تذکرے میں سوداؔ کا حال ۱۱۷۴ھ کے لگ بھگ لکھا گیا ہے، اس لیے ان کا سالِ ولادت ۱۱۱۸ھ ہونا چاہیے۔ میر حسؔن نے اپنے تذکرے میں ان کا حال ان کے فرخ آباد سے لکھنؤ میں ورود کے بعد اور نواب شجاع الدولہ کی وفات سے قبل یعنی ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھا ہے اور اس زمانے میں ان کی عمر ستر (۷۰) سال بتائی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی ولادت ۱۱۱۵ھ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں ''اگر ہم ۱۱۱۸ھ تسلیم کرلیں تو نقش علی کے بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے، اس لیے ۱۱۱۸ھ ہی زیادہ مناسب ہے۔''[۵]

جیسا کہ ان تفصیلات سے ظاہر ہے، قاضی صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم دونوں کے اخذ کردہ نتائج قیاسات بلکہ قیاس در قیاس پر مبنی ہیں۔ چنانچہ اگر قاضی صاحب کے موقف پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے میر سوؔز کی عمر کے معاملے میں ''متجاوز از ہشتاد'' کو پچاسی (۸۵) سال فرض کر کے ایک امکان کو امرِ واقعہ میں بدل دینے کی غلطی کی ہے تو ڈاکٹر خلیق انجم سے بھی اس بنا پر اختلاف کی گنجائش موجود ہے کہ انھوں نے نقش علی اور میر حسؔن دونوں کے تخمینۂ عمر کو مبنی بر حقیقت تصور کرتے ہوئے اور قاضی صاحب کے اس بیان کو کہ 'باغِ معانی' میں سوداؔ کا حال ۱۱۷۴ھ میں لکھا گیا ہے، مطابق واقعہ فرض کر کے ۱۱۱۸ھ کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں مرزا سوداؔ اور میر حسؔن کی باہمی ملاقاتوں کے حوالے سے ان کا یہ ارشاد بھی کہ ''اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا کا ترجمہ لکھتے ہوئے حسؔن نے مرزا سے ان کی عمر دریافت نہ کی ہو''،[۶] ایک مفروضے سے زیادہ حیثیت نہیں

رکھتا۔ اگر فی الواقع یہ صورت پیش آئی ہوتی تو انھوں نے ''سنِ شریف بہ ہفتاد رسیدہ باشد'' کی بجائے ''سنِ شریف بہ ہفتاد رسیدہ است'' لکھا ہوتا۔ پیرایۂ بیان کے اس فرق سے قطعِ نظر جہاں تک تعینِ عمر کا تعلق ہے، یہ حقیقت اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں کہ اس معاملے میں تذکرہ نگاروں کا رویّہ عام طور پر انتہائی غیر محتاط رہا ہے۔ مثلاً مصحفی کو یہ معلوم تھا کہ شاہ حاتم ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے تھے اور رمضان ۱۱۹۷ھ میں فوت ہوئے۔ اس حساب سے انتقال کے وقت ان کی عمر چھیاسی سال یا اس سے کچھ زائد رہی ہوگی، اس کے باوجود انھوں نے اسے ''قریب بہ صد'' قرار دیا ہے۔ یہی کیفیت میر حسن کی بھی ہے۔ ان سے میر کی عمر کے اندازے میں جو غلطی ہوئی ہے، اس کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔ اسی طرح 'باغِ معانی' میں سودا کے حالات یا کم سے کم ان کی عمر سے متعلق اندراج کا ۱۱۷۴ھ میں معرضِ تحریر میں آنا بھی کوئی حتمی یا طے شدہ واقعہ نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ 'باغِ معانی' سے ۱۱۷۴ھ برآمد ہوتا ہے لیکن اولاً نہ تو مؤلّف نے کہیں یہ صراحت کی ہے کہ یہ نام تاریخی ہے اور نہ ایسے واضح قرائن موجود ہیں جن سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ اس کا آغاز کب اور اختتام کس سنہ میں ہوا۔ ثانیاً اگر اس میں سالِ رواں کے طور پر دو جگہ ۱۱۷۴ھ کا ذکر آیا ہے تو چار جگہ ۱۱۸۸ھ، ۱۱۹۰ھ، ۱۱۹۶ھ اور ۱۱۹۸ھ، کے حوالے بھی موجود ہیں۔ ان حالات میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہنے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس تذکرے میں سودا کا حال ۱۱۷۴ھ میں لکھا گیا ہے اور اس وقت نقش علی نے ان کی جو عمر بتائی ہے، وہ خلافِ واقعہ نہیں۔

سالِ ولادت کی اس بحث میں ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک جگہ سعادت خاں ناصر کے تذکرے 'خوش معرکۂ زیبا' کے حوالے سے سودا کے بارے میں ایک فقیر کی یہ پیشین گوئی بھی نقل کی ہے کہ ''انشاءاللہ شہرت تیری چہار دانگِ ہندوستان میں بے حد و حساب اور عمر تخلص کی ہم عدد ہوگی۔'' اس روایت کے معاملے میں موصوف نے صرف اس مختصر تبصرے پر اکتفا کیا ہے کہ ''مرزا کے تخلص سودا سے ۷۱ برآمد ہوتا ہے، اس طرح ان کا سنِ ولادت ۱۱۲۴ھ قرار پاتا ہے، ممکن ہے کہ آزاد کا ماخذ یہ تذکرہ رہا ہو۔''[۸]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی روایات اکثر صورتوں میں انتہائی ضعیف

اور نا قابلِ اعتبار ہوا کرتی ہیں، چنانچہ انھیں کسی اہم فیصلے کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن مستثنیات سے انکار ممکن نہیں، اس لیے اس قسم کی ہر روایت کو سرسری طور پر بے اصل اور نا قابلِ قبول قرار دے کر یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ اصلاً ایسی کوئی پیشین گوئی نہ کی گئی ہو، لیکن بعد میں محض اس اتفاق کی بنا پر کہ سوداؔ کی عمر ان کے تخلص کے اعداد کے عین مطابق اکہتر (۷۱) سال ہوئی ہو، اس روایت کا گڑھ لیا جانا بعید از امکان نہیں، اس لیے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ سعادت خاں ناصرؔ کے اس بیان کو سرسری طور پر نظر انداز کر دیا جائے، بالخصوص اس بنا پر کہ اس کی تائید دو ایسے معاصر بیانات سے ہوتی ہے جو نسبتاً زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں پہلا بیان 'گلزارِ ابراہیم' کے مؤلّف علی ابراہیم خاں خلیلؔ کا ہے، جنھوں نے وضاحتاً سوداؔ کے سالِ وفات کا ذکر تو نہیں کیا لیکن میر قمر الدین منتؔ کا قطعۂ تاریخ نقل کر کے اس سے اپنی واقفیت کا اظہار کر دیا ہے۔ اس سے قبل انھوں نے لکھا ہے کہ:

''ہنگامے کہ سنینِ عمرش بہ شمارِ سبعین افتاد، داعیِ حق رالبیکِ اجابت گفت۔''[۹]

اپنے دوسرے تذکرے 'صحف ابراہیم' میں جو بعد کی تالیف ہے، خلیلؔ نے یہی بات نسبتاً واضح طور پر ان الفاظ میں دوہرائی ہے:

''ہنگامے کہ سالِ عمرش (بہ) ہفتاد افتاد، بہ سالِ یک ہزار و یک صد و نود و پنج ہجری ارتحال نمود۔''[۱۰]

خلیلؔ کے ان بیانات کی رو سے سوداؔ کا سالِ ولادت ۱۱۲۵ھ قرار پائے گا۔ لچھمی نرائن شفیقؔ اورنگ آبادی نے ان کی تاریخِ وفات ۴؍رجب ۱۱۹۵ھ (۲۶؍جون ۱۷۸۱ء) بتائی ہے۔[۱۱] جب کہ شاہ محمد حمزہ مارہروی کے مطابق یہ واقعہ جمادی الاخریٰ ۱۱۹۵ھ (مئی، جون ۱۷۸۱ء) میں پیش آیا تھا۔[۱۲] اس اعتبار سے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) کے اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے تو وفات کے وقت ان کی عمر ستر (۷۰) سال چھے ماہ کے قریب ہوگی جسے اکہتر (۷۱) سال بھی کہا جا سکتا ہے۔

دوسرا بیان جس سے متذکّرہ پیشین گوئی کی تائید ہوتی ہے، میر حسؔن دہلوی کا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، حسؔن نے اپنے تذکرے میں سوؔدا کا حال ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان قلمبند کیا ہے۔ اس وقت ان کا اندازہ تھا کہ ''سنِ شریف (او) بہ ہفتاد رسیدہ باشد''۔[۱۳] اس اندازۂ عمر میں غلطی کے امکان کی جانب سطورِ ماقبل میں اشارہ کیا جا چکا ہے، لیکن اس کا ایک قابلِ غور پہلو اور بھی ہے۔ انھی میر حسؔن نے اسی تذکرے میں میؔر کے بارے میں لکھا ہے کہ ''سنِ او قریبِ شصت رسیدہ''۔[۱۴] چوں کہ میؔر اس زمانے تک خود میر حسؔن کے الفاظ میں ''میرِ شعرائے ہندوستاں'' اور ''افصحِ فصحائے زماں'' کا مرتبہ حاصل کر چکے تھے، اس لیے قیاس یہ ہے کہ سوؔدا کی طرح ان کا حال بھی تذکرے کی ترتیب کے ابتدائی ایّام ہی میں لکھا گیا ہوگا۔ اگر یہ قیاس درست ہے اور بہ ظاہر اس کے درست نہ ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حسؔن کے اندازے کے مطابق سوؔدا اور میؔر کی عمروں میں تقریباً (۱۰) سال کا فرق تھا، یعنی سوؔدا میؔر سے دس (۱۰) سال بڑے تھے۔ میؔر کے متعلق یہ بات طے ہو چکی ہے کہ وہ ۱۱۳۵ھ کے اواخر (۱۷۲۳ء) میں پیدا ہوئے تھے گویا جس وقت میؔر حسن نے اپنے تذکرے میں ان کا حال لکھا ہے، ان کی عمر ساٹھ سال کی بجائے پچاس سال کے قریب تھی۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوؔدا ان سے دس (۱۰) سال پہلے ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں پیدا ہوئے ہوں گے اور اس تذکرے میں ان کے حالات کے اندراج کے وقت ان کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔ ہمارے نزدیک ان کے سالِ ولادت سے متعلق یہی اندازہ سب سے زیادہ قرینِ صحت ہے۔

حواشی

۱۔ آبِ حیات (عکسی ایڈیشن)، یو. پی. اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۴۱
۲۔ سودا از شیخ چاند، انجمن ترقیِ اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۴۷
۳۔ ماہ نامہ 'سب رس'، حیدر آباد، شمارہ نومبر ۱۹۶۰ء، بہ حوالۂ 'مرزا محمد رفیع سودا' از خلیق انجم، انجمن ترقیِ اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۶۹ و ۷۰
۴۔ مرزا محمد رفیع سودا، ص ۷۰
۵۔ ایضاً، ص ۷۱ و ۷۲
۶۔ ایضاً، ص ۷۲
۷۔ تذکرۂ ہندی، انجمن ترقیِ اردو (ہند) اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء ص ص ۸۰ و ۸۱
وُعقدِ ثریا'، انجمن ترقی اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۴ء، ص ۲۳
۸۔ مرزا محمد رفیع سودا، ص ۶۶ و ۶۷
۹۔ گلزارِ ابراہیم، مرتبہ کلیم الدین احمد، دائرۂ ادب، پٹنہ، ۱۹۷۸ء، ص ۱۸۲
۱۰۔ صحفِ ابراہیم، مرتبہ عابد رضا بیدار، کتب خانۂ خدا بخش پٹنہ، ۱۹۷۸ء، ص ۸۲
۱۱۔ بہ حوالہ مرزا محمد رفیع سودا، ص ۱۳۰
۱۲۔ فصّ الکلمات، ورق ۱۷۲ ب بہ حوالہ مرزا محمد رفیع سودا، ص ۱۳۱
۱۳۔ تذکرۂ شعرائے اردو، انجمن ترقیِ اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۸۳
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵۲

مرزا محمد رفیع سودا تحقیقی و تنقیدی جائزے، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۲۰۰۱ء و متعلقاتِ سودا از ڈاکٹر نسیم احمد، مطبوعہ دہلی، ۲۰۰۳ء)

میرؔ کا دیوانِ چہارم

(ایک اہم قلمی نسخہ)

میرؔ کے کلیات اور دواوین کے جو قلمی نسخے ہند اور بیرونِ ہند کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں دیوانِ سوم اور دیوانِ چہارم کے دو نسخے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دونوں نسخوں کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ ان کی کتابت میرؔ صاحب کے بھانجے اور داماد میر حسن علی تجلّی نے کی ہے اور یہ کام میرؔ کی زندگی میں ۱۲۰۹ھ/ ۹۵-۱۷۹۴ء اور ۱۲۱۳ھ/ ۹۹-۱۷۹۸ء کے درمیان انجام پایا ہے۔ ۱۲۰۹ھ کا ایک قطعۂ تاریخ دیوانِ چہارم کے آخر میں موجود ہے اور ۱۲۱۳ھ تجلّی کا سالِ وفات ہے۔ دوسری قابلِ لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ یہ دونوں نسخے دیوانِ اول تا چہارم کے ان چار نسخوں کے باقیات میں سے ہیں جو خود میرؔ صاحب نے لکھنؤ کے ایک مقتدر اور صاحبِ ذوق رئیس مرزا محسن کو پیش کیے تھے۔ تیسری خصوصیت جو ان نسخوں کو دوسرے نسخوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ ان کے سرورق مرزا محسن کی ایک ایسی تحریر سے مزیّن ہیں جس میں میرؔ صاحب کی وفات، سنِ عمر اور تدفین سے متعلق تمام تفصیلات محفوظ کر دی گئی ہیں۔ انفرادی طور پر دیوانِ چہارم کا ایک قابلِ ذکر امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے ورق ۶۵ ب پر اصل نسخے کے کاتب کے علاوہ کسی

اور شخص نے ''نوادر الکملا'' سے میؔر کے ترجمے کا طویل اقتباس نقل کر دیا ہے جس سے بہ طورِ خاص ان کے زمانۂ ولادت کا علم ہوتا ہے۔ یہ تذکرہ اب نایاب ہے، حتّٰی کہ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا مؤلّف کون ہے اور یہ کس زمانے میں لکھا گیا ہے؟ متذکرۂ بالا دونوں دواوین میں سے دیوانِ سوم کا نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ لالہ سری رام میں محفوظ ہے۔ اس کے متعلق راقم السطور کا تعارفی مضمون ماہ نامہ 'نیا دور' لکھنؤ کے فروری ۱۹۷۸ء کے شمارے کے علاوہ مجلّۂ 'نقوش' لاہور کے 'میر نمبر' کی جلدِ سوم (شمارہ اگست ۱۹۸۳ء) میں بھی شائع ہو چکا ہے اور اس کے مجموعۂ مضامین 'میر و مصحفی' (مطبوعہ ۲۰۰۳ء) میں بھی شامل ہے۔ دیوانِ چہارم کا تعارف پروفیسر اکبر حیدری اپنے مضمون مطبوعہ ماہ نامہ 'نیا دور'، شمارہ جنوری ۱۹۷۴ء کے علاوہ 'دیوانِ میر' (نسخۂ محمود آباد، مخطوطہ ۱۲۰۳ھ بہ حیاتِ میؔر)، شائع کردہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، مطبوعہ ۱۹۷۳ء کے مقدمے میں بھی سپردِ قلم فرما چکے ہیں۔ یہ نسخۂ دیوان پہلے مہاراجا محمود آباد کے کتب خانے کی ملکیت تھا لیکن اب رضا لائبریری رام پور کے ذخیرۂ مخطوطات میں شامل ہو چکا ہے۔

'نیا دور' کا شمارہ جنوری ۱۹۷۴ء اس وقت ہماری دسترس میں نہیں اور 'دیوانِ میر' کے مقدمے میں دیوانِ چہارم کے مذکورۂ بالا نسخے کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، وہ مختلف النوع نقائص سے مملو ہیں۔ مثلاً فاضل محقق نے تعارف کے آغاز میں مخطوطے کے نمبر، سائز اور مسطر سے متعلق اندراجات کے بعد اس کا خط شکستہ بتایا ہے جو درست نہیں۔ پورا نسخہ قدیم روشِ املا کے مطابق رواں مگر صاف نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔ البتہ بعض حروف مثلاً میم، نون اور یے کی کشش کہیں کہیں خطِ شکستہ کے قریب آ گئی ہے۔ غزلوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ صفحہ ۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۳۹ پر ختم ہوتی ہیں۔ یہ بیان بھی بہ نفسِ نفیس صفحہ بہ صفحہ شمار کی بجائے درج شدہ صفحات نمبر پر مبنی ہے جو صحیح نہیں۔ اصلاً اس سلسلے کے آخری صفحے کا نمبر ۱۲۹ ہے۔ یہ بے ترتیبی غزلیات کے بعد دیگر اصنافِ سخن سے متعلق تفصیلات میں بھی برقرار رہی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سرورق کے ایک اندراج میں اس نسخے کے اوراق کی تعداد ۱۰۲ (۲۰۴ صفحات) بتائی گئی

ہے، لیکن پروفیسر اکبر حیدری کی پیش کردہ تفصیلات اور ہمارے شمار کے مطابق بہ صورتِ موجودہ یہ نسخہ ۱۶۷ صفحات پر مشتمل ہے اور موجودہ صفحات نمبر ۱۶۰ و ۱۶۱ کے درمیان سے چار صفحات (دو ورق) غائب ہونے کے علاوہ بہ ظاہر مزید کسی ورق کے غائب ہونے کا امکان نظر نہیں آتا۔

ابتدائی تعارف کے بعد محقق موصوف نے اس مخطوطے کی اہمیت واضح کرنے کی غرض سے سب سے پہلے اس کے سرورق کی تحریر کا حوالہ دیا ہے۔ اس موقعے پر وہ اس نسخے کے مالک محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد اور میرؔ کے بھتیجے میر محمد محسن کو شخصِ واحد تصور کر کے جس التباس کا شکار ہوئے ہیں، وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ محسن نے سرورق کی اس تحریر میں اپنا نام تین جگہ لکھا ہے اور ان تینوں مقامات میں سے کسی جگہ بھی لفظ میر کو بہ طور سابقہ جزوِ نام نہیں بنایا، لیکن فاضل محقق نے اپنی تحریر میں لفظ میر کو ہر جگہ لازماً ان کے نام کے ساتھ شامل کیا ہے اور ایسا پانچ بار ہوا ہے۔ ان میں سے ایک جگہ انھیں واضح طور پر ''میر محمد حسن (کذا) المتخلص بہ محسنؔ برادر زادۂ میر تقی میرؔ'' لکھ کر التباس یا غلط فہمی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد سے میرؔ کا کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ وہ لکھنؤ کے مشہور رئیس فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر متخلص بہ جعفرؔ (متوفّٰی ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء) کے صاحبزادے اور قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی متخلص بہ قمرؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ مرزا محسن نے ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۰ء میں وفات پائی۔

اس سلسلے میں مخطوطے کے سرورق سے مرزا محسن کی دستخطی عبارت نقل کرنے میں بھی پوری احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں کئی غلطیاں در آئی ہیں۔ اگرچہ یہ غلطیاں معنوی طور پر زیادہ اہم نہیں، پھر بھی اصل متن سے انحراف کی بنا پر انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اختلافِ متن کی ان صورتوں کو نمایاں کرنے کی غرض سے سطورِ ذیل میں 'دیوانِ میر' کے مقدمے سے حیدری صاحب کی پیش کردہ عبارت نقل کر کے قوسین میں اصل متن کی نشان دہی کی جا رہی ہے:

''بروز جمعہ بیستم ماہ شعبان المکرّم وقت شام سنہ ۱۲۲۵

یک ہزار دوصد بست وپنجم ہجری بودہ (یک ہزار ودوصد وبیست وپنج ہجری بود) میر محمد تقی صاحب میر تخلص صاحب ایں دیوان چہارم در شہر لکھنؤ درمحلّہ سٹھٹی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند وروز (بروز) شنبہ بست (بیست) ویکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دو پہر دراکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور (نزد یک دیگر قبور) اقربائے خویش مدفون شدند وچہار دیوان خودرا کہ ایں دیوان چہارم (ہم) ازاں جملہ است، بحر رسطور محمد محسن المخاطب بزین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیاتہ درحین حیات خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشید ندخدایش بیامرزاد (بیامرزاد)

حررہ محمد محسن عفی عنہ روز جمعہ بست (بیست) وہفتم ماہ شعبان سنہ الیہ

بوقت چہار گھڑی روز باقی ماندہ

ایں دیوان از دستخط (بدستخط) میر حسن علی تجلی داماد

میر مغفوراست

بحررہ (لمحررہ) محمد محسن عفی عنہ:

محمد تقی میر شاعر کہ بود — مسلم ورا تخت و تاج سخن
باقلیم معنی ز ارباب شعر — ستاننده او بود باج سخن
زمرگش چوبے نورشد شعر سال — نوشتم بمرده سراج سخن

دیگر ۱۲۲۵ھ

میر تقی استاد فن شعر — مرد و زن دنیا سوے عدم شد
گشت چو اشعارش ہمہ بے سر — میر تقی استاد رقم شد

۱۲۲۶ ۱۲۲۵ھ

زیر نظر قلمی نسخے اور متداول متن کے تقابلی مطالعے کے بعد پروفیسر اکبر حیدری نے اس نسخے کے جن زائد اشعار کی نشاں دہی فرمائی ہے، ان کی تفصیل انھی کے الفاظ میں

حسب ذیل ہے:

(۱) دیوانِ غزلیات ذیل کی غیر مطبوعہ غزل پر ختم ہوتا ہے۔

یہ کلول نہیں ٹلتی جی پر سے اس کے　　علاقہ ہوا جس کو خنجر سے اس کے
سکھادے ہے ہجراں کا غم دلبروں کے　　اُگے پھول کانٹے ہو بستر سے اس کے
وہ بے رحم گھر سے بھی اپنے نہ نکلا　　گئیں نعشیں غم کشتوں کے در سے اس کے
کبھو کہاوے گا آفتاب آفتابا　　سحر دیر بڑھتا ہے اب گھر سے اس کے

کہیں میرؔ کی جلتی آنکھیں ہوں ٹھنڈی
کف پا ملو دیدۂ تر سے اس کے

(۲) نسخہ میں یہ شعر بھی غیر مطبوعہ ہے۔

بد کرو خوبی سے بقول میرؔ　　عیب کرنے کو بھی ہنر ہے شرط

(۳) دیوان میں دو شعر ایسے ہیں۔

ان پریوں سے لڑکوں کے جھپٹے میں دل آئے
بے ہوش و خرد جیسے پری وار ہیں ہم لوگ
در پر کسو کے جا کے کھڑے ہوں تو کھڑے ہیں
حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

مطبوعہ نسخوں میں یہ دونوں شعر ذیل کے شعر کی صورت میں ہے:

ان پریوں سے لڑکوں کے جھپٹے میں دل آئے
حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

اس تفصیل کے مطابق حیدری صاحب نے متداول متن پر کل سات اشعار کا اضافہ فرمایا ہے، لیکن موصوف نے جو زائد غزل نقل فرمائی ہے اس کے دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی میں اصل نسخے میں ''اگے پھول'' کی بجائے ''اوٹھے پھول'' درج ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ اسی طرح تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''غم کشتوں کے در سے'' کی

بجائے ''غم کشتوں کی در سے'' اور چوتھے شعر کے مصرعِ اولیٰ میں ''کہاوے گا آفتاب'' کی بجائے ''کھاوے گا آفتاب'' ہونا چاہیے۔ ''آفتاب خوردن'' فارسی محاورہ ہے جس کے معنی ''رنج وتعب کشیدن'' ہیں۔ ''آفتابا'' غالباً ''آفتاب آ'' ہے۔

اکبر حیدری صاحب کے برخلاف ہمارے مطالعے کے مطابق زیر بحث مخطوطے کے حصۂ غزلیات میں متداول نسخوں کے مقابلے میں کل سولہ اشعار زیادہ ہیں۔ سطورِ گذشتہ میں نقل شدہ سات شعروں کے علاوہ باقی نو اشعار کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) ۲۰۰۳ء میں کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے شائع کردہ 'کلیاتِ میر' کی جلد اول کی غزل نمبر ۱۴۸۳ کا پانچواں شعر درج ذیل ہے:

دم میں ہے دم جہاں تئیں، گرمِ تلاش ہوں
سو پیچ وتاب رہتے ہیں ہر ایک مو کے ساتھ

یہ شعر دراصل مندرجۂ ذیل دو اشعار کے دو مختلف المعنی مصرعوں سے مرکب ہے:

دم میں ہے دم جہاں تئیں، گرمِ تلاش ہوں
جی بھی لگا رکھا ہے تری جستجو کے ساتھ
کیا آگ تن بدن میں محبت نے پھونک دی
سو پیچ وتاب رہتے ہیں ہر ایک مو کے ساتھ

(۲) غزل نمبر ۱۳۵۱ کا چوتھا شعر جو 'کلیاتِ میر' کے متذکرۂ بالا ایڈیشن میں شامل نہیں، درج ذیل ہے:

نہ یاری یاوری طالع نے کچھ کی گیا بے یار سب یارا ہمارا

(۳) غزل نمبر ۱۳۶۳، شعر نمبر ۵

مہلتِ غم میں کیا کیا جاوے عمر جاتی رہی شتاب بہت

(۴) غزل نمبر ۱۳۷۱، شعر نمبر ۷

ہنگامہ اس کے دیکھنے والوں کا تھا بلا محشر بھی گم ہوئی ہے اسی شور وشر کے بیچ

(۵) غزل نمبر ۱۳۷۲، شعر نمبر ۶

چارۂ کارِ فقیراں کس سے ہو جز چارہ ساز　　بے من وتو وہ کرے ہے کام ناچاری کے بیچ

(۶) غزل نمبر۱۴۰۲، شعر نمبر۳

بے خودِ شوق میں تو در پہ کھڑا　　نہ گئی اس کو یہ خبر افسوس

پہلے مصرعے کا متن درست نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہاں ''تو'' کی بجائے ''ہوں'' ہونا چاہیے۔

(۷) غزل نمبر۱۴۲۳، شعر نمبر۴

خوش نما کس قدر ہیں چسپاں پوش　　تنگ آئے ہیں اپنی جان سے لوگ

(۸) غزل نمبر۱۴۳۸، شعر نمبر۵

گل پھول سے چمن میں، لڑکوں سے مکتبوں میں　　اک عمر اپنے دل کو بہلا کے رہ گئے ہم

(۹) غزل نمبر۱۴۸۱، شعر نمبر۴

سفرِ کعبہ نہیں ہے سفرِ دیر کہ ہے　　اس رہِ دور میں ہر گام خدا اپنے ساتھ

زیر بحث مخطوطہ اغلاطِ املا اور سہوِ قلم جیسے نقائص سے یکسر پاک نہیں، تاہم ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ انھیں محض اتفاق قرار دے کر بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ حیدری صاحب کی نقل کردہ غیر مطبوعہ غزل کے چوتھے شعر میں ''آفتاب آ'' کی بجائے ''آفتابا'' کا اندراج اسی ذیل میں آتا ہے۔ اسی قسم کی ایک اور مثال غزل نمبر۱۴۰۲ کے شعر نمبر۳ کے سلسلے میں گذشتہ سطور میں پیش کی جا چکی ہے۔ تین اور قابل ذکر مثالیں درجِ ذیل ہیں:

(۱)　　حسن و خوبی ہے دوستاں کیا چیز
ٹھہری ہے جان سی بھی شے کیا چیز

مطبوعہ متن میں اس مطلعے کا مصرعِ اول اس طرح منقول ہے: 'دوستاں حسن وخوبی ہے کیا چیز' اور بندش سست ہو جانے کے باوجود یہی صحیح ہے کیونکہ ''شے'' کا قافیہ ''ہے'' ہی ہو سکتا ہے ''دوستاں'' نہیں۔

(۲) غزل نمبر۱۵۱۱ کا شعر نمبر۵

رسوا، خراب، غم کش، دل باختہ، مخبت عاشق کو تیرے غم میں کیا کیا کہا گیا ہے

مصرعِ اول کا آخری لفظ ''محبت'' (م ح ب ت) دراصل ''مخبّط'' (م خ بّ ط) ہے جس کے معنی مخبوط الحواس ہیں۔ متداول متن میں اس ''مخبت'' (م خ ب ت) نے ''مخبت'' (م خ ب ت) کی شکل اختیار کر لی ہے جو یہاں بالکل بے محل ہے۔

(۳) دکھلانے کو لوگوں کے دنوں کی ہے صلاح
پیشِ انجم نمازِ شب کرتے ہیں

یہ ایک رباعی کے آخری دو مصرعے ہیں۔ مصرعِ اول کا آخری لفظ ''صلوٰۃ'' ہونا چاہیے، جسے غلطی سے ''صلاح'' لکھ دیا گیا ہے۔

اس قسم کی بعض غلطیوں کے باوجود اس نسخے کا متن عام طور پر دوسرے نسخوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر اور قابلِ ترجیح ہے۔ پیشِ نظر مضمون میں اس امتیازی وصف کی مکمل نمائندگی ممکن نہیں، اس لیے جستہ جستہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان مثالوں میں اولاً 'کلیاتِ میر' کے متذکرۂ بالا نسخے سے متداول متن نقل کر کے اس کے نیچے مختلف فیہ متن درج کر دیا گیا ہے:

(۱) یارب ہماری جانب یہ سنگ کیوں ہے عاید
ننگ

جی ہی سے مارتے ہیں جو نام لے وفا کا
نام لیں

(۲) بات کہی تلوار نکالی آنکھ لڑائی جی مارے
کہے نکالے لڑائے

کیونکہ جتاوے اس سے کوئی ربط محبت پیارا اپنا

(۳) کیا تعجب ہے جو کوئی دل زدہ ناگہ مرے
اضطرابِ عشق میں جی تن سے گھبرایا، گیا
سے میں

(۴) پاس سے اٹھ چلتا ہے وہ تو آپ میں میں رہتا ہی نہیں
رہتا میں بھی نہیں

لے جاتا ہے جا سے مجھ کو جانا اس ہر جائی کا

(۵) میرؔ سختی کش تھا غافل پر خدا نے خیر کی
حادثے کا کیسا اس کے سر پہ سے پتھر گیا
اس کے سر پر سے چلا پتھر گیا

(۶) روند کے جور سے ان نے ہم کو پاؤں حنائی اپنے کیے
مارا جور سے

خون ہمارا بسمل گہ میں کن رنگوں پامال کیا

(۷) وہی ہے رونا، وہی ہے کڑھنا، وہی ہے سوزش جوانی کی سی
شورش

بڑھاپا آیا ہے عشق ہی میں پہ میرؔ ہم کو نہ ڈھنگ آیا

(۸) ردیف واؤ کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل مطلع میں بھی اصلاً ''سوزش'' کی بجائے ''شورش'' ہی نظم ہوا ہے:

دیتی ہے طول بلبل کیا سوزشِ فغاں کو
اک نالہ حوصلے سے بس ہے وداعِ جاں کو

(۹) جُنگِ زمانہ میں تو مبحث ہے عشق ہی کا
اک مبحث تھا عشق کا بھی

بے جا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا

(۱۰) شیریں کا حسن ایسا تھا جو خستہ جان دیں
ایسا نہ تھا جس پہ

جو کچھ ہوا وہ خواہشِ فرہاد سے ہوا

(۱۱) ہوں بخود تو کوئی پہنچے مجھ تلک

بے خودی نے حال پہنچایا ہے اب
دور

(۱۲) عرش پہ دھونی لگانے کو تھے دو دِل سے کب تک ہم
کل تک
خاک پہ یاں کی درویشانہ ہم نے بچھایا بستر آج
یھاں

(۱۳) جینے سے ہم غم کشتوں کے خاطر تم بھی جمع کرو
کل تک کام نہیں کھینچے گا غش آتا ہے اکثر آج
کھنچنے کا

(۱۴) گل کی تو بو سے غش نہیں آتا کسو کے تئیں
گل بو کیے سے
ہے فرق میرؔ پھول کی اور اس کی بو کے بیچ

(۱۵) پھرتا ہے میرؔ کیا تو گلستاں میں غم زدہ
نیستاں
کچھ دل خراش لکھ بھی قلم اک تراش کر

(۱۶) دیکھے دامن کے نیچے کے سے دیے
دِکھے
میرؔ نے گر تلے چھپائے داغ
کُرتے تلے

(۱۷) کس کو دماغ رہا ہے یھاں آٹھ پہر کی منت کا
یھاں اب آٹھ
ربط اخلاص سے دن گذرے ہے خلطہ اس سے شب موقوف
سے دن کے گذرے

(۱۸) غمِ مضموں نہ خاطر میں، نہ دل میں درد کیا حاصل
نہ مضمون غم کا
ہوا کاغذ نمط گورنگ تیرا زرد، کیا حاصل

(۱۹) خستہ جانی نے ننگِ خلق کیا
حالی
پر اسے مجھ سے عار ہے تا حال

(۲۰) اکثر نڈھال ہیں ہم پر یوں نہیں وہ کہتا
کیا ہے کہ جاتے ہو گے کچھ اتنے ہی ڈھلے تم
ہو کچھ اتنے ڈھلے ڈھلے

(۲۱) اب حیرت ہے کس کس جا گہ پنبہ و مرہم رکھنے کی
رکھیے گا
قد تو کیا ہے سروِ چراغاں داغ بدن پر کھا کھا ہم

(۲۲) ہو کے بدحال محبت میں کھنچے آخر کار
کھپے
لوگ اچھے تھے بہت یار کے بیماروں میں

(۲۳) غزل نمبر۱۵۰۳ کے مندرجہ ذیل شعر میں بھی ''کھنچے'' کی جگہ اصلاً ''کھپے'' ہی نظم ہوا ہے۔

بہت مو پریشاں کھنچے اس کے غم میں
خدا جانے ہے بید کس کی نشانی

(۲۴) ہر لحظہ بے قراری، ہر لحظہ آہ وزاری
ہر لمحہ
ہر دم ہے اشک باری نومیدی ہے نظر میں

(۲۵) اس چشم سرخ پر ہے وہ ابروے کشیدہ ہیں ووں
جوں تُرکِ مست رکھ لے سر کے تلے کماں کو

(۲۶) اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد کھاؤ کسو کی تیغ، کسو کے شکار ہو جاؤ کے نیچے

(۲۷) گردشِ چشمِ سیہ کا سے سے جمع نہ رکھو خاطر تم چرخِ سیہ کاسہ
بھوکا پیاسا مار رکھا ہے تم سے ان نے ہزاروں کو

مخطوطے میں بھی اصلاً ''چشم'' ہی لکھا گیا تھا۔ بعد میں اسے نشان زد کر کے حاشیے پر ''چرخ'' بنا دیا گیا ہے۔

(۲۸) گریۂ خونیں سے ہیں رخسار میرے لعل تر لال میر
دیدۂ خوں بار یوں ہیں جیسے منہ پر گھاؤ ہو

(۲۹) صبر کہاں جو تم کو کہیے لگ کے گلے سے سو جاؤ جو لگ کے گلے سے تم بن کہنے
بولو نہ بولو، بیٹھو نہ بیٹھو کھڑے کھڑے ٹک ہو جاؤ ہی

(۳۰) وارفتہ ہے گلستاں اس روے چمپئی کا چہرۂ (چہرئی)
ہے فصلِ گل پہ گل کا اب وہ نہیں مزہ کچھ گل کی ہوا

(۳۱) کیا کہیے جب میں نے کہا ہے میؔر ہے مغرور اس پر تو
میر معزز
اپنی زباں مت کھول تو ان نے اور کہا ہے کیا کیا کچھ

(۳۲) وہ جو ماہِ زمیں گرد اپنا دو پہری ہے ان روزوں
دور پھرے ہے
شوق میں ہر شب حرف وسخن ہے ہم کو فلک کے تاروں سے

(۳۳) مائلِ کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ
دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے
سے

(۳۴) کیا اضطرابِ دل سے کہے میؔر سرِ عشق
میرا سیرِ عشق
یہ حال سمجھے وہ جو گرفتار ہو کوئی

(۳۵) برا ہے دل کا ہمارے لگنا لگانا غصے سے عاشقی کے
لگا تو
نچی جبیں سے گلی میں اس کی خراب وخستہ پھرا کریں گے
جبینیں خراب خستہ

(۳۶) اگر وہ رشکِ بہار سمجھے کہ رنگ اپنا بھی ہے اب ایسا
مگر
ورق خزاں میں جو زرد ہوں گے غمِ دل اس پر لکھا کریں گے
ان پر

(۳۷) وصال ہووے تو قدرت نما ہے قدرت کا
قدرت نمائی ہے حق کی
نہ ہم کو قدر نہ قدرت، خدا ہی قادر ہے

(۳۸) شورِ جرس شب گیر کا غافل تیاری کا تکیہ ہے
تنبّہ
یعنی آنکھ نہ لگنے پاوے قافلہ صبح کو چلتا ہے

(۳۹) گہ صوفی چل میخانے میں لطف نہیں اب مسجد میں
کہہ صوفی سے چل میخانے
ابر ہے باراں، باؤ ہے نرمک، رنگ بدن میں جھمکا ہے
رنگِ برق بھی چمکا ہے

(۴۰) خواہش دل کی کس سے کہیے محرم تو نا پیدا ہے
خواہشیں
چپ ہیں کچھ کر سکتے نہیں پر جی میں ہمارے کیا کیا ہے
کہہ

فصحاے دہلی ''یہاں'' اور ''وہاں'' کو ''جہاں'' اور ''کہاں'' کے وزن پر استعمال کرنا خلافِ فصاحت تصور کرتے تھے۔ وہ ان دونوں لفظوں کو ہاے مخلوط کے ساتھ ''ہاں'' اور ''جاں'' کے وزن پر بولنے اور نظم کرنے کے قائل تھے۔ سید انشؔا اور مرزا غالبؔ کی تحریروں میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ میرؔ کے اس دیوانِ چہارم میں بھی یہ دونوں لفظ بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں اور اس کے پیشِ نظر قلمی نسخے میں انھیں متذکرۂ بالا دستور کے عین مطابق ہر جگہ بالالتزام ''ہے'' کے ساتھ لکھا گیا ہے اور ''ہاں'' اور ''جاں'' کے وزن پر نظم کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف کلیاتِ مطبوعہ میں ان کا املا بدل کر ''یاں'' اور ''واں'' کر دیا گیا ہے، جو اس دور کی لسانی شناخت کے منافی اور اس اعتبار سے اصولی طور پر غلط ہے۔ اس کلیے سے استثنا کی اس مطبوعہ نسخے میں صرف پانچ مثالیں ملتی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) تن کو جس جا گہ سے چھیڑوں ہوں وہاں ہے درد درد
ہاتھ لگتے دل کے ہو جاتا ہوں کچھ میں زرد زرد

(۲) کس کو دماغ رہا ہے یھاں آٹھ پہر کی منت کا

ربطِ اخلاص سے دن گذرے ہے خلطہ اس سے شب موقوف

(۳) میرؔ جہاں ہے مقامر خانہ پیدا یھاں کا نہ پیدا ہے
آؤ یہاں تو داؤ نخستیں اپنے تئیں بھی کھو جاؤ

(۴) اس کی گلی وہ ظلم کدہ ہے آنکلے جو کوئی وہاں
گرد رہِ عشق آلودہ تو لو ہو میں اپنے نہا جاوے

مندرجۂ بالا مثالوں میں دوسرے اور تیسرے شعر کے پہلے مصرعوں میں ''یھاں'' کا املا اور وزن دونوں قدیم اصول کے عین مطابق ہیں۔ چوتھے شعر میں ''وہاں'' اور ''وھاں'' دونوں طرح پڑھے جانے کی گنجائش ہے، اس لیے اسے بھی ''وھاں'' ہی سمجھنا چاہیے۔ البتہ پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ ''وہاں'' اور تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''یہاں'' متذکرہ معمول کے برخلاف ''جہاں'' اور ''کہاں'' کے وزن پر نظم ہوا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں مصرعوں کا متن اصل متن سے مختلف ہے۔ قلمی نسخے میں یہ دونوں مصرعے اس طرح منقول ہیں:

(۱) تن کو جس جا گہ سے اب چھیڑوں ہوں وہاں ہے درد درد
(۲) آؤ جو یہاں تو داؤ نخستیں اپنے تئیں بھی کھو جاؤ

یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ تیسرے شعر کے مصرعِ اول کا متن مطبوعہ اور قلمی دونوں نسخوں میں بہ ظاہر نادرست ہے۔ قلمی نسخے میں اس کی صورت حسب ذیل ہے:

میرؔ جہاں ہے مقامر خانہ پیدا یہاں کے پیدا ہے

ہمارے نزدیک صحیح متن ''میرؔ جہاں ہے مقامر خانہ پیدا یھاں نا پیدا ہے'' ہوسکتا ہے۔

غزلیات کے بعد دیوان کے اس نسخے میں ''رباعیات'' کے زیرعنوان آٹھ رباعیاں اور ایک قطعہ (نمبر۴) درج ہے۔ بعدازاں مثنویات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جس میں بہ تفصیلِ ذیل پانچ مثنویات شامل ہیں۔

(۱) ہولی نامہ: کلیاتِ میر، جلدِ دوم میں اسے ''در بیانِ ہولی'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں کل ۴۵ شعر ہیں۔ اختتام سات اشعار کی ایک غزل پر ہوا ہے۔ اس طرح اس کے اشعار کی مجموعی تعداد ۵۲ ہوگئی ہے۔

(۲) بزنامہ: کلیات میں اسے ''در بیانِ بز'' کا نام دیا گیا ہے۔ اشعار کی تعداد ستائیس ہے۔

(۳) جگرسوز: کلیات میں اس مثنوی کا عنوان ''درحالِ افغان پسر'' ہے۔ وہاں اس کے اشعار کی تعداد ۱۶۴ ہے۔ مخطوطے میں شعر نمبر ۱۵۶ کے بعد مندرجہ ذیل شعر زائد ہے:

چلا ساتھ چپ، سرفگندہ گیا
عدم کو نہیں کوئی زندہ گیا

(۴) یہ مثنوی مخطوطے میں کسی عنوان کے بغیر منقول ہے۔ کلیات میں اس کا اندراج ''در جشنِ ہولی و کتخدائی'' کے عنوان سے ہوا ہے اور اس کے اشعار کی مجموعی تعداد ایک سو ستر ہ ہے۔ آخر میں شامل غزل کے دس شعر اس کے علاوہ ہیں۔ مخطوطے میں اس حصّے کے دو ورق غائب ہیں، جن پر شعر نمبر ۶۹ سے شعر نمبر ۱۱۶ تک کل ۴۸ اشعار درج تھے۔ اس کے نتیجے میں موجود اشعار کی کل تعداد ۶۹ رہ گئی ہے۔ شعر نمبر ۵۷ سہواً مکرر درج ہوگیا ہے۔

اس مثنوی میں جو غزل شامل ہے، اس کا چوتھا مصرع تاریخی ہے۔ نسخۂ مطبوعہ میں اس کی صورت حسب ذیل ہے:

ہم نے کبھی نہ دیکھی اس رنگ کد خدائی

اور اس سے سنہ ۱۲۱۷ھ مطابق ۳-۱۸۰۲ء اخذ کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف قلمی نسخے میں اس مصرعے کے تیسرے لفظ ''کبھی'' کی جگہ ''کبھو'' منقول ہے اور اس کے نیچے ۱۲۰۹ھ درج ہے، حالانکہ یہ مثنوی وزیر علی خاں کی تقریبِ شادی سے متعلق ہے جو کمال الدین حیدر کے بیان کے مطابق ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں ہوئی تھی۔ تاریخ گوئی کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق پیش کردہ مصرعے سے اس کی متذکرہ دونوں صورتوں میں

بالترتیب ۱۲۲۶ھ اور ۱۲۲۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس اشکال کو دور کرنے کی ممکنہ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس مصرعے کے متنازعہ فیہ متن میں ''کبھی'' کے مقابلے میں ''کبھو'' کو صحیح مان لیا جائے اور ''نہ'' اور ''دیکھی'' کو علیحدہ علیحدہ لکھنے کی بجائے ملا کر (ندیکھی) لکھا جائے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ میر صاحب نے قاعدے کے برخلاف لفظ ''کدخدائی'' کی پہلی یے کو ہمزہ قرار دیا ہے اور اس کا ایک عدد بھی محسوب کیا ہے۔ اس طرح اس مصرعے کے اعداد کا حاصل ۱۲۰۸ھ ہو جائے گا جو مطلوب ہے۔

(۵) جنگ نامہ: مخطوطے میں یہ مثنوی پچپن اشعار اور سات شعر کی ایک غزل پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ کلیات میں بھی مثنوی کے اشعار کی تعداد پچپن ہی ہے، لیکن اس کے آخر میں مخطوطے میں منقول غزل کی بجائے دوسری دو غزلیں شامل ہیں جن کے اشعار کی تعداد بالترتیب نو اور پانچ ہے۔ مخطوطے کی غزل کا مطلع درج ذیل ہے۔

رنج کی اس کے جو خبر گذرے
رفتہ وارفتہ اس کا مر گذرے

یہ غزل اس دیوان کے حصّۂ غزلیات میں بھی موجود ہے۔ کلیاتِ مطبوعہ میں اس کا نمبر ۱۵۲۷ ہے۔ اس طرح ایک غزل کا دو جگہ درج کیا جانا میر صاحب کے معمولات کے خلاف ہے۔

غزلیات کی طرح مثنویات کے اشعار میں بھی جا بہ جا اختلافِ متن کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ موضوع بجائے خود تفصیل طلب ہے، اس لیے اسے کسی اور وقت کے لیے ملتوی کیا جاتا ہے۔

(ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، میر نمبر، شمارہ مئی، جون ۲۰۱۰ء)

مثنویِ ہدایتؔ در تعریف بنارس

ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ دہلوی عصرِ میر و مرزا کے ایک معروف شاعر اور خواجہ میر دردؔ دہلوی کے ممتاز شاگرد تھے۔ اسی دور کے ایک اور مشہور شاعر حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ دہلوی ان کے حقیقی بھتیجے تھے۔ 'مجموعۂ نغز' کے مولّف حکیم قدرت اللہ قاسمؔ کے بقول فراقؔ افاغنۂ لودھی سے تھے اور ان کے مورثِ اعلیٰ کی والدہ ایک شریف سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔[۱] ایک دوسرے ہم عصر تذکرہ نگار نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرورؔ نے ہدایتؔ اور فراقؔ دونوں کو ''متوطنِ دارالخلافہ شاہ جہان آباد'' لکھا ہے[۲]، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایتؔ کا خاندان کم از کم ایک دو پشت سے ضرور دہلی میں مقیم تھا۔ مصحفیؔ نے 'تذکرۂ ہندی' میں ان کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز بتائی ہے۔[۳] یہ بیان بہ گمانِ غالب تذکرے کے ابتدائی مسودے کے زمانۂ ترتیب یعنی ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی ولادت کا زمانہ ۱۱۴۰ھ/ ۲۸-۱۷۲۷ء کے قریب متعیّن کیا جا سکتا ہے۔

ہدایتؔ کے سوانحِ زندگی کے سلسلے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ ماضی کی سہانی یادوں کے ذکر پر مشتمل ان کے ایک مقطعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پرانے شہر کے محلّہ چورآم میں رہتے تھے، اور انھوں نے اپنے بچپن کا زمانہ اور جوانی کے ایّام اسی محلے کی گلیوں

میں گزارے تھے۔ کہتے ہیں:

ہدایت یا دان کی سانپ کی سی لہر ہے دل پر
کہ تھیں جوں کوچۂ زلفِ بتاں چورآم کی گلیاں

ان کی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا، البتہ کچھ دن اپنے مربی و محسن لالہ سدھ رائے یکدل پیشکار خالصۂ بادشاہی کی معیت میں بنارس اور اودھ (فیض آباد) میں مقیم رہے۔[۴] ان کے یہ دو شعر جو مصحفی نے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں، غالباً غریب الوطنی کے اسی زمانے کی یادگار ہیں:

ہدایت اپنا وطن کس کو خوش نہیں آتا　　پر آہ کیا کرے اب کوئی مرضیِ رب کو
ہزار حیف کہ دلّی ما شہر ویراں کر　　کیا ہے یاروں نے آباد ملکِ پورب کو

قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عارضی طور پر ترکِ وطن کا یہ واقعہ جنوری ۱۷۵۷ء یا مارچ ۱۷۶۱ء میں دارالسلطنت پر احمد شاہ ابدالی کے دو مسلسل حملوں میں سے کسی ایک حملے کے بعد پیش آیا ہوگا۔ کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ میر، سودا اور میر حسن جیسے متعدد اساتذۂ فن اور دوسرے بے شمار اربابِ ہنر اور اہلِ علم دہلی کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے۔ عیار الشعرا کے مؤلف لالہ خوب چند ذکا پرانے شہر میں ہدایت کے ہم محلّہ تھے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ ''ہنگامۂ افاغنۂ ابدالی'' میں ان کا خاندان بہت بری طرح تباہ و برباد ہوا۔ اناث و ذکور میں سے چند افراد جو اپنی ''پامردی'' کی بدولت اس ''مہلکۂ جاں ستاں'' سے صحیح سلامت بچ کر نئے شہر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے، ان میں سے ایک گروہ نے عظیم آباد کا رخ کیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔[۵] ظاہر ہے کہ یہ قیامتِ صغریٰ ہدایت اور ان کے متعلقین کے لیے بھی خانۂ ویرانی کا پیغام لے کر آئی ہوگی۔

قاسم کا بیان ہے کہ میں نے چالیس سال کے عرصے میں ''باوصفِ صحبتِ مستوفی''، کبھی نہیں دیکھا کہ ہدایت کی ذات سے کسی شخص کو تکلیف پہنچی ہو۔[۶] اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلسل چالیس برس تک خلوت و جلوت میں ان کے شریکِ صحبت رہے تھے۔ دستیاب شواہد کی بنا پر ہم نشینی کی اس مدت کو ۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵ء اور ۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۴ء کے

درمیان محدود کیا جاسکتا ہے۔اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ پورب میں چند سال قیام کرنے کے بعد ۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵ء کے قریب وہ دہلی واپس آ گئے تھے۔خاکِ وطن کو دوبارہ آنکھوں سے لگانے کے بعد انھوں نے باقی ماندہ عمر کا بڑا حصہ خواجہ میر درد کے آستانے پر ترک وتوکل اور گوشہ نشینی کے عالم میں گزارا۔قاسم نے ایک جگہ ان کی شخصیت کے امتیاز کو نمایاں کرنے کے لیے ''تجرّد نشاں'' کی ترکیب بہ طورِ صفت استعمال کی ہے،اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ تاعمر مجرّد رہے۔دو معتبر معاصرین خوب چند ذکا اور میر اعظم الدولہ سرور کے بیان کے مطابق ہدایت نے ۱۲۱۹ھ/ ۵-۱۸۰۴ء میں دہلی میں وفات پائی۔۷ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً اسّی سال تھی۔اس کے برخلاف شیفتہ اور عبدالغفور نساخ نے ان کی رحلت کو ۱۲۱۵ھ/ ۱-۱۸۰۰ء کا واقعہ قرار دیا ہے۸ جو یقیناً درست نہیں۔

ہدایت حد درجہ شریف النفس اور نیک طینت انسان تھے۔ان کی خوش اخلاقی اور منکسر المزاجی کی تمام معاصر تذکرہ نگاروں نے تعریف کی ہے۔میر حسن انھیں ''مردِ متواضع وموذّب''، مصحفی ''شخصِ بسیار حلیم وسلیم'' اور نواب اعظم الدولہ سرور ''مردِ متواضع ومتورّع وخلیق'' قرار دیتے ہیں۔۹ قدرت اللہ قاسم نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کے اوصافِ حسنہ کا تذکرہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''وے بزرگ بود درویش دل، بہ خدا مشتغل، سالکِ راہ، خدا آگاہ، مسکیں نہاد، والانژاد، سراسر حلم، سربسر حیا، یکسر مہر، یک قلم وفا، نیک محضر، پاکیزہ سیر، محبت پرور، مروّت گستر، صاف دل، یکرو، صافی طینت، فرخندہ خو، نہ بر دلِ کس از وے غبارے، نہ بہ فخرِ احدے اور اعارے۔قاسمِ ہیچ مداں باوصفِ صحبتِ مستوفی درعرضِ چہل سال تخمیناً گاہے ندیدہ کہ از وے کسے رنجیدہ یا بہ دلِ کس از دستش آزارے رسیدہ۔''۱۰

ہدایت کی افتادِ طبع اور کیفیتِ مزاج کا اندازہ کسی حد تک ان کے ان اشعار سے بھی کیا جاسکتا ہے:

منھ جو پھیرے آشنا سے، اس کو انساں مت سمجھ
رخ کو ٹک معکوس کرکے دیکھ لے ہوتا ہے کیا
نہ کنجِ عزلت میں ہے فراغت، نہ سیرِ گلشن میں ہے حلاوت
جہاں میں گر لطفِ زندگی ہے تو ہے ملاقاتِ دوستداراں

مصحفی نے ہدایت کو ''صاحبِ دیوان'' بتایا ہے۔۱۱ علی ابراہیم خاں خلیل اور ان کے تتبّع میں مرزا کاظم بتلا لکھنوی اور مرزا علی لطف ایک ''دیوانِ مختصر'' کا ذکر کرتے ہیں۔۱۲ نواب اعظم الدولہ سرور کا بیان ہے کہ ''تصانیفِ بسیار مثلِ مثنوی و دیوانِ غزلیات و مراثی وسلام وغیرہ وقصائد موزوں نمودہ۔''۱۳ قاسم نے لکھا ہے کہ

''دیوانے مملو انواعِ سخن نہ ہزار بیت تخمیناً بر صفحۂ روزگار یادگار گذاشتہ و بیروں ازیں مثنویاتِ چند خورد و بزرگ دارد کہ دراں علمِ سخنوری برا فراشتہ و رسالۂ مسمّیٰ بہ چراغِ ہدایت کہ بوے عرفاں ازاں بہ دماغِ صافی طینتاں می رسد، براجزاے چند برنگاشتہ۔''۱۴

میر حسن کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت نے ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بھی لکھی تھی۔۱۵ میر حسن کے علاوہ علی ابراہیم، مرزا علی لطف اور عشقی عظیم آبادی نے بھی اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔۱۶ تقریباً پانچ سو متفرق اور منتشر اشعار کے علاوہ ہدایت کی یہ تمام تصانیف یا تو دستبردِ زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں یا اہلِ نظر کی دسترس سے دور کسی نامعلوم گوشے میں کرم ہاے کتابی کے لیے سامانِ ضیافت فراہم کر رہی ہیں۔

مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر اور خواجہ میر درد جیسے اساتذہ کے مقابلے میں ہدایت دوسرے درجے کے شاعر قرار پاتے ہیں، لیکن ان کی زبان دانی، خوش گوئی اور قادر الکلامی تقریباً تمام تذکرہ نگاروں کے نزدیک مسلّم ہے۔ میر کے بقول ''ریختہ را بہ طرز می گوید..... کمیتِ خامۂ او در عرصۂ میدانِ سخن بال بستہ راہ می رود۔''۱۷ مصحفی کا بیان ہے کہ ''شعر را بسیار بہ فصاحت می گوید۔''۱۸ میر حسن انھیں ''مثل ومحاورہ بند، عالی طبع، دردمند'' اور ''شاعرِ دل پذیر و سخن سنجِ بے نظیر'' قرار دیتے ہیں۔۱۹ نواب اعظم الدولہ سرور

لکھتے ہیں کہ ''درفنِ ریختہ گوئی نہایت ماہر وکلامش مرغوبِ دل ہا۔ شاعرِ مسلّم الثبوت خواند نش بجاست۔ استادِ وقتِ خود بود۔''۲۰ قائمؔ کا بیان ہے کہ ''فصاحتِ کلامش مستغنی البیان است وبلاغتِ سخنش بے پروا از تبیان۔ روزمرۂ زبانِ اردوے معلّٰی کہ بہ دستش افتادہ، بہ کسے کم دست بہم دادہ۔ مہاورۂ (کذا) گفتگوے ریختہ کہ بہ سہمش رسیدہ، درشعرِ احدے ایں احقر ندیدہ''۲۱۔ سوداؔ نے 'قصیدہ درمدحِ نواب سیف الدولہ بہادر' کی تشبیب میں بزمِ شعر کے صدر نشیں کی حیثیت سے اپنے بعض نامور معاصرین کے ساتھ ہدایتؔ کا بھی نام لیا ہے، جو ان کی فنکارانہ عظمت کے اعتراف کی دلیل ہے۔ کہتے ہیں:

داغ ہوں ان سے اب زمانے میں　　شعراؤں میں ہیں جو صدر نشیں
یعنی سوداؔ و میرؔ و قائمؔ و دردؔ　　لے ہدایتؔ سے تا کلیمؔ و یقیںؔ

ہدایتؔ کو خود بھی اپنے کلام کی مقبولیت اور شعر گوئی میں اپنی سلیقہ مندی کا بہ خوبی احساس تھا۔ ایک غزل کے آخری دو شعروں میں خود ستائی اور انکسار کے ملے جلے انداز میں انھوں نے اپنے اس احساس کو اس طرح الفاظ کا قالب عطا کیا ہے:

اے ہدایتؔ جو سخن فہم ہیں ان کے نزدیک　　میر و مرزا کا جہاں ذکر ہے، وہاں ہم بھی ہیں
شعر کہنے کا سلیقہ جو کہو سو معلوم　　ہاں مگر کہنے کو استادِ زماں ہم بھی ہیں

ایک دوسری غزل کے مقطعے میں اپنی ریختہ گوئی کے خوش آیند اثرات پر یوں اظہارِ فخر کرتے ہیں:

ہدایتؔ کہا ریختہ جب سے ہم نے　　رواج اٹھ گیا ہند سے فارسی کا

ہدایتؔ کے تلامذہ میں چند غیر معروف شعرا کے علاوہ قائمؔ چاند پوری، حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، حکیم قدرت اللہ قاسمؔ اور مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان طپشؔ جیسے نامور فنکار بھی شامل ہیں، جو کسی نہ کسی اعتبار سے اردو زبان وادب کی تاریخ میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ قائمؔ چاند پوری نے قاسمؔ کے بیان کے مطابق مشقِ سخن کے ابتدائی دور میں کچھ دنوں تک ہدایتؔ سے استفادہ کیا تھا۔۲۲ اس کے بعد انھوں نے براہِ راست خواجہ میرؔ درد سے توسّل پیدا کرلیا اور ہدایتؔ سے اس حد تک منحرف ہوگئے کہ ان کے

خلاف ایک ہجو یہ قطعہ کہہ دیا جو درج ذیل ہے:

حضرتِ دردؔ کی خدمت میں جب آ قائمؔ نے — عرض کی یہ کہ اے استادِ زماں سنتے ہو
امر ہووے تو ہدایتؔ کو کروں میں سیدھا — واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کبھو کج طینت — تیر بنتی بھی کہیں شاخِ کماں سنتے ہو ۲۳

ہدایتؔ بھی ''بہ مقتضائے بشری'' قائمؔ کی ''بے سعادتی'' کے اس مظاہرے کو خاموشی کے ساتھ برداشت نہ کر سکے، چنانچہ یہ دو اشعار ان کی جانب سے جوابی کارروائی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں:

چشمِ انصاف سے دیکھو تو میاں قائمؔ تم — چاہیے یوں کہ ہدایتؔ کو اب استاد کرو
اور جو کچھ شاعری کا دل میں تمھارے ہو گھمنڈ — کہہ چکے ہم تو غزل، بارے تم ارشاد کرو ۲۴

حریفانِ حرف گیر کے جواب میں ہدایتؔ کے یہاں ایک قطعہ بھی ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں بھی روئے سخن قائمؔ ہی کی طرف ہو۔ کہتے ہیں:

اے ہدایتؔ نہیں کچھ اس کو سخن سے بہرہ — شعر پر میرے جو کوئی کہ سخن رکھتا ہے
لب و لہجے کو پہنچتا ہے کوئی بلبل کے — گو کہ منقار ہر اک زاغ و زغن رکھتا ہے

مختلف تذکروں کی وساطت سے ہدایتؔ کا جو کلام ہم تک پہنچا ہے، وہ صرف مختلف غزلوں کے منتخب اشعار اور چند رباعیوں تک محدود ہے۔ آئندہ سطور میں ان کی 'مثنوی در تعریف بنارس' کے انتالیس اشعار ایک قدیم بیاض کے حوالے سے پہلی بار ہدیۂ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔ یہ بیاض جو راقم السطور کو بنارس میں دستیاب ہوئی ہے، ۲۵×۱۷ سینٹی میٹر سائز کے دو سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ہدایتؔ کے ان اشعار کے علاوہ از اول تا آخر شعرائے فارسی کا پسندیدہ کلام نقل کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تذکرہ نویسی کی روایات کے مطابق اشعار سے قبل شعرا کے حالات بھی قلم بند کر دیے گئے ہیں۔ مرتبِ بیاض 'سفینۂ خوش گو' (مرتبہ مابین ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء و ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء) کے مولّف رائے بندرابن داس خوشؔ گو (متوفّی مابین ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء و ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء) کا معاصر و معتقد اور بہ ظاہر بنارس کے کسی ذی علم اور صاحبِ ذوق ہندو گھرانے سے متعلق معلوم ہوتا

ہے۔ ہدایتؔ کی مثنوی کے یہ اشعار 'منتخبِ مثنویِ ہدایتؔ در تعریف بنارس' کے زیرِ عنوان بیاض کے اکیسویں اور بائیسویں صفحے پر منقول ہیں۔ ان اشعار کے اندراج سے قبل آٹھویں صفحے پر گلاب راے نامی کسی شخص کی تاریخِ وفات ''میناے گلاب را کہ بشکست'' مرقوم ہے، جس سے ۱۱۷۲ھ (۵۹-۱۷۵۸ء) برآمد ہوتا ہے۔ اسی صفحے پر میر الٰہی کے اشعار عنوان میں ''بہ سندِ شیخ صاحب سلمہٗ'' کے اضافے کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں۔ گیارھویں اور بارھویں صفحے پر شیخِ موصوف کے متفرق اشعار ''حزیںؔ صاحب مدظلہٗ العالی'' اور ''ولہٗ شیخ صاحب مدظلہّٗ'' کی سرخیوں کے ساتھ منقول ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۲۹ سے دوبارہ ''انتخابِ حزیں'' کا آغاز ہوتا ہے جو چھے صفحات کو محیط ہے۔ اس انتخاب کے ضمن میں دو جگہ ''من الرباعیاتِ شیخ صاحب سلّمہٗ'' اور ''من مثنویِ شیخ صاحب مدظلہّٗ'' کی ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیاض میں 'مثنویِ ہدایت' کے یہ اشعار گلاب راے کی وفات کے بعد اور شیخ علی حزیںؔ کے انتقال سے قبل یعنی ۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۸ء اور جمادی الاولیٰ ۱۱۸۰ھ/نومبر ۱۷٦٦ء کے درمیان نقل کیے گئے ہیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق اس مثنوی کی تصنیف کا زمانہ بھی انھی دونوں سنین کے درمیان محدود ہے۔ مثنوی کے بعض اشعار بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ حزیںؔ کی زندگی میں کہی گئی ہے۔

پیشِ نظر بیاض کے کاتب نے اس مثنوی کے اشعار نقل کرنے میں اپنے عہد کی عام روشِ تحریر کے مطابق یاے معروف و یاے مجہول، کاف اور گاف، دال اور ڈال اور اسی قبیل کے دوسرے ہم شکل حروف کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ اسی طرح دو لفظوں کو ملا کر لکھنے کی بھی کئی مثالیں اس کے ہاں موجود ہیں۔ ہم نے ایسے مقامات پر بالعموم قدیم املا کو جدید املا سے بدل دیا ہے، البتہ جہاں کسی لفظ کا املا اس کے تلفّظ کے ساتھ مربوط ہے، وہاں اسے علیٰ حالہٖ برقرار رکھا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب مثنوی کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

الٰہی تو ہر شے کا مختار ہے — یہ قدرت تجھی کو سزاوار ہے
کہ ہر ملک و بستی کا مالک ہے توں — نہ بستی کہ ہستی کا مالک ہے توں

تجھی سے ہے آباد شہر و دیار　　ترے ہاتھ ہے سبھ[۲۵] خزاں و بہار
تو مالک ہے گنجینۂ حسن کا　　تو ہی بام ہے زینۂ حسن کا

در تعریف شیخ صاحب

نہ ہو کیوں نہ[۲۶] سرسبز وہ سرزمیں　　جہاں ہو محمد علیؔ حزیںؔ
زمیں شعر کی اس سے[۲۷] آباد ہے　　کہ ہر علم میں اب وہ استاد ہے
نہیں اس کو پرواہِ شاہ و وزیر　　بہ ظاہر امیر و بہ باطن فقیر
غنیمت ہے وہ پیرِ دیرینہ سال　　کہاں پیدا ہوتے ہیں صاحب کمال
خدا اس کو جگ میں سلامت رکھے　　سلامت اسے تا قیامت رکھے

تعریف شہر

بنارس بھی دیکھا عجب شہر ہے　　کہ ہر ناگری یہاں کوئی قہر ہے
نزاکت میں ہر ایک جیوں پدمنی　　کہوں ناگری اس کو یا ناگنی
کریں کیوں نہ عشّاق جی کو فدا　　ہے معشوق ہر ایک کافر ادا
کہاں پاوے یہ روپ حسنِ فرنگ　　کہ کنچن سا ہر ایک کا دمکے ہے رنگ
پر از زیور و زر ہے ہر مرد و زن　　کہ سونے میں لپ سب رہا ہے بدن
کوئی حسن کا گر خریدار ہے　　تو اس جنس کا گرم بازار ہے
پر از دُر ہے وہ، اس کی کیا بات ہے　　نہیں مانگ، تاروں بھری رات ہے
غرض ان کی گر مانگ دیکھے کوئی　　دل اپنے کو پھر مانگ دیکھے کوئی
ہے چینِ جبیں، موجِ آبِ حیات　　دو لب ہائے شیریں دو کانِ نبات
کسے ان کی آنکھوں سے ہے ہم سری　　کہ نرگس کرے وھاں کنیزک گری
وہ کیفیّت آنکھوں سے ہے جلوہ گر　　کہ موتی بھریں ہیں گویا کوٹ کر
اگر ان کے مکھڑے کو دیکھے بہار　　زرِ گل کرے فصلِ گل سب نثار
میں اب وصفِ بینی کروں کیا بیاں　　کہ وہ حسن کی فوج کا ہے نشاں
وہ عارض کہ یک تختۂ لالہ زار　　نہ عارض کہ صد رشکِ باغ و بہار

وہ خالِ سیہ ہے زنخداں کے بیچ
ہوئے جیسے بلبل گلستاں کے بیچ

کہوں کیا لطافت بر و دوش کی
کہ طاقت کسے ہے ہم آغوش کی

چہ پستاں کہ طاؤسِ صحرائے حسن
دو مرغابیِ آبِ دریائے حسن

ہر یک گلشنِ ۲۸ حسن کا نونہال
لگے ہاتھ جس کے سو ہی ہے نہال

وہ عالم ہے ہر صفحۂ سینہ کا
گویا ایک تختہ ہے آئینہ کا

اگر دیکھے کوئی ان کا انگشتِ پائے
سرِ دہر پر مارے وہ پشتِ پائے

کوئی کچھ کہو، مجھ کو باور نہیں
وہ عاشق کا خوں ہے مہاور نہیں ۲۹

لٹکتے ہیں کانوں میں یوں جھومکے
ستارے رہے ۳۰ جس طرح جھوم کے

نہیں پانو ۳۱ میں ان کے بھاری کڑے
پڑے حسن کے پانو میں پیکڑے

کم از ہفت منزل کوئی گھر نہیں
کہ ہفت آسماں سے وہ کمتر نہیں

عمارات از بس کہ یھاں ہے ۳۲ بہم
نہیں کچھ فرنگی صندوقچے سے کم

یہ بستی نہیں، کان ہے حسن کی
غرض کیا کہوں، جان ہے حسن کی

وہ برّاق ہیں لڈوے موتی چور
کہ موتی بھریں ہیں گویا کوٹ کوٹ ۳۳

نہ شیرینی ہے ایک تحفہ یہاں
غرض چیز ہے جو، سو طرفہ یہاں

وہ گنگا کہ آب اس کا شفّاف ہے
مثال آئنہ کے نپٹ صاف ہے

جب آوے ہے برسات میں باڑھ پر
دمِ تیغ سیں پھر ہے وہ تیز تر

حواشی

۱ مجموعۂ نغز، مرتبہ حافظ محمود شیرانی، شائع کردہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۳۳ء، جلد دوم، ص ۴۹

۲ عمدۂ منتخبہ، مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، شائع کردہ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ۴۵۹ و ۸۱۳

۳ تذکرۂ ہندی، شائع کردہ انجمن ترقیِ اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۲۷۱

۴ تذکرۂ شعرائے اردو، طبعِ ثانی، شائع کردہ انجمن ترقیِ اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۱۹۶

۵ مجموعۂ نغز، جلدِ اول، ص ۱۶۰

۶ مجموعۂ نغز، جلدِ دوم، ص ۳۱۷

۷ عیار الشعرا، مخطوطہ کتب خانۂ انجمن ترقیِ اردو (ہند)، ورق ۳۸۳ ب و عمدۂ منتخبہ، ص ۸۱۳

۸ گلشنِ بے خار، مطبوعہ مطبعِ نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۰ء، ص ۲۴۰ و سخنِ شعرا، مطبوعہ مطبعِ نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۶۰ء، ص ۵۶۰

۹ تذکرۂ شعرائے اردو، طبعِ ثانی، ص ۱۹۶، تذکرۂ ہندی، ص ۲۷۱ و عمدہ منتخبہ، ص ۸۱۳

۱۰ مجموعۂ نغز، جلدِ دوم، ص ۳۱۷

۱۱ تذکرۂ ہندی، ص ۲۷۱

۱۲ گلزارِ ابراہیم، مخطوطہ رضا لائبریری رام پور، ورق ۳۰۳ الف، گلشنِ سخن، مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، شائع کردہ انجمن ترقیِ اردو (ہند)، علی

گڑھ، ۱۹۶۵ء، ص۲۵۹ وگلشنِ ہند، مطبوعہ رفاہِ عام پریس، لاہور، ۱۹۰۶ء، ص۲۵۴

۱۳؎ عمدۂ منتخبہ، ص۸۱۳

۱۴؎ مجموعۂ نغز، جلدِ دوم، ص۳۱۸

۱۵؎ تذکرۂ شعرائے اردو، طبعِ ثانی، ص۱۹۶

۱۶؎ گلزارِ ابراہیم، مخطوطہ رام پور، ورق ۳۰۳ الف، گلشنِ ہند، ص۲۵۴ وتذکرۂ عشقی، دوتذکرے، جلدِ دوم، مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد، مطبوعہ لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۶۳ء، ص۳۲۳

۱۷؎ نکات الشعرا، طبعِ ثانی، مرتبہ مولوی عبدالحق، شائع کردہ انجمن ترقیِ اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ص۱۳۰ و۱۳۱

۱۸؎ تذکرۂ ہندی، ص۲۷۱

۱۹؎ تذکرۂ شعرائے اردو، طبعِ ثانی، ص۱۹۶

۲۰؎ عمدۂ منتخبہ، ص۸۱۳

۲۱؎ مجموعۂ نغز، جلدِ دوم، ص۳۱۸

۲۲؎ مجموعۂ نغز، جلدِ دوم، ص۸۲

۲۳؎ مجموعۂ نغز میں کلیاتِ قائم مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن، جلدِ اول، ص۱۷۱ کی اس روایت کے برخلاف قطعے کا پہلا شعر یہ ہے:

شاعری کا اسے آیا ہے بہت سا غرّا　　جو یہ کہتا ہے وہ، استادِ زماں سنتے ہو

دونوں صورتوں میں یہ قطعہ قائمؔ اور ہدایتؔ کے درمیان کسی خاص وجہ نزاع کی طرف رہنمائی نہیں کرتا۔ بہ ظاہر اس سے یہ مترشّح ہوتا ہے کہ قاسمؔ کے بیان کے برخلاف ہدایتؔ خواجہ میر دردؔ کی شان میں کسی بے ادبی کے مرتکب ہوئے تھے جو قائمؔ کے لیے ناقابلِ برداشت تھی لیکن اس قیاس کی تائید میں کوئی قوی دلیل موجود نہیں۔ ہدایتؔ نے بھی قائمؔ کی اس غزل کی زمین میں جس میں یہ قطعہ شامل ہے، ایک غزل کہی تھی، جس کے یہ دو شعر قاسمؔ

نے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں:

تم نہ فریاد کسی کی نہ فغاں سنتے ہو　　اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو، جہاں سنتے ہو
سرکشی سے تو میاں بادہ کشی بہتر ہے　　یہ جو فرماتے ہیں کچھ پیرِ مغاں، سنتے ہو

ممکن ہے کہ ان اشعار کے مخاطَب قائمؔ ہی ہوں یا بعد کے کسی شعر میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہو جس کی جواب دہی کے لیے قائمؔ کو سامنے آنا پڑا لیکن یہ محض قیاسات ہیں جن کی تصدیق و توثیق کا اب کوئی ذریعہ موجود نہیں۔

۲۴ اس زمین میں ایک غزل قائمؔ کے دیوان میں بھی موجود ہے۔ قرینِ قیاس ہے کہ یہ ہدایتؔ کے ان اشعار ہی کی تحریک کا نتیجہ ہو، لیکن اس غزل کے کسی شعر میں تحدّی، تضحیک یا تعلّی کا کوئی پہلو موجود نہیں۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ دیوان میں اسے ہجویہ قطعے والی غزل کے فوراً بعد نقل کیا گیا ہے۔ (کلیاتِ قائمؔ، جلدِ اول، ص ۱۷۲)

۲۵ کذا = سب

۲۶ کذا۔ یہ مصرع اصل میں غالباً اس طرح ہوگا:

نہ ہو کیونکہ سرسبز وہ سر زمیں　　یا　　ہوئے کیوں نہ سرسبز وہ سر زمیں

۲۷ اصل = اوسے

۲۸ اصل = گلشنے

۲۹ شورشؔ عظیم آبادی نے یہ شعر میر محمد حسین یادؔ مرشد آبادی سے منسوب کیا ہے۔ (دو تذکرے، جلد ۲، ص ۲۳۸) پیشِ نظر شہادت کی بنا پر یہ انتساب حتماً خلافِ واقعہ ہے۔

۳۰ یہ مصرع 'رہے' کی بجائے 'رہیں' کا طالب ہے۔

۳۱ کاتبِ بیاض نے اس لفظ کا یہی املا لکھا ہے۔

۳۲ شعر نمبر ۳۱ کے مصرعِ ثانی کی طرح اس مصرعے میں بھی 'عمارات' کی مناسبت سے 'ہے' کی جگہ 'ہیں' ہونا چاہیے۔

۳۳ یہاں کاتب نے غالباً بربنائے سہو بیسویں شعر کا مصرعِ ثانی معمولی سے فرق کے ساتھ دوبارہ نقل کر دیا ہے۔ اگر ہمارے قیاس کے برخلاف یہ پورا مصرع سہوِ کتابت پر مبنی نہیں، تب بھی کم از کم اس کے آخری دو لفظوں (کوٹ کوٹ) کے نقل کرنے میں ضرور غلطی ہوئی ہے۔ ان دونوں لفظوں کو ''کر کے چور'' سے بدل کر مصرعے کے فنی و معنوی سقم کو دور کیا جا سکتا ہے۔

(ماہ نامہ 'آج کل' نئی دہلی، شمارہ اپریل ۱۹۷۹ء)

منظوماتِ آگاہ کے نثری دیباچے

محمد باقر آگاہ جنوبی ہند کے مشاہیر اہل علم میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا آبائی وطن بیجاپور تھا لیکن ان کے والد مولوی محمد مرتضیٰ[۱] نے ان کی ولادت سے قبل ہی بیجاپور سے ترکِ سکونت کر کے مدراس کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے ایلور (بہ فتح لام وضمِ واؤ) میں بودوباش اختیار کر لی تھی۔[۲] اسی جگہ ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء میں آگاہ کی ولادت ہوئی۔[۳] تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل انھوں نے اپنے چچا کے سایۂ عاطفت میں طے کیے۔ اس کے بعد شاہ ابوالحسن قربی بیجاپوری (۱۱۱۷ھ/ ۱۷۰۵ء تا ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۷ء) سے جو اپنے زمانے کے ایک جیّد عالم اور صوفی بزرگ تھے، علوم ظاہری و باطنی میں استفادہ کیا اور ترچناپلّی کے مشہور وممتاز عالم مولوی ولی اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے علومِ ظاہری کی تکمیل کی۔ اپنے ان اساتذہ میں آگاہ سب سے زیادہ شاہ ابوالحسن قربی سے متاثر ہوئے۔ ان کے فیضانِ صحبت سے اگر ایک طرف ان پر حقیقت ومعرفت کے اسرار روشن ہوئے تو دوسری طرف علوم وفنون اور شعروادب سے ان کی فطری دلچسپیوں کو توانائی اور فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے بہ قولِ خود پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ علمی وادبی انہماک اور تصنیفی وتالیفی شغف بھی بالیدگی کی منزلیں طے کرتا رہا، یہاں تک کہ ان کے

کارناموں کی شہرت اقصاے دکن میں ہر طرف پھیل گئی اور جلد ہی علمی حلقوں میں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے انھیں نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہوگیا۔ نواب والا جاہ والیِ کرناٹک نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہوکر انھیں اپنے بیٹوں امیر الامرا اور عمدۃ الامرا کا اتالیق مقرر کیا اور مددِ معاش کے طور پر ایک گانو ان کے نام کردیا۔ بعد میں نواب صاحب موصوف نے اپنے دبیرِ خاص (پرائیویٹ سکریٹری) کے فرائض بھی ان کے سپرد کردیے تھے۔ نواب صاحب کی وفات (۱۲۱۰ھ/۹۶-۱۷۹۵ء) کے بعد آگاہ غالباً مدراس چلے آئے، جہاں باسٹھ سال کی عمر میں شبِ پنجشنبہ، ۱۴؍ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ (۶؍مارچ ۱۸۰۶ء) کو ان کی وفات ہوئی۔[۴] سالِ رحلت محمد غوث شرف الملک کے مستخرجہ مادۂ تاریخ ''قَد مَاتَ فَرُدُ العَصر'' سے برآمد ہوتا ہے۔

آگاہ کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے، لیکن ان میں غالب تعداد عربی وفارسی تصنیفات کی ہے۔ اردو میں انھوں نے جو سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے، وہ چھوٹی بڑی پندرہ کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ تمام کتابیں نظم میں ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض پر نثر میں مبسوط دیباچے لکھ کر انھوں نے نثر نگار کی حیثیت سے بھی تاریخِ ادب میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ یہ دیباچے جن کتابوں پر لکھے گئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ہشت بہشت: یہ مثنوی کی ہیئت میں لکھے ہوئے آٹھ رسالوں کا مجموعہ ہے، جن میں رسول اللہ کی شخصیت اور حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہے۔ پہلے چھے رسائل ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۸۵ھ (۷۲-۱۷۷۰ء) میں اور آخری دو رسالے ۱۲۰۶ھ (۹۲-۱۷۹۱ء) میں نظم کیے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) میں مطبعِ عزیزیہ اور مطبعِ مخزن الانوار (مدراس) کے اشتراک سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں آگاہ کے نواسے سید احمد کے زیر اہتمام مطبعِ کشن راج، مدراس سے شائع ہوا۔[۵] ان دو ایڈیشنوں کے علاوہ اس مجموعے اور اس میں شامل رسالوں کے متعدد قلمی نسخے انجمن ترقیِ اردو، پاکستان اور حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

(۲) تحفۃ الاحباب: اس مثنوی میں خلفاے راشدین اور دیگر صحابۂ کرام کے

فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ حیدرآباد کے کتب خانۂ آصفیہ اور سرسالار جنگ میوزیم میں اس کے کئی مخطوطات دستیاب ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس کا سالِ تصنیف ۱۲۰۶ھ (۹۲-۱۷۹۱ء) بتایا ہے۔[۶]

(۳) ریاض الجنان: یہ مثنوی جس میں بہ قولِ مصنف تین ہزار ننانوے (۳۰۹۹) اشعار ہیں، اہلِ بیت کے فضائل ومناقب کے بیان پر مشتمل ہے۔ سالِ تصنیف ۱۲۰۷ھ (۹۳-۱۷۹۲ء) ہے جو ایک بیت میں اس طرح نظم کیا گیا ہے:

جب تھے بارہ سو اور سات برس تب بنا ہے یہ نسخۂ اقدس

اس مثنوی کے متعدد قلمی نسخے حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ دو قلمی نسخے انجمن ترقیِ اردو، پاکستان کے کتب خانے میں اور ایک نسخہ انجمن ترقیِ اردو، ہند کی لائبریری میں موجود ہے۔

(۴) محبوب القلوب: یہ تقریباً تین ہزار آٹھ سو اشعار کی ایک طویل مثنوی ہے، جس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالاتِ زندگی اور فضائل وکرامات کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ سالِ تصنیف ۱۲۰۷ھ (۹۳-۱۷۹۲ء) ہے[۷] جیسا کہ مندرجہ ذیل بیت سے ظاہر ہے:

تھے ہفتم سال بارہ سو اوپر جب بہ فالِ خوش ہوا ہے یہ مرتّب

'محبوب القلوب' کے پانچ قلمی نسخے کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد میں، دو نسخے انجمن ترقیِ اردو، پاکستان کے کتب خانے میں، ایک نسخۂ انجمن ترقیِ اردو، ہند کی لائبریری میں اور غالباً ایک ایک نسخہ سالار جنگ میوزیم، جامعۂ عثمانیہ اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ذخائرِ مخطوطات میں محفوظ ہے۔

(۵) فرائد درفوائد: اس منظوم رسالے میں قرآنِ مجید کی شانِ نزول، اس کے فضائل وبرکات، سورتوں کی تعداد، وحی کے اقسام وکیفیات اور دوسرے متعلقہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی تکمیل ماہِ رمضان ۱۲۱۰ھ/ (مارچ، اپریل ۱۷۹۶ء) میں ہوئی تھی جیسا کہ اس بیت سے ظاہر ہے:

تھے بارہ سو پہ جب دس اے گرامی　　بہ شہر صوم پایا ہے تمامی

یہ رسالہ ۱۳۰۶ھ میں مطبع رضوی بنگلور سے شائع ہو چکا ہے۔۹ حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں میں موجود متعدد قلمی نسخوں کے علاوہ اس کا ایک مخطوطہ انجمن ترقیِ اردو، پاکستان کی لائبریری میں بھی محفوظ ہے۔

(۶) گلزارِ عشق: اس مثنوی میں رضوان شاہ وروح افزا کی داستان نظم کی گئی ہے۔۱۰ آگاہ کے بیان کے مطابق اس کی تکمیل ۱۲۱۱ھ (۹۷-۱۷۹۶ء) میں ہوئی تھی۔ اس مثنوی کے دو قلمی نسخے انجمن ترقیِ اردو، پاکستان کے کتب خانے میں۱۱ اور ایک مخطوطہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں محفوظ ہے۔۱۲

(۷) دیوانِ اردو: یہ آگاہ کے متفرق اردو کلام کا مجموعہ ہے اور نصیرالدین ہاشمی کے بہ قول خاصا ضخیم ہے۔۱۳ حیدرآباد میں ہاشمی صاحب کے بعض اعزہ کے کتب خانوں میں اس کی نقلیں موجود ہیں۔ زمانۂ ترتیب متعین نہیں۔

(۸) خمسۂ متحیرہ: یہ پانچ مثنویوں کا مجموعہ ہے جو بہ قولِ مصنّف ''مطالعِ انوارِ نازو نیاز اور معارجِ اسرارِ سوز وساز'' ہیں۔ ان مثنویوں کے نام صحِ بہارِ عشق۱۴، ندرتِ عشق، غرقابِ عشق، حیرتِ عشق اور حسرتِ عشق ہیں۔ 'صحِ بہارِ عشق' ۱۲۱۲ھ/ ۹۸-۱۷۹۷ء میں (تاریخِ تصنیف۔ شرارہ عشق کا ہے)، 'ندرتِ عشق' ۱۲۱۴ھ/ ۸۰-۱۷۹۹ء میں (عجب ہے ندرتِ عشق) اور 'غرقابِ عشق' ۱۲۱۵ھ/ ۱-۱۸۰۰ء میں (کیا ہے حسن وعشق کے دریا کا جوش) مکمّل ہوئی ہے۔ باقی دو مثنویاں بھی اسی زمانے کی تصنیف معلوم ہوتی ہیں۔

اس مجموعے کا ایک مکمل خطی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ انجمن ترقیِ اردو، ہند اور انجمن ترقیِ اردو، پاکستان کے کتب خانوں میں بھی متذکرہ مثنویات میں سے بعض کے مخطوطات موجود ہیں۔

باقر آگاہ کی مادری زبان دکنی تھی، لیکن وہ اردوے معلّٰی کے روزمرہ اور محاورے سے بھی کماحقّہٗ واقف تھے اور ان دونوں میں نثر ونظم پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ مثنوی گلزارِ عشق میں ایک جگہ کہتے ہیں:

ہے دکھنی میں مجھ کو مہارت یتی کہ ''اَلنَّصرُ مِنکُم'' کہے نصرتی
گر اردو کے بھاکے میں کھولوں زباں تو سوداؔ کا سب سود ہووے زیاں

یہ دعویٰ محض شاعرانہ تعلّی نہیں، انھوں نے موقع ومحل کی مناسبت سے حسبِ ضرورت زبان کے ان دونوں ہی اسالیب سے کام لے کر اپنی اس مہارت کا عملی ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ چنانچہ مذہبی موضوعات سے متعلق ان کی جس قدر تصانیف ہیں، ان میں انھوں نے محض اس بنا پر کہ ان کا بنیادی مقصد کم علم عوام اور عورتوں کو ضروری اور مفید معلومات فراہم کرنا ہے، خصوصیت کے ساتھ دکن کی عوامی اور روزانہ کاروبارِ زندگی میں کام آنے والی زبان استعمال کی ہے۔ 'ہشت بہشت' کے دیباچے میں اس تخصیص کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بعض علمائے متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں، تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں، ان سے فائدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور تمام اُمّیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں، اس لیے یہ عاصی مطلب قسمِ اول کا بہت اختصار کے ساتھ لے کر دکھنی رسالوں میں بولا ہے۔''

(مدراس میں اردو، طبعِ اول، ص ۳۸)

آگے چل کر اس مقصد کو نظم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

دکھنی میں کہا ہوں اس لیے میں تا ہوئے سمج عوام کے تئیں
تا سربسر اُمّیاں ہور عورات پڑنے ستی اس کے پاویں لذّات

ان رسالوں کے برخلاف دیوانِ اردو، مثنوی گلزارِ عشق اور خمسۂ متحیّرہ کی مثنویات اور زیر بحث نثری دیباچوں میں آگاہ نے بالالتزام زبانِ دہلوی یا شمالی ہند کی معیاری اردو کے اتباع کی کوشش کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس زبان کے بعض مسلمہ اصولوں سے انحراف بھی کیا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان کے آبا واجداد بیجاپور کے رہنے والے تھے اور ان کے گھر میں کئی پشت سے دکنی بولی جارہی تھی، اس لیے اپنی تحریروں کو

اس کے اثرات سے یکسر محفوظ رکھنا ان کے لیے عملاً ممکن نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ انھیں دکنی کی بعض خصوصیات عزیز تھیں، جنھیں وہ لسانی ضابطوں کی قربان گاہ پر چڑھا دینا قطعاً غیر ضروری خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ انھوں نے اپنی زبان کو خصوصیت کے ساتھ صرف اردو کی بجائے ''قریبِ روز مرۂ اردو'' کہا ہے۔ 'گلزارِ عشق' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''الحال کہ تاریخ ہجرتِ باجاہ وجلال کے یک ہزار دوسو پر گیارواں سال ہے، قصہ رضوان شاہ وروح افزا کا پسند کر کر اسے نظم کیا۔ جب زبانِ قدیم دکھنی.....اس عصر میں رائج نہیں ہے، اوسے چھوڑ دیا اور محاورۂ صاف وشستہ کو کہ قریب روز مرۂ اردو کے ہے، اختیار کیا۔ صرف اس بھاکے (اردو) میں کہنے سے دو چیز مانع ہوئی۔ اول یہ کہ تاشیر وطن یعنی دکن اس میں باقی رہے، کیا واسطے کہ اجدادِ پدری ومادری اس عاصی کے اور سب قوم اس کی بیجاپوری ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض اوضاع اس محاورہ کے میرے دل میں بھاتے نہیں۔ ازآں جملہ یہ کہ تذکیر وتانیثِ فعل نزدیک اہلِ دکن کے تابعِ فاعل ہے۔ اگر یہ مذکّر ہے تو وہ بھی مذکّر ہے اور اگر مؤنّث ہے تو مؤنّث۔ یہ قاعدہ موافق قاعدۂ عربی کے ہے کہ سیدِ السنہ ہے اور قیاسِ صحیح بھی اس کی تائید کرتا ہے، برخلاف محاورۂ اردو کے کہ اس میں نسبت فعل کی مفعول کی طرف کر مذکّر کو مؤنّث اور مؤنّث کو مذکّر کرتے ہیں۔''

(مدراس میں اردو، ص ۴۹ و ۵۰)

یہاں آگاہ نے اپنے لسانی مختارات کے جواز اور اسلوبِ نگارش کی صورت گری میں جن عوامل اور اثرات کی کارفرمائی کا ذکر کیا ہے، ان سے ان کی نثر بہت کم متاثر ہوئی ہے۔ عام طور پر ان کی عبارت بامحاورہ اور نہایت شگفتہ اور سلیس ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس کی سلاست اور دل کشی میں اس سادہ و پرکار اسلوب کی ایک ہلکی سی جھلک

نظر آجاتی ہے جوان کے بعد میر امن نے اختیار کیا اور جس کی بدولت 'باغ و بہار' کو حیاتِ جاوید حاصل ہوئی۔ 'محبوب القلوب' کے دیباچے کا درجِ ذیل اقتباس اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی سیرت اور سوانح سے متعلق بعض کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''یہ سب کتاباں عربی ہیں اور سوائے اون کے اور کتاباں بھی اس جناب کے مناقب میں مرقوم ہوئی ہیں۔ لیکن ان سب کتابوں میں بہجۃ الاسرار نہایت دلکش و دلکشا اور طرب انگیز اور جاں فزا ہے۔ الفاظ و معانی اوس کے جانِ فصاحت اور بلاغت اور مضامینِ دلنشیں اوس کے لبالبِ محبت اور مودت ہیں۔ ہر حرف سے اوس کے جوشش عشق کی ٹپکتی ہے اور رنگینی اوس کی وجد میں لاتی ہے۔ غرض اس باب میں عجب نسخۂ نفیس و نادر اور اول سے آخر تک لبریزِ جواہر ہے۔''

(مخطوطۂ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو ہند، ورق ۲-الف)

یہ دیباچے صرف اسی حیثیت سے اہم نہیں کہ ان سے اردو نثر کے سرمائے اور اس کے اسالیب کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے، اس لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہیں کہ ان میں جو مسائل اور موضوعات زیر بحث آئے ہیں، وہ بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'گلزارِ عشق' کے دیباچے میں آگاہ نے ایک جگہ دکنی کے زوال کے اسباب، اردو زبان کی تشکیل، اس کے لسانیاتی ارتقا اور دائرۂ اثر کی وسعت پذیری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اردو میں اردو زبان کے متعلق یہ اپنی نوعیت کی اولین بحث ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اکثر جاہلانِ بے معنی اور ہرزہ درایانِ لایعنی زبانِ دکھنی پر اعتراض اور گلشنِ عشق و علی نامہ کے پڑھنے سے اعراض کرتے ہیں اور جہلِ مرکّب سے نہیں جانتے کہ جب لگ ریاست سلاطینِ دکن کی قایم

تھی، زبان اون کی درمیان اون کے خوب رائج اور طعن (و) شماتت سے سالم تھی۔ اکثر شعراوہاں کے.....اپنی زبان میں قصائدوغزلیات ومثنویات ومقطعات نظم کیے، اورداد سخنوری کا دیے، لیکن نصرتی ملک الشعرا اور تنگ نظری سے مبرّا ہے۔ جب شاہانِ ہنداس گلزارِ جنت نظیر کوتسخیر کیے، طرزِ روزمرۂ دکنی نہج محاورۂ ہندی سے تبدیل پانے لگی، تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی اور ہندوستان میں مدت لگ زبانِ ہندی کہ اوسے برج بھا کا بولتے ہیں، رواج رکھتی تھی۔ اگر چہ لغتِ سنسکرت ان کی اصلِ اصول اورمخزنِ فنونِ فروع واصول ہے، پیچھے محاورۂ برج میں الفاظِ عربی وفارسی تبدریج داخل ہونے لگے اوراسلوبِ خاص کواوس کے کھونے لگے۔ سبب سے اس آمیزش کے یہ زباں ریختہ سے مسمیٰ ہوئی۔ جیسا ثنائی وظہوری نظم ونثرفارسی میں بانی طرزِ جدید کے ہوئے ہیں، ولی گجراتی غزلِ ریختہ کی ایجادمیں سبھوں کا مبتدا اور اوستاد ہے۔ بعداوس کے جوسخن سنجانِ ہند بروز کیے، بے شبہ اس نہج کو اوس سے لیے اور من بعد اس کو با سلوبِ خاص مخصوص کر دیے اوراسے اردو کے بھاکے سے موسوم کیے۔ اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کے جیسا شاہ جہان آباد، لکھنؤ واکبر آباد وغیرہ رواج پایا اورجوں چاہیے، سبھوں کے من بھایا۔''

(مدراس میں اردو، ص ۴۶ و ۴۷)

ان دیباچوں سے آگاہ کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں بھی بعض اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ہر جگہ اپنے نام کے ساتھ ''شافعی قادری'' لکھنے کے عادی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہ لحاظِ عقیدہ سنّی اور شافعی مسلک کے پیرو تھے، اورانھوں نے اپنے استاد اور مرشد شاہ ابوالحسن قربی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کی تھی۔ اسی طرح 'ریاض

الجنان' کے دیباچے کا مندرجہ ذیل حصہ شعر گوئی سے ان کے شغف کی ابتدا اور تخلص کے انتخاب اور تبدیلی کے متعلق اہم معلومات فراہم کرتا ہے:

''اور بوج اے بھائی کہ یہ عاصی پندرویں سال سے شعر کے ساتھ الفت اور ارتباط رکھتا ہے۔ اگر چہ شعر کم کہتا تھا، اسی واسطے تخلص اپنا مدت لگ مقرر نہیں کیا تھا۔ جب ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۸۵ھ میں بعضے رسائل ہشت بہشت کے منظوم کیا، لفظ باقر کہ جز نام ہے، بجائے تخلص (رکھا)۔ من بعد بیچ سنہ یک ہزار و یک سو اور نو دو چہار کے وقت نظم کرنے دیوانِ عربی کے تخلص اپنا آگاہ مقرر کیا۔ اس تخلص کو اشعارِ عربی و فارسی میں لایا۔ اکثر مراثی اور ریختوں میں بھی اوس ہی تخلص کو اختیار کیا اور تتمۂ رسائلِ ہشت بہشت میں کہ بیچ سنہ ۱۲۰۶ھ کے منظوم ہوئے اور بیچ کتاب محبوب القلوب کے کہ در (میان) سنہ ۱۲۰۷ھ کے منظوم ہوئی اور اس رسالہ میں کہ ریاض الجنان نام رکھتا ہے، تخلص اپنا وہی باقر رکھا ہے، کیا واسطہ کے (کذا = کہ) رسائل اول کے جا بجا مشہور ہوئے تھے، اگر بعد ہوئے سو (کذا) رسالوں میں تخلص آگاہ لاتا تو دو تخلص ہوتے۔ اس واسطے وہی تخلص برقرار رکھا تا سب مثنویات دکھنی میں ایک تخلص رہے۔''

(مخطوطۂ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ہند، ورق ۴ ب)

آگاہ کو ایک مصنّف کی حیثیت سے اپنی ذمے داریوں کا پورا احساس تھا۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے، حتی الوسع اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سنی سنائی روایات پر یقین کر لینا ان کے نزدیک اپنے نتائجِ قلم کو خود ہی پایۂ اعتبار سے گرا دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ اپنے موضوع کے متعلق مواد کی فراہمی کے لیے وہ صرف مستند کتابوں ہی کو پیشِ نظر رکھتے تھے اور صحیح نتائج تک پہنچنے کی غرض سے حسب ضرورت تحقیق و تدقیق سے کام لیتے تھے۔ 'تحفۃ الاحباب' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اے بھائی اکثر بلکہ سب دکھنی کتاباں بنانے والے بیان میں ایسے بہت غلط کیے ہیں کہ اس زبان کو بے اعتبار کر دیے.....آج لگ کوئی کتاب دکھنی صحیح ومعتبر میری نظر میں آئی نہیں۔بعض ان سے سرتاپا جھوٹ سے بھری ہیں اور بعضوں میں جھوٹ زیادہ ہے اور بعضوں میں جھوٹ کم ہے.....شکر خدائے تعالیٰ کا کہ میرے تمام رسائل بہت صحیح ومعتبر ونہایت مضبوط ومدلّل ہیں۔کوئی محدّث اور صاحبِ علم کو مقدور نہیں کہ اس کی کوئی روایت پر حرف رکھ سکے۔''

(بہ حوالہ مدراس میں اردو،ص۴۳و۴۴)

'ریاض الجنان' کے دیباچے میں عام مورخین اور سیرت نگاروں کی غیر محققانہ روش پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''اکثر اہل فن کے تساہل وسہل انگاری کے تئیں شیوہ اپنا کر کر تواریخ کے لکھنے میں ضبط وتدقیق نہیں کیے بلکہ رطب ویابس جو پائے سولکھ گئے، اس جہت سے اون کی کتابوں میں غلط باتیں اور بے اصل روایتیں بہت پائی جاتی ہیں جیسا حبیب السیر وروضۃ الصفا وروضۃ الشہدا، بخلاف حفاظِ حدیث کے کہ تصانیف اون کی غایتِ تدقیق سے مقروں اور نہایتِ تحقیق سے مشحوں ہیں۔''

(مخطوطۂ کتب خانہ انجمن ترقیِ اردو، ہند، ورق ۴ب)

بعض دیباچوں کے مشتملات سے آگاہ کے ادبی شعور، تنقیدی بصیرت اور فنی نظریات کا بھی پتا چلتا ہے۔دیوانِ اردو کے دیباچے میں انھوں نے اردو کی تمام اہم اور مقبول اصنافِ سخن کے حدود اور تقاضوں سے مفصّل بحث کی ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کسی خاص صنفِ سخن میں درجۂ کمال حاصل کرنے کے لیے کس معیار کی پابندی ضروری ہے یا وہ کون سے اصول ہیں جن کو اپنائے بغیر اس صنف کے بنیادی تقاضے پورے نہیں کیے جا سکتے۔شاعری میں اظہارِ خیال کے لیے مناسب الفاظ کے

انتخاب اور تراکیب کے اختراع کی جو اہمیت ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ خصوصاً شعر کی زبان کو محاورے اور روزمرہ سے قریب تر رکھنے کے لیے تاکہ فصاحت کلام پر حرف نہ آئے، بڑی سلیقہ مندی اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس معاملے میں آگاہ شعرائے اردو سے جس حسنِ اہتمام کے خواستگار ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے:

''ریختہ کہنے والے پر واجب ہے کہ قصیدہ وغزل ومثنوی میں الفاظِ عرب (کذا=غریب) ولغاتِ غیر مشہورِ عربی وفارسی کہ ہندیاں اس (کذا-ان) سے چنداں مانوس نہیں ہیں، نہ لاوے اور ترکیب میں وضعِ ہندی کو ترتیب نہجِ فارسی پر غالب کر دیوے اور تا مقدور ترکیبِ شوخ وچست باندازِ درست اختیار کرے۔''

(بہ حوالہ سہ ماہی 'اردو'، اورنگ آباد، شمارہ اپریل ۱۹۲۹ء، ص ۳۰۴)

غزل کی تعریف میں آگاہ نے اس کی ہیئت کے روایتی تصور کی ترجمانی کے پہلو بہ پہلو اس کی معنوی خصوصیات کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کیا ہے۔ وہ غزل کی موضوعاتی وسعت کے منکر نہیں، لیکن خارجی کیفیات کی ترجمانی کے مقابلے میں واردات ومحسوسات کے بیان کو قابلِ ترجیح تصور کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے تعداد کے لحاظ سے اشعار کی کمی وبیشی کو آمد کی کیفیت پر موقوف رکھا ہے۔ غزل کے شاعر کے لیے ان کے نزدیک کم گوئی مگر خوش گوئی بہترین مسلک ہے۔ لکھتے ہیں:

''تعریف اس (غزل) کی یہ کہ وہ ابیاتِ باامطلع ہیں جو وزن وقافیہ میں متحد ہوئیں اور بارھا (۱۲) بیت سے تجاوز نہ کریں۔ فائدہ اس قید کا یہ ہے کہ جو بارھا بیت سے گزر جاوے تو غزل سے مسمّٰی نہ ہووے بلکہ قصیدہ کہلاوے.....اکثر غزل وصفِ معشوق پر مشتمل اور کبھو حالِ عاشقِ بیدل پر شامل ہوتی ہے اور کبھو نصائح ومعارف واسرار ودیگر امورِ بسیار سے خبر دیتی ہے۔ مخفی نہ رہے کہ تو صیفِ معشوقِ سراپا ناز سے ذکرِ سوز وگدازِ عاشقِ بانیاز بہتر ہے، کیا

واسطے کہ تعریفِ محبوب فقط دعوے سے ہمراہ ہے اور ذکر سوز و گدازِ عاشق کا ادعاء با گواہ۔ طریق مستحسن نزدیک ماہرانِ فن کے یہ ہے کہ سات بیت سے زیادہ اور پانچ بیت سے کم نہ ہو مگر وقتے کہ فکرِ رسا بر سر اعانت آوے و مضمونِ دلکش و دل کشا بہ طریق آمد ہات آجاوے، نو یا گیارھا بیت کہنا مضائقہ نہیں رکھتا۔''

(ایضاً بہ حوالہ سہ ماہی 'اردو'، شمارہ مذکور الصّدر، ص ۳۰۱ و ۳۰۲)

قصیدے میں آگاہ کے بہ قول چار ایسے مقامات آتے ہیں جن سے کوئی شاعر خوش اسلوبی کے ساتھ گزر جائے تو اس کے کمالِ فن کی کامیابی متیقّن ہو جاتی ہے۔ ان مقامات کی تفصیل انھوں نے اس طرح بیان کی ہے:

''ادبا عرب و عجم کے متفق ہو کر کہے ہیں کہ شاعر قصیدہ میں چار جگے اہتمام زیادہ صرف کرے۔ اول مطلع میں، کیا واسطے کہ جو پہلے مستمعان کے سمع میں پہنچتا ہو، مطلع ہے۔ اگر وہ جودت و خوبی میں طاق ہو، سامع دوسرے ابیات کے سننے کا مشتاق ہو۔ دوسرا گریز میں..... کیا واسطے کہ اول تشبیب سے آخر تک کلام یک اسلوب پر تھا، اب وضعِ دیگر کو پہنچا۔ پس اگر گریز بطرزِ دلآویز کرے، سامع کا طرب انگیز ہوئے۔ تیسرا اگر شاعر قصیدہ میں تعرض بذکرِ مدعا یا عرضِ دعا کرے، بآئینِ دل پذیر و اندازِ بے نظیر آنکے۔ ادبا اسے حسن الطلب و براعۃ الطلب کہتے ہیں۔ چوتھا درستیِ خاتمہ میں سعیِ بلیغ کرے۔ کیا واسطے کہ مقطعِ جیّدِ دلنشین قصور و فتورِ ابیاتِ پیشیں کا ساتر ہوتا اور بے سخن ان سب خللوں کو کھوتا ہے۔ شعرا اسے براعۃ الختام و حسن المقطع کہتے ہیں۔''

(ایضاً بہ حوالہ سہ ماہی 'اردو' ص ۳۰۴)

'گلزارِ عشق' کے دیباچے میں آگاہ نے اواخرِ عہدِ محمد شاہ سے اپنے زمانے تک کے بعض مشہور اردو شاعروں اور ان کی پسندیدہ اصنافِ سخن کا ذکر کرتے ہوئے مرزا محمد رفیع سودا کو تمام ریختہ گویوں میں ''اعتبارِ نمایاں'' کا حامل قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ملک الشعرا نصرتی سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بعضے اس قدر اس (سودا) کے باب میں دفترِ اغراق کا کھولتے ہیں کہ اس بیچارہ کو سب شعرائے ریختہ گو بلکہ تمام ادبائے فارسی سے افضل و بہتر بولتے ہیں اور واعجبا بل واحسرتا ملک الشعرا نصرتی کو نہیں مانتے اور قدر اس کے سحرِ حلال کی نہیں جانتے۔ بڑی دستاویز ان کی یہ ہے کہ زبان اس کی کج مج ہے، زہے دریافت و خوشا سخن فہمی و عجب سمجھ۔ آیا نہیں جانتے کہ اتفاق سے شعرائے عرب و عجم کے معنی جانِ سخنِ آبدار ہے اور لفظ لباسِ مستعار رہے.....تعصّب کو یک طرف رکھ کر سب کلیاتِ سودا کو بغور ملاحظہ کر کر انتخاب کرے اور ان سبھوں کو یک داستانِ گلشنِ عشق یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے تا انداز سے اس کے اور اوس کے بواقعی واقف ہوئے۔''

اس مقابلے اور موازنے میں آگاہ نے جس چیز کو فیصلے کا معیار قرار دیا ہے، وہ زبان و بیان پر معانی کی برتری ہے۔ اس زاویۂ نگاہ سے وہ نصرتی کو سودا کی بہ نسبت بہتر شاعر سمجھتے ہیں، لیکن سودا کے کمالِ فن کا انھیں بہر حال اعتراف ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''باوجود ان سب مراتب کے ہم انصاف کرتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا قصائد و غزل میں بڑا سخن تراش و صاحب تلاش ہے۔ (اور) محاورۂ شستہ و صاف میں یگانۂ زمانہ اور شوق (کذا=شوخیِ) مزاج و رنگینیِ طبیعت میں ہر کہیں افسانہ۔''

ان مباحث کی روشنی میں یہ بات بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے کہ منظوماتِ آگاہ کے یہ دیباچے کئی لحاظ سے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر ایک طرف ان سے اسالیبِ نثر کے

تنوّع اور ارتقا کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے تو دوسری طرف ان کی روشنی میں ایک انشا پرداز، زباں داں اور نقاد کی حیثیت سے آگاہ کی شخصیت کا وہ بھرپور نقش ابھرتا ہے جو تاریخِ ادب میں ان کے لیے ایک ممتاز مقام کا طالب ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے تحقیقی مقالے 'اردو نثر کا آغاز اور ارتقا۔ انیسویں صدی کے اوائل تک۔' میں ان دیباچوں کے علاوہ ایک مکمل نثری تصنیف 'ریاض السیر' کو بھی جس کا موضوع سیرتِ نبوی ہے، آگاہ کے نتائجِ قلم کے ذیل میں متعارف کرایا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف 'مدراس میں اردو'، ڈاکٹر زور کے مرتبہ 'تذکرۂ مخطوطات' (جلدِ اول) اور پروفیسر عبدالقادر سروری کے مضمون 'باقر آگاہ' (مشمولہ سہ ماہی 'اردو'، اورنگ آباد، شمارہ اپریل ۱۹۲۹ء) میں بھی اس کتاب کا نام ان کی تصانیف کی فہرست میں شامل ہے۔ لیکن فی الوقت اس کتاب کے جو نسخے دستیاب ہیں، وہ دکن کے ان نامور محققین کے اس انتساب کی تائید میں کوئی ضعیف شہادت بھی فراہم نہیں کرتے۔ خود ہاشمی صاحب نے کتب خانۂ آصفیہ کی فہرستِ مخطوطات (جلدِ اول، ص ۱۹۳) میں وہاں کے دو قلمی نسخوں کا تعارف سپردِ قلم کرتے ہوئے واضح طور پر فرمایا ہے کہ ''اس کتاب کے مصنف کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔'' اس کے بعد موصوف کی یہ قیاس آرائی کہ ''شاید باقر آگاہ ہی کی تصنیف ہو''، کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آگاہ نے اپنی تمام تصانیف کی ابتدا اپنے نام اور موطن و مسلک کی صراحت کے ساتھ کی ہے، ایسی صورت میں کسی ایک کتاب کا اس خصوصیت سے محروم رہ جانا بعید از قیاس ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو آگاہ کی تصانیف میں کسی جگہ اس کتاب کا حوالہ ملتا ہے، جب کہ دوسری کتابوں کا ذکر وہ جا بجا کرتے رہے ہیں اور نہ اس کا اندازِ بیان ان کے عام طرزِ نگارش سے مماثلت رکھتا ہے۔ یہ بات ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ بھی تسلیم کرتی ہیں کہ اس کے جملوں کی ساخت پر عربی کا اثر غالب ہے جو آگاہ کی تحریر کا عام انداز نہیں۔[۱۵] اس لیے ہمیں محض قیاسات کی بنیاد پر اسے آگاہ سے منسوب کرنے میں تامل ہے۔

'ریاض السیر' ہی کے قسم کی ایک اور کتاب جسے غلط فہمی کی بنا پر آگاہ سے منسوب کر دیا گیا ہے، دکنی زبان کا ایک مختصر نثری رسالہ 'خلاصۃ العقائد' ہے جو انجمن ترقیِ

اردو (ہند) کے کتب خانے میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ فہرستِ مخطوطات میں اس کا اندراج 'خلاصۃ العقائد یا عقائد نامہ' تصنیف محمد باقر آگاہ کے نام سے کیا گیا ہے۔ لیکن ترقیمے میں کاتب نے مصنف کا نام شیخ محمد باقر بتایا ہے، جو بالیقین ''محمد باقر آگاہ شافعی قادری ایلوری'' سے مختلف شخصیت ہیں۔ اگر چہ آگاہ نے بھی 'عقائد نامہ' کے نام سے ۱۱۸۵ھ (۷۲-۱۷۷۱ء) میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا[۱۶]، جس کا ذکر بعض مصنّفین نے 'عقائدِ اہلِ سنت' اور 'عقائدِ باقر آگاہ' کے ناموں سے بھی کیا ہے لیکن 'خلاصۃ العقائد' کے برخلاف یہ رسالہ نظم میں ہے اور اس میں بقولِ مصنف ''عقائدِ اہلِ سنت'' کا بیان کیا گیا ہے،[۱۷] جب کہ 'خلاصۃ العقائد' کا مصنف اثنا عشری مسلک کا پیرو ہے۔ اس کی تحریر کے مطابق دوازدہ ائمہ ''جوں پیغمبر معصوم'' ہیں اور ان کی اطاعت ارکانِ ایمان میں سے چوتھا رکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے عقائد محمد باقر آگاہ سے جنھوں نے تواتر کے ساتھ اپنے سنّی شافعی ہونے کا اعلان کیا ہے، منسوب نہیں کیے جا سکتے، اس لیے یہ رسالہ بھی یقیناً ان کی تصنیف نہیں۔

حواشی

۱۔ مولوی محمد مرتضیٰ نے ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں وفات پائی۔ آگاہ نے ان کے انتقال کی تاریخ اس طرح نظم کی ہے:

اَرَّخَ آگاہ عَنِ التَّخرِجہ
قَدْ خَرَجَ الرُّوْحُ مِنَ الْمُرْتَضٰی

۲۔ اکثر مصنّفین نے ایلور کے بجائے ویلور کو جو جنوبی ہند کا ایک مشہور شہر ہے، آگاہ کا مولد و مسکن قرار دیا ہے لیکن یہ درست نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ آگاہ کی تصانیف کے جتنے خطّی نسخے یا ان کے اقتباسات کی معتبر نقلیں راقم السطور کی نظر سے گزری ہیں، ان میں ان کے نام کے ساتھ واضح طور

پر ''ایلوری'' لکھا ہوا ہے جو یقیناً مرجح اور مستند ہے۔ ''ایلور'' مدراس، گڈور ریلوے لائن پر مدراس سے شمال کی جانب ۵۲ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

۳ نتائج الافکار از قدرت اللہ گویامئوی، مطبوعہ بمبئی، ص ۹۳۔

۴ نتائج الافکار، ص ۹۴ و سہ ماہی 'اردو'، اورنگ آباد، شمارہ اپریل ۱۹۲۹ء، ص ۲۷۸

۵ بہ حوالہ فہرست مخطوطاتِ انجمن ترقیِ اردو، پاکستان (اردو)، جلدِ اول، مرتبہ افسر صدیقی امروہوی و سید سرفراز علی رضوی، ص ۸۶

۶ فہرستِ مخطوطاتِ کتب خانۂ آصفیہ، جلدِ دوم، ص ۲۱۱

۷ ہاشمی صاحب نے اسے ۱۲۰۶ھ کی تصنیف بتایا ہے۔ (مدراس میں اردو، ص ۴۳ و فہرست کتب خانۂ سالار جنگ، ص ۷۹۱)

۸ ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی نے اپنی بعض تحریروں میں اس رسالے کا نام ''فرائد در عقائد'' اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے تحقیقی مقالے 'اردو نثر کا آغاز اور ارتقا' میں کہیں 'فرائد در فوائد' اور کہیں ''فواید در قواید'' یا ''فوائد در قواعد'' لکھا ہے۔ ''فرائد در فوائد'' کے علاوہ نام کی یہ تمام شکلیں نادرست ہیں۔

۹ بہ حوالہ فہرست مخطوطاتِ انجمن ترقیِ اردو، پاکستان (اردو)، جلدِ اول، ص ۱۶

۱۰ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے ایک مضمون میں آگاہ کی تصانیف کی فہرست کے تحت 'گلزارِ عشق'، 'روح افزا' اور 'قصۂ رضوان شاہ' کو تین مختلف تصانیف قرار دیا ہے۔ (سہ ماہی 'اردو'، اورنگ آباد، شمارہ اپریل ۱۹۲۹ء، ص ۲۹۳)

۱۱ انجمن کی فہرست میں ایک نسخے (نشان سلسلہ ۵۸۳) کا اندراج 'رضوان

شاہ وروح افزا' کے نام سے کیا گیا ہے اور اس کا سالِ تصنیف ۱۲۱۱ھ بتایا گیا ہے (جلدِ اول، ص ۴۳۲)۔ دوسرا نسخہ (نشان سلسلہ ۶۵۱) 'گلزارِ عشق' کے نام سے مندرج ہے۔ لیکن اس کے آگے سنہ تصنیف کے خانے میں ۱۲۱۰ھ لکھا ہوا ہے (ص ۴۳۶)، جو ہماری معلومات کے مطابق غلط ہے۔

۱۲؎ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی یہ اطلاع کہ ''حیدرآباد کے کسی کتب خانے میں اس کا مخطوطہ نہیں ملتا'' (اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، ص ۴۳۸)، درست نہیں۔

۱۳؎ مدراس میں اردو، ص ۳۴

۱۴؎ انجمن ترقیِ اردو، پاکستان کی فہرست مخطوطات (اردو) میں اس مثنوی (نشانِ سلسلہ ۶۱۸) کا نام 'صبحِ نو بہارِ عشق' درج کیا گیا ہے (ج ۱، ص ۴۳۴)۔ ہمارے علم واطلاع کے مطابق یہ روایت درست نہیں۔

۱۵؎ 'اردو نثر کا آغاز اور ارتقا'، ص ۴۴۳

۱۶؎ اس رسالے کے قلمی نسخے ادارۂ ادبیات اردو، سرسالار جنگ میوزیم اور انجمن ترقیِ اردو، پاکستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

۱۷؎ کیا ہوں میں بیاں اس نظم اندر عقائد اہلِ سنت کا سراسر

(ماہ نامہ ''نیا دور''، لکھنؤ، شمارہ جنوری ۱۹۷۹ء)

فسانۂ عجائب کا حقِ اشاعت

کلاسیکی اردو نثر کی کتابوں میں ''فسانۂ عجائب'' کا جو مقام ہے، اس سے اہلِ نظر بہ خوبی واقف ہیں۔ یہ اپنے زمانے کی مقبول ترین کتابوں میں تھا اور فکر و نظر کے معیار بدل جانے کے باوجود اس کا یہ اعزاز و امتیاز آج بھی بڑی حد تک برقرار ہے۔ اس کا اولین ایڈیشن روزِ شنبہ ۹/ جمادی الثانی ۱۲۵۹ھ (۸/ جولائی ۱۸۴۳ء) کو مطبعِ حسنی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اس کے کتنے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، یہ بتانا دشوار ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ رشید حسن خاں جب برسوں کی محنت کے بعد مختلف مطبوعہ نسخوں کی مدد سے اس کتاب کا ایک معیاری ایڈیشن تیار کر چکے تو انھیں اتفاقاً ایک ایسا نسخہ مل گیا جو مصنّف کا تصحیح کردہ آخری نسخہ ہونے کی بنا پر باقی تمام نسخوں سے زیادہ اہم تھا اور جس کے وجود سے اس وقت تک علمی دنیا میں کوئی بھی شخص واقف نہ تھا۔ ان کے اپنے الفاظ میں اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

> ''جب اس متن کی تدوین کا کام مکمل ہو گیا اور کتابت بھی ہو گئی، صرف مقدمہ لکھنا باقی تھا، اسی زمانے میں مجھے پٹنہ جانا پڑا۔ وہاں خدا بخش لائبریری کے ذخیرۂ ادارۂ تحقیقاتِ اردو کی فہرست میں ''فسانۂ عجائب'' کا ایک نسخہ مطبوعہ ۱۲۸۰ھ نظر پڑا۔ میں حیران ہوا

کیوں کہ اس وقت تک اس سنہ کے کسی نسخے کا علم نہیں تھا۔ اب جو اسے نکلوا کر دیکھتا ہوں تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ تو مصنّف کا نظر ثانی کیا ہوا نسخہ ہے۔.....'' [1]

''فسانۂ عجائب'' کی تدوین کے اس کام میں رشید حسن خاں صاحب نے جن آٹھ نسخوں کو بہ طور خاص پیشِ نظر رکھا ہے، ان میں آٹھواں نمبر مطبعِ نول کشور، لکھنؤ کے ۱۲۸۳ھ/۶۷۔۱۸۶۶ء کے اس ایڈیشن کا ہے جو خاص اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ اس ایڈیشن کی خصوصیات کے بارے میں خاں صاحب کا ارشاد ہے:

''اسے منشی نول کشور نے سرورؔ سے حقوقِ اشاعت خریدنے کے بعد ۱۲۸۳ھ (۶۷۔۱۸۶۶ء) میں بہت اہتمام کے ساتھ چھاپا تھا کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بلاشبہ یہ اعلیٰ درجے کا ایڈیشن ہے.....اس میں بہت سی رنگین تصویریں ہیں۔ تصویریں تو معمولی ہیں لیکن رنگ اس قدر پختہ ہیں کہ اب تک ماند نہیں پڑے ہیں.....جدول رنگین ہیں، عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں، شاعروں کے تخلص، مصرعوں کے درمیان کا نشان، لفظِ مصرع، غزل، رباعی وغیرہ، ان سب کو سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔.....'' [2]

پروفیسر نیّر مسعود نے اس ایڈیشن کے متعلق حسبِ ذیل معلومات فراہم کی ہے:

''۱۸۶۷ء/۱۲۸۳ھ میں منشی نول کشور نے سرورؔ سے ''فسانۂ عجائب'' کا حقِ تالیف خرید کر رجسٹری کرا لیا۔ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۳ء میں ''فسانۂ عجائب'' کا نول کشوری ایڈیشن بڑی آب و تاب اور خاص اہتمام سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن مصنّف کے نظر ثانی کیے ہوئے نسخے کے مطابق چھاپا گیا۔ منشی گوبند پرشاد فضاؔ..... نے اس کی کتابت کی، شیخ امیر علی نقاش نے جدول کشی کی اور شیخ قائم علی مصوّر نے اس کی تصویریں بنائیں۔ منشی نول کشور نے اس کی تصحیح کا کام اپنے وقت کے مشہور شاعر

اور نثّار منشی فدا علی عرف اچھے صاحب عیشؔ لکھنوی کو سونپا تھا۔'' ۳؎

حسنِ ظاہری کی تفصیل سے قطعِ نظر ان بیانات سے اس ایڈیشن کے متعلق دو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کی طباعت و اشاعت اس کے مصنّف مرزا رجب علی بیگ سرورؔ سے اس کے حقوقِ اشاعت خرید لینے اور انھیں رجسٹری کرا لینے کے بعد عمل میں آئی تھی۔ دوسری یہ کہ اسے مصنّف کے نظرِ ثانی کیے ہوئے نسخے کے مطابق چھاپا گیا تھا۔ یہ دوسری صراحت منشی فدا علی عیشؔ لکھنوی کی لکھی ہوئی ''نثرِ خاتمہ'' کے اس بیان پر مبنی ہے کہ:

> ''عالی جناب..... منشی نول کشور..... کو خیالِ طبعِ فسانۂ عجائب آیا۔ ایک دن ارشاد کیا کہ یہ کہانی لاثانی مع تصویرات مطبوع ہو۔ ایسی عمدہ چھپے کہ آج تک نہ چھپی ہو..... کارپردازانِ مطبع کو حکم کا انتظار تھا، فضلِ الٰہی سے سب سامان تیار تھا۔ نسخۂ نظرِ ثانی فرمودۂ مولف کے موافق طبع کرنے کا قصد کیا۔'' ۴؎

عیشؔ کے اس بیان سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ سرورؔ نے اس سے پہلے کے بعض ایڈیشنوں کی طرح اس ایڈیشن کے لیے بھی کتاب کے متن پر از سرِ نو نظرِ ثانی کی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے جب لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈی۔لٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ''فسانۂ عجائب'' کی تدوین کا کام شروع کیا تو اسی نسخے کو بنیاد بنایا کیوں کہ ان کا ''خیال'' یہ تھا کہ ''یہ مصنّف کا آخری نظر یافتہ نسخہ ہے۔'' ۵؎ حالانکہ عیشؔ کی تحریر سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کارپردازانِ مطبع نے جس نسخے کی بنیاد پر اس خاص نسخے کا متن تیار کیا تھا، وہ نظرِ ثانی فرمودۂ مولف'' تھا۔ اس ایڈیشن کے لیے سرورؔ نے بہ طورِ خاص کوئی نظرِ ثانی شدہ نسخہ صاحبانِ مطبع کے حوالے نہیں کیا تھا۔ خاں صاحب نے اپنے مرتّب کیے ہوئے ایڈیشن کے مقدمے میں اس مفروضے کی مدلّل طور پر تردید فرما دی ہے۔

اوّل الذکر معاملے میں اس بنیادی نکتے پر کہ یہ ایڈیشن سرورؔ سے حقوقِ اشاعت حاصل کر لینے کے بعد شائع کیا گیا تھا، پروفیسر نیّر مسعود اور رشید حسن خاں دونوں متفق الرّائے ہیں۔ البتہ نیّر صاحب کے برخلاف خاں صاحب کا خیال یہ ہے کہ حق اشاعت ۱۲۸۳ھ میں

نہیں، اس سے پہلے حاصل کیا جا چکا تھا، چنانچہ نیّر صاحب کا بیان نقل کرنے کے بعد حاشیے میں لکھتے ہیں:

> ''نیّر مسعود صاحب نے لکھا ہے: ''۱۸۶۷ء/۱۲۸۳ھ میں منشی نول کشور نے سرورؔ کے فسانۂ عجائب کا حق تالیف خرید کر رجسٹری کرا لیا''..... مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ حقوقِ اشاعت کی خرید اور اس نسخے کی اشاعت، یہ دونوں واقعے ایک ہی سال یعنی سنہ ۸۳ھ کے نہیں ہو سکتے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ اس اشاعت کے سرورق پر ''۱۲۸۲ھ'' درج ہے، یعنی اس سنہ میں کام شروع ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ حقوقِ اشاعت اس سے پہلے یا زیادہ سے زیادہ اس سنہ کے اوائل میں خریدے گئے ہوں گے۔ میرے سامنے ایسی کوئی تحریر موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ حقوقِ اشاعت کب خریدے گئے تھے۔ اس نسخے کا اہتمام و انتظام ۱۲۸۲ھ میں شروع ہو چکا تھا اور سرورؔ اس وقت بنارس میں تھے (جیسا کہ عیشؔ نے لکھا ہے) تو پھر یہ لکھا پڑھی کب ہوئی اور کیسے ہوئی؟ لکھا پڑھی ہوئی تو تھی مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ کب ہوئی تھی اور کس طرح ہوئی تھی۔ ہاں ڈاکٹر سلیمان حسین نے اپنے مرتّبہ نسخے کے مقدمے میں اسے ۱۲۸۲ھ کا واقعہ بتایا ہے (ص ۳۷)۔ یہ ممکن ہے مگر ماخذ کا حوالہ انھوں نے نہیں دیا۔'' [۶]

۱۲۸۳ھ کے اس نول کشوری ایڈیشن میں ایسی کوئی داخلی شہادت موجود نہیں جس کی بنیاد پر یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے حقوقِ اشاعت اس کی طباعت کی تیاری سے قبل حاصل کیے جا چکے تھے۔ یہ دراصل ایک مفروضہ ہے جو ایک ناقص خارجی شہادت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر نیّر مسعود کو مرزا رجب علی بیگ سرورؔ سے متعلق اپنے تحقیقی کام کے دوران اتفاقاً ''فسانۂ عجائب'' کا ایک ایسا نسخہ مل گیا تھا جو وکٹوریہ پریس، لاہور کا مطبوعہ تھا اور جسے منشی نول کشور سفرِ لاہور سے واپسی پر اس غرض سے اپنے ساتھ لائے تھے کہ اس

کے ناشرین میاں چراغ دین، میاں سراج الدین کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکے۔ یہ بات بابو کنھئی لال صاحب کے نام منشی جی کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوے ایک رقعے سے معلوم ہوئی جو اس نسخے میں رکھا ہوا تھا۔ اس رقعے میں منشی جی نے بابو صاحب موصوف کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ ان کے تحریر کردہ مسودے کے مطابق اس غیر قانونی ایڈیشن کے ناشرین کو ایک باضابطہ خط جاری کریں۔ اس مسودے میں ناشرین سے جس امرِ خاص کی وضاحت طلب کی گئی تھی، وہ یہ تھا:

> ''چوں کہ اس کتاب کا حقِ تصنیف مصنّف نے، جس کو عرصہ چوبیس برس ہوا، دے دیا ہے، پس تعجب ہے آپ کو برابر علم اس امر کا تھا کہ یہ حق رجسٹری شدہ ہے اور پھر آپ نے طبع کی۔ لہٰذا اطلاع دیجیے کہ یہ غلطی آپ جیسے دوست سے کیوں کر ہوئی؟'' ؎

اس رقعے کے آخر میں سنہ کے التزام کے بغیر صرف ''۲۲ رمئی'' بہ طورِ تاریخ درج ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا صحیح زمانۂ تحریر کیا ہے اور اس کے مطابق چوبیس برس کی مدت کس سنہ سے شمار کی جائے گی۔ فاضل محقق نے محض اس قرینے کی بنیاد پر کہ پہلے مصنّف سے حقوقِ اشاعت حاصل کیے گئے ہوں گے، اس کے بعد کتابت و طباعت کا کام شروع ہوا ہوگا، یہ حتمی رائے قائم کر لی کہ منشی نول کشور ۱۸۶۷ء/۱۲۸۳ھ میں سرور سے ان کی اس کتاب کا حقِ تالیف خرید کر اس کی رجسٹری کرا چکے تھے۔ واقعات کی منطقی ترتیب کے نقطۂ نظر سے بہ ظاہر اس کے علاوہ اور کوئی فیصلہ ممکن بھی نہیں تھا۔ لیکن دنیا میں ہر کام ہر وقت مقرّرہ ضابطے اور طے شدہ اصول کے مطابق نہیں ہوتا۔ چنانچہ ''الٹی گنگا بہانا'' بھلے ہی صرف ایک محاورہ ہو، گنگا کا الٹا بہنا بہر حال ایک حقیقت ہے۔ اسی استثنا کے مطابق اس معاملے میں بھی اصل صورتِ حال یہ ہے کہ مطبعِ نول کشور کا خاص اہتمام سے تیار شدہ زیرِ بحث ایڈیشن پہلے شائع ہوا اور مصنّف نے مطبع کو اپنی اس مقبولِ عام تصنیف کا حقِ اشاعت بعد میں منتقل کیا۔ یہ حقیقت بھی بالکل اسی طرح اتفاقاً منکشف ہوئی جس طرح منشی نول کشور کے رقعے سے نیّر صاحب پر اس واقعے کا انکشاف ہوا تھا کہ اس کتاب کا حقِ تصنیف نسخۂ

لاہور کی اشاعت سے چوبیس برس قبل مصنّف نے ان کے مطبع کو دے دیا تھا اور اس کی رجسٹری بھی ہو چکی تھی۔ ہوا یہ کہ اپریل ۲۰۰۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں ''اودھ اخبار'' کے ایک فائل کی ورق گردانی کے دوران ایک اشتہار پر نظر پڑی جو ''اعلانِ ترقیِ مطبعِ اودھ اخبار'' کے عنوان سے ۲۵ر فروری ۱۸۶۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس اشتہار میں بہ طورِ تمہید ایک اشاعتی ادارے کی حیثیت سے مطبع کی کامیابی اور ترقی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی بعض کتابوں کا حقِ تصنیف مطبع کو عطا کرنے پر مرزا جب علی بیگ سرورؔ کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ بعد ازاں بہ طورِ سند وہ تحریر منقول تھی جو انھوں نے اس سلسلے میں منشی نول کشور کو لکھ کر دی تھی۔ یہی تحریر وہ مستند اور فیصلہ کن ماخذ ہے جس سے ''فسانۂ عجائب'' کے سلسلے میں یہ خلافِ قیاس حقیقت واضح ہوئی کہ سرورؔ نے اس کا حقِ اشاعت نول کشوری ایڈیشن کے سالِ انطباع ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء کے ایک برس بعد ۱۸۶۸ء/۱۲۸۴ھ میں منشی نول کشور کے نام منتقل کیا تھا۔ یہ سند یا ہبہ نامہ افادۂ عام کی غرض سے من وعن سطورِ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

> ''بنام منشی نول کشور صاحب مالکِ مطبعِ اودھ اخبار و کان پور وغیرہ
>
> ازاں جا کہ فسانۂ عجائب اور تالیفاتِ راقم دیگر مطابع میں آج تک طبع ہوئیں، نہایت غلط ہیں۔ جس نے دیکھا، میری تحریر کے صاف خلاف پایا، اس وجہ سے کسی اہلِ مطابع کو ہم نے حقِ تالیف وتصنیف نہیں دیا۔ گو جا بجا شائع ہوئیں پر ضائع ہوئیں۔ بس کہ منشی صاحب کا لطف واتحاد وسلوک اور حسنِ اہتمام مطبع کا اس مرتبہ ہے کہ جس سے مخلص کو یہ آرزو ہوئی کہ حقِ تالیف وتصنیف فسانۂ عجائب و سرورِ سلطانی وگلزارِ سرور کا منشی صاحب موصوف الاوصاف کو دیجیے، چنانچہ بذریعہ تحریرِ ہٰذا منشی صاحب ممدوح کو مجاز کرتے ہیں کہ تاریخِ تحریر سے منشی صاحب مالک حقِ تالیف وتصنیف کتبِ مذکور کے

بموجب قانونِ وقت کے ہیں۔ آئندہ کو ہم، نہ ہمارے جانشیں مجاز ہوں گے کہ حقِ تالیف وتصنیف ان کتب کا کسی اور صاحبِ مطبع کو عطا کریں۔ منشی صاحب جس شخص کو اپنی طرف سے حقِ تالیف عطا کریں تو اس حالت میں دوسرا شخص چھاپنے کا مجاز ہوگا۔ جس طریقۂ قانون کی رو سے چاہیں، منشی صاحب موصوف مجاز ہیں، اپنے استحقاقِ حقوق کو مرعی رکھیں۔ لہٰذا یہ سند بطور عطاے حقِ تالیف و تصنیف واسطے کتاب فسانۂ عجائب وسرورِ سلطانی وگلزارِ سرور کے لکھ دی کہ بعد تحریرِ ہٰذا کے کوئی شخص ان کتب کے چھاپنے میں مبادرت نہ کرے۔ فقط

تحریر بتاریخ یکم ماہِ فروری سنہ ۱۸۶۸ء مطابق ہفتم ماہِ شوال سنہ ۱۲۸۴ ہجری

العبد	گواہ شد	گواہ شد
رجب علی بیگ سرورؔ ولد مرزا اصغر علی بیگ	شیخ حفیظ اللہ ساکن لکھنؤ	محمد اسمٰعیل ''۸

اس ''سند'' کے ذریعے سرورؔ نے ''فسانۂ عجائب'' کے علاوہ اپنی دو اور تصانیف ''سرورِ سلطانی'' اور ''گلزارِ سرور'' کے حقوقِ اشاعت بھی منشی نول کشور کو عطا کر دیے تھے۔ ان میں سے پہلی کتاب ''سرورِ سلطانی'' کے اس وقت تک کم از کم دو ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ پہلا ایڈیشن جس پر سالِ طباعت درج نہیں، مطبعِ سلطانی سے اور دوسرا ایڈیشن ۱۲۶۸ھ (۵۲-۱۸۵۱ء) میں مولوی مسیح الزماں کے مطبعِ مسیحائی میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ حقوقِ اشاعت کی منتقلی کے بعد کے زمانے میں مختلف ذرائع سے اس کے مزید دو ایڈیشنوں کے انطباع کا علم ہوتا ہے۔ ''سیر المصنّفین'' کے مصنّف مولوی محمد یحییٰ تنہاؔ کا بیان ہے کہ ''منشی نول کشور نے..... پہلی مرتبہ اس کتاب کو ۱۸۸۷ء میں چھپوا کر شائع کیا تھا'' ۹ پروفیسر نیّر مسعود نے اسی سنہ میں مطبعِ نامی، لکھنؤ سے بھی اس کے ایک ایڈیشن کی اشاعت کا

حوالہ دیا ہے۔اس ذیل میں انھوں نے اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ

''مولوی محمد یحییٰ تنہاؔ نے ۱۸۸۷ء میں نول کشور پریس سے شائع ہونے والے جس ایڈیشن کا تذکرہ کیا ہے وہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔اس کا بھی امکان ہے کہ کسی غلط فہمی کے تحت مولوی تنہاؔ نے مطبعِ نامی کے ایڈیشن کو نول کشور پریس کا ایڈیشن سمجھ لیا ہو۔'' ۱۰

اس دریافت کے بعد کہ ۱۸۶۸ء میں اس کتاب کی اشاعت کا حق منشی نول کشور کو حاصل ہو گیا تھا، ۱۸۸۷ء میں ان کے مطبع سے اس کی اشاعت سے متعلق کسی شہادت کو بہ آسانی مسترد نہیں کیا جا سکتا۔اسی سنہ میں مطبعِ نامی سے اس کی اشاعت البتہ باعثِ حیرت ہے، کیونکہ صاحبِ مطبع کا یہ عمل صریحاً قانون کی خلاف ورزی کے مترادف تھا۔

''گلزارِ سرور'' پہلی بار کب شائع ہوئی، یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ پروفیسر نیّر مسعود کو اس کا صرف ایک ایڈیشن دستیاب ہوا تھا جس میں کسی جگہ اس کا سالِ طبع درج نہ تھا۔اسے سرورؔ کے دوست اور ان کی کتابوں کے اہم ترین ناشر مولوی محمد یعقوب انصاری نے اپنے مطبع افضل المطابع واقع لکھنؤ میں چھاپ کر شائع کیا تھا۔انتقالِ حقوق سے متعلق زیرِ بحث تحریر کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی فروری ۱۸۶۸ء سے پہلے شائع ہو چکا تھا، کیوں کہ سرورؔ نے جن تین کتابوں کے حقوقِ اشاعت منشی نول کشور کے نام منتقل کیے تھے، وہ ان کے بیان کے مطابق دیگر مطابع میں طبع ہو چکی تھیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی یہ دلیل بھی کافی باوزن ہے کہ:

''اس پہلی اشاعت.....کے سرورق پر.....مولف کے نام کے ساتھ، دوسری اشاعت کی طرح، لفظ ''مغفور'' نہیں ہے۔اس سے یقین ہوتا ہے کہ کتاب کے پہلی بار چھپنے کے وقت مرزا سرورؔ (متوفیٰ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء) حیات تھے۔ ۱۱

''گلزارِ سرور'' کا دوسرا ایڈیشن جس کا ایک نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا، حسبِ سابق مولوی محمد یعقوب انصاری کے مطبع ''افضل المطابع

محمدی'' معروف بہ ''مطبعِ نجم العلوم کارنامہ، واقع دارالعلم والعمل ،فرنگی محل'' میں ۱۳۰۷ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ''دوبارہ'' شائع ہونے والے اس ایڈیشن کے آخر میں سرورؔ کی دو اور تصنیفات ''شرارِ عشق'' اور ''نثرِ نثرہ نثار'' بھی بہ طورِ ضمیمہ شامل تھیں۔ یہ دونوں تحریریں اس ایڈیشن کے کل گیارہ صفحات کو محیط تھیں۔۱۲؎ ''سرورِ سلطانی'' کے ۱۸۸۷ء میں مطبعِ نامی سے شائع شدہ ایڈیشن کی طرح ''گلزارِ سرور'' کا یہ دوسرا ایڈیشن بھی بہ ظاہر مطبعِ نول کشور کے استحقاق کو نظر انداز کر کے غیر قانونی طور پر شائع کیا گیا تھا۔

سرورؔ کی اس تحریر کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے منشی نول کشور کے حسنِ سلوک اور ان کے مطبعے کے حسنِ اہتمام سے متاثر ہو کر ''فسانۂ عجائب'' اور باقی دو کتابوں کے حقوقِ اشاعت از خود ان کے نام منتقل کر دیے تھے، اس لیے انتقالِ حقوق کے اس عمل کو باضابطہ خرید و فروخت کا نام دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے کہ ۱۸۶۷ء کے نول کشوری ایڈیشن کو دیکھ کر ہی سرورؔ نے یہ تاثر قائم کیا ہو کہ منشی جی اور ان کے مطبعے کے کارپردازوں نے ان کی اس تصنیف کی قدردانی کا حق ادا کر دیا ہے اور اس کے اعتراف کے طور پر انھوں نے ایک کی بجائے تین کتابوں کے حقوقِ دائمی ان کے نام منتقل کر دیے ہوں، کیوں کہ اس دور میں صحت اور سلیقے کے ساتھ کتابوں کی اشاعت ایک بڑا مسئلہ تھی حتیٰ کہ غالبؔ جیسے نابغۂ عصر کو بھی اپنی تصانیف کے معتبر اور دیدہ زیب ایڈیشنوں کے لیے حریصانہ اِدھر اُدھر دیکھنا پڑتا تھا۔

سرورؔ کے نام منشی انوار حسین تسلیمؔ سہسوانی کے ایک خط سے جو ۶ر فروری ۱۸۶۸ء کو لکھا گیا تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرورؔ اس وقت کان پور میں موجود تھے۔ اس بنا پر قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یکم فروری ۱۸۶۸ء کی زیرِ بحث تحریر کان پور ہی میں لکھی گئی ہوگی۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ سرورؔ ۶ر فروری سے قبل لکھنؤ کا سفر کر چکے ہوں اور یہ تحریر لکھنے کے بعد وہاں سے کان پور واپس پہنچے ہوں۔ چوں کہ لکھنؤ اور کان پور دونوں ہی مطبعِ نول کشور کے اہم مراکز تھے، اس لیے بہ ہر دو صورت اس تحریر کا صاحبِ مطبع اور اہالیانِ مطبع سے ملاقات کے بعد برسرِ موقع لکھا جانا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ تسلیمؔ کے متذکرۂ بالا رقعے کے جواب میں سرورؔ

نے لکھا تھا کہ ''بندہ بھی اگر چہ نزدیک نہیں دور ہے مگر منشی نول کشور صاحب کی عنایت سے مسرور ہے، مسرور ہے۔'' ۱۳؎ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرورؔ جسمانی طور پر منشی نول کشور صاحب سے دور یعنی بنارس میں رہنے کے باوجود ان کی عنایتوں سے مستفید ہوتے رہتے تھے اور اس کے برملا اعتراف و اعلان میں انھیں کوئی تامّل نہ تھا۔

حواشی

۱؎ فسانۂ عجائب، مرتّبہ رشید حسن خاں، شائع کردہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۲

۲؎ ایضاً، ص ۹۱، ۹۲

۳؎ رجب علی بیگ سرورؔ۔ حیات اور کارنامے، مطبوعہ الہ آباد، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۶

۴؎ فسانۂ عجائب، مرتّبہ رشید حسن خاں، ص ۹۳

۵؎ فسانۂ عجائب، مرتّبہ سید سلیمان حسین، شائع کردہ یو. پی. اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء، ص ۳۸

۶؎ فسانۂ عجائب، مرتّبہ رشید حسن خاں، حاشیہ ص ۹۲

۷؎ رجب علی بیگ سرورؔ، ص ۱۳۸

۸؎ اودھ اخبار، لکھنؤ، شمارہ ۲۵ر فروری ۱۸۶۸ء، ص ۱۷۵

۹؎ سیر المصنّفین، جلد دوم بہ حوالہ رجب علی بیگ سرورؔ، ص ۲۶۴، ۲۶۵

۱۰؎ رجب علی بیگ سرورؔ، ص ۲۷۷

۱۱؎ انشائے غالب، مرتّبہ رشید حسن خاں، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ص ۹۹

۱۲؎ ایضاً، ص ۹۹

۱۳؎ سرورؔ کا یہ جواب اور تسلیمؔ کا اصل رقعہ دونوں بہ صورتِ عکس ماہنامہ ''خیاباں''، لکھنؤ کے مارچ ۱۹۳۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکے ہیں۔

شبستانِ سرور کا ماخذ

الف لیلہ صحائفِ آسمانی کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی معدودے چند کتابوں میں سے ایک ہے، اس پر مستزاد یہ کہ اس کے قارئین کا دائرہ کسی خاص طبقے یا علاقے تک محدود نہیں۔ اصل کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، عربی زبان میں ہے لیکن دنیا کی تقریباً ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے باوجود یہ مسئلہ آج بھی تحقیق طلب ہے کہ اس کا اصل مصنف کون ہے، یہ کس زمانے میں لکھی گئی اور اس میں اصلاً کل کتنی کہانیاں شامل تھیں؟ فرانسیسی مترجم آں توے گالاں (Antoine Galland) وہ پہلا شخص ہے جس نے سمرنا یا قسطنطنیہ سے اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ حاصل کر کے ۱۷۰۴ء کے آس پاس فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور ۱۷۱۵ء تک اس کی دس جلدیں مکمل کر کے انھیں شائع کر دیا۔ اسی سال اس کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے مسوّدات سے اگلے دو برسوں میں اس کی مزید دو جلدیں مرتب کر کے شائع کر دی گئیں۔ بارہ جلدوں پر مشتمل گالاں کا یہ ترجمہ مغرب و مشرق میں اس کتاب کی شہرتِ عام اور اس کی طرف قارئین کے روز افزوں اشتیاق کے لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۷۰۴ء میں گالاں کے ترجمے کی پہلی جلد کی اشاعت کے اٹھانوے سال بعد ۱۸۰۲ء میں ایڈورڈ فارسٹر (Edward Forster) کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا جو پانچ جلدوں پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد جرمن، فرانسیسی، انگریزی اور دنیا کی دوسری مقبول ومعروف زبانوں میں اس کتاب کے نو بہ نو ترجموں اور ان کے خلاصوں کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ کسی بڑے وقفے کے بغیر آج تک جاری ہے۔ رولاں شمل فرنگ (Roland Schimmel Fnring) کی Arabian Nights اور مارگریٹ کے سوئفر (Margaret K. Soifer) کی (Golden Tales form Arabian Nights)، جن کا سالِ اشاعت ۲۰۰۳ء ہے، اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔[۱]

اردو میں ترجمہ نگاری کا کام ایک منظّم اور باضابطہ تحریک کے طور پر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ دوسری زبانوں کی جو اہم کتابیں اس کالج کے زیرنگرانی ترجمے کے لیے منتخب کی گئی تھیں، ان میں 'الف لیلہ' بھی شامل تھی۔ عتیق صدیقی کی تحقیق کے مطابق ۱۸۰۳ء میں تین سو صفحات پر مشتمل اس کا ایک ترجمہ جوشا کر علی نامی کسی شخص نے کیا تھا، طباعت کے لیے تیار تھا، لیکن اسے پریس تک پہنچنا نصیب ہوا یا نہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔[۲] شاکر علی کے اس معدوم ترجمے کے بعد اس سلسلے کی دوسری کوشش کے طور پر مدراس کے شمس الدین احمد کی 'حکایات الجلیلہ' کا نام لیا جاسکتا ہے جو دو جلدوں میں منقسم تھی اور ہر جلد میں سو راتوں کا بیان تھا۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۳۶ء میں اور دوسری ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس ترجمے کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ 'الف لیلہ' کے اصل عربی متن پر مبنی تھا۔[۳] اس کے بعد انیسویں صدی میں مختلف حضرات کے کیے ہوئے جو ترجمے اشاعت کی منزل سے گزر کر منظرِ عام پر آئے، ان میں سے مندرجہ ذیل تراجم بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں:

(۱) الف لیلہ از عبدالکریم: یہ چار حصوں میں منقسم ہے، لیکن چاروں حصے سلسلہ وار ایک ہی مجلد میں شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کے مطابق عبدالکریم کا یہ ترجمہ

فارسٹر کے انگریزی ترجمے سے ماخوذ ہے اور فارسٹر نے اپنے ترجمے کی بنیاد گالاں کے فرانسیسی ترجمے پر رکھی ہے۔[۴] عبدالکریم نے اسے ۱۸۴۲ء مطابق ۱۲۵۸ھ میں مکمل کیا اور پانچ برس بعد ۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۳ھ میں پہلی بار اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ بعد ازاں ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء اور ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں مطبع مصطفائی، کان پور سے اس کے کم از کم دو ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ فی الوقت یہی دونوں ایڈیشن ہمارے پیشِ نظر ہیں۔

(۲) شبستانِ سرور از مرزا رجب علی بیگ سرورؔ: 'شبستانِ سرور' تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۷۹ھ برآمد ہوتا ہے، یہی اس ترجمے کا سالِ تکمیل ہے۔ عبدالکریم کی 'الف لیلہ' کی طرح یہ ترجمہ بھی چار حصوں پر مشتمل ہے اور یہ چاروں حصے ایک ہی مجلد کی صورت میں اپنی تکمیل کے چوبیس برس بعد ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں پہلی اور آخری بار مطبعِ نجم العلوم، کارنامہ، واقع لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ سرورؔ کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ ترجمہ براہِ راست عربی سے کیا ہے لیکن انھوں نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ ڈاکٹر جین نے لکھا ہے کہ خفیف اختلاف کے سوا شبستانِ سرور میں وہی حکایات ہیں جو عبدالکریم کی الف لیلہ میں ہیں۔[۵]

(۳) ہزار داستان از منشی طوطا رام شایاںؔ: یہ ترجمہ ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۴ھ میں منشی نول کشور پریس، لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ دونوں سابق الذکر ترجموں کی طرح یہ بھی چار حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے پہلے تین حصوں میں سے ہر حصے میں ڈھائی ڈھائی سو راتوں کا اور چوتھے حصے میں دو سو اکیاون راتوں کا بیان ہے۔ ڈاکٹر جین کے مطابق ''اس میں عبدالکریم اور گالاں والی کہانیاں ہیں، (نیز) اس کی زبان مرصّع اور مسجّع ہے۔''[۶]

(۴) الف لیلہ نومنظوم: یہ 'الف لیلہ' کا پہلا اور غالباً واحد منظوم اردو ترجمہ ہے۔ نام میں لفظ ''نو'' کا غیر ضروری بلکہ خلافِ واقعہ اضافہ حسابِ جمل کے تقاضوں پر مبنی ہے، جس کے نتیجے میں اس کے اعداد کا مجموعہ ۱۲۷۸ (بارہ سو اٹھتر) ہو جاتا ہے۔ یہ اس ترجمے کا سالِ آغاز ہے۔ تکمیل ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں ہوئی اور اشاعت اس کے ایک

سال بعد ۱۸۶۹ء میں مطبع نول کشور، لکھنؤ سے عمل میں آئی۔ ڈھائی ڈھائی سو راتوں کے بیان پر مشتمل اس کے چار حصوں میں سے پہلا حصہ مرزا اصغر علی نسیم دہلوی نے، درمیانی دو حصے منشی طوطا رام شایاں نے اور چوتھا حصہ شادی لال چمن نے نظم کیا ہے۔ جین صاحب کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ''اس میں عبدالکریم والی سب کہانیاں (شامل ہیں) اور دو کہانیاں مزید ہیں۔''[۷]

پیش کردہ تفصیلات کے مطابق عبدالکریم کا ترجمہ فارسٹر کے انگریزی ترجمے کے واسطے سے گالاں کے فرانسیسی ترجمے کا نقشِ ثانی ہے، جب کہ 'ہزار داستاں' اور 'الف لیلہ نو منظوم' کے مترجمین نے عبدالکریم کے واسطے سے گالاں کا تتبع کیا ہے۔ 'شبستانِ سرور' کا معاملہ اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ سرور کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے براہِ راست عربی سے ترجمہ کیا ہے، جین صاحب کی نگاہ میں مشکوک ہے، لیکن اپنے اس شک کے اظہار کے لیے انھوں نے صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ ''سمجھ میں نہیں آتا انھیں ان کہانیوں کا کون سا عربی ایڈیشن دستیاب ہو سکا۔ ممکن ہے کہ انھوں نے عبدالکریم کی 'الف لیلہ' پر تکیہ کیا ہو۔''[۸] جین صاحب کا یہ بیان اس اعتبار سے ناقص ہے کہ عبدالکریم کا اصل ماخذ یعنی گالاں کا ترجمہ بہرحال عربی متن پر مبنی ہے اور ایسے کسی عربی مخطوطے تک جو گالاں کے ماخذ کے عین مطابق ہو، بعد کے کسی مترجم کی رسائی ناممکنات سے نہیں، اس لیے صحیح اور فیصلہ کن نتیجے تک پہنچنے کے لیے ان دونوں ترجموں کے وسیع تر تقابلی مطالعے کی ضرورت تھی جسے محترم محقق نے یک سر نظر انداز کر دیا۔

جین صاحب کے برخلاف پروفیسر نیر مسعود نے اس سلسلے میں نسبتاً زیادہ غور و فکر سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اولاً سرور کا یہ بیان نقل کیا ہے:

> ''(اس) عاجزِ ہیچ مداں..... نے مجموعۂ لاجواب، دفتر عالم میں انتخاب مسمّٰی الف لیلہ ولیلہ کا زبانِ عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور بہ فرمائش و پاسِ خاطر..... جناب مولوی محمد یعقوب صاحب انصاری لکھنوی بہ عبارتِ مسجّع و مقفّٰی لکھا ہے۔''

بعدازاں ان کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''سرورؔ کا یہ ادّعا کہ انھوں نے 'الف لیلہٰ' کا زبانِ عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے، غالباً صرف اپنی تالیف کو زیادہ باوقار بنانے کے لیے ہے، کیوں کہ 'شبستانِ سرور' کے اندر ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوجاتا ہے کہ سرورؔ کا ماخذ عربی 'الف لیلہٰ' نہیں بلکہ اس کے انگریزی ترجمے کا کوئی اردو ترجمہ تھا، مثلاً جابجا ''بصرہ'' کو ''بانسرہ'' اور ''قاہرہ'' کو ''کیرو'' لکھا ہے۔''[9]

اپنے اس موقف کی تائید میں نیر صاحب نے مندرجہ ذیل مثالیں پیش فرمائی ہیں:

(۱) ''میں نے رورو کے بہ منت کہا کہ یہ سیب میرا باپ بانسرے جاکے.....لایا ہے۔'' (جلداول، ص۱۰۴)

(۲) ''بانسرے کا وزیراعظم شہر کی حقیقت، رعیت کی کیفیت دیکھنے کو نکلا تھا۔ نورالدین کو دیکھا۔ اجنبی.....سمجھ کے قریب بلایا، استفسارِ حال فرمایا۔ اس نے کہا: مصری ہوں، کیرو مولد ہے۔'' (جلداول، ص۱۰۷)

(۳) ''ماہی گیر نے دریائے ٹکرس کے کنارے پہنچ کے جال پھینکا۔'' (جلداول، ص۱۰۲)

''بانسرہ'' اور ''کیرو'' نیر صاحب کے مطابق ''بصرہ اور قاہرہ کے انگریزی تلفظ ہیں'' اور ٹگرس ''دجلہ کا انگریزی نام ہے۔'' اگر سرورؔ نے واقعی عربی سے ترجمہ کیا ہوتا تو اس ترجمے میں ان انگریزی الفاظ کی باریابی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ نیر صاحب نے اپنے اس استدلال کو مزید تقویت پہنچانے کی غرض سے ایک اور دلچسپ مثال باتونی حجام کے پانچویں بھائی کی کہانی سے پیش فرمائی ہے۔ سرورؔ نے اس کہانی میں حجام کے بھائی کا نام ''النسچر'' لکھا ہے۔ نیر صاحب کے مطابق ''اس کا عربی نام 'النشار' ہے۔ النسچر

(Alnaschar)اس کا انگریزی تلفظ ہے ورنہ عربی میں 'چ' کہاں؟''[۱۰]

ان انکشافات کے بعد یہ مسئلہ تو حتمی طور پر طے ہو جاتا ہے کہ سرورؔ کا یہ ترجمہ ان کے دعوے کے علی الرغم 'الف لیلہٰ' کے اصل عربی متن کے بجائے اس کے کسی انگریزی ترجمے سے مستفاد اردو متن پر مبنی ہے، لیکن یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ مطلوبہ صفات سے متصف وہ کون سا اردو ترجمہ ہے جسے سرورؔ نے اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا ہے۔ اس سوال کے حل کے لیے ضروری تھا کہ 'شبستانِ سرور' سے قبل وجود میں آنے والے گنتی کے پانچ چھے ترجموں میں سے کم از کم ان ایک دو ترجموں کا بالاستیعاب مطالعہ کر لیا جاتا جو زیادہ معروف اور سہل الحصول تھے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر جین نے بھی جو داستانوں پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں، اس شبہے کے اظہار کے باوجود کہ ممکن ہے سرورؔ نے عبدالکریم کے ترجمے پر تکیہ کیا ہو، اس مسئلے کی طرف پوری سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسے حسنِ اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ راقم السطور نے جب تحقیق کے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی غرض سے متوقع مآخذ کی تلاش شروع کی تو سب سے پہلے عبدالکریم کے ترجمے تک ہی رسائی حاصل ہوئی اور اس کی سرسری ورق گردانی ہی نے دوسرے ترجموں کی طرف رجوع سے بے نیاز کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں یہ ترجمہ دوسرے تمام ترجموں کی بہ نسبت زیادہ مقبول تھا، چنانچہ اس کے بعد کا کوئی ترجمہ ایسا نہیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے اس سے متاثر نہ ہو۔ 'شبستانِ سرور' ان میں سرفہرست ہے۔ سرورؔ نے واقعات تو عبدالکریم کے ترجمے سے اخذ کیے ہیں لیکن داستان نویسی اور انشا پردازی کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر انھیں اپنے انداز سے اور اپنے الفاظ میں بیان کر کے دونوں ترجموں کے درمیان ایک واضح خطِ فاصل قائم کر دیا ہے۔ اس طرح انھوں نے بہ ظاہر اس حقیقت کی پردہ پوشی کی کوشش کی ہے کہ وہ عبدالکریم کے خوشہ چین ہیں، لیکن مشرقِ وسطیٰ کے جغرافیے اور اعلام سے ناواقفیت کے معاملے میں عبدالکریم کی ہم طرحی کی وجہ سے وہ اخفائے حال کے اس منصوبے میں پوری طرح ناکام رہے ہیں۔ نیر صاحب نے ان کی اس ناکامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی کتاب میں اس کے جو ثبوت فراہم کیے ہیں، ان کا مقابلہ عبدالکریم کے بیانات سے کیا جائے تو یہ

حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ الفاظ اور پیرایۂ بیان کے فرق کے باوجود عبدالکریم اور سرور کے ان ترجموں میں اصل و نقل کی نسبت ہے۔

(۱) نیر صاحب نے 'شبستانِ سرور' سے جو پہلا اقتباس نقل کیا ہے، وہ درجِ ذیل ہے:

''میں نے رو رو کے بہ منّت کہا کہ یہ سیب میرا باپ بانسرے .....جا کے لایا ہے۔''

یہ مکالمہ مقتول بی بی اور اس کے شوہر کے قصے سے ماخوذ ہے۔ اس میں اس بی بی کے بیٹے کے ہاتھ سے ایک حبشی غلام کے سیب لے کر بھاگ جانے اور اس پر اس بچے کے ردِعمل کا ذکر کیا گیا ہے۔ عبدالکریم نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

''میں نے رو رو کر کہا کہ میرا باپ دو ہفتے کا سفر کر کے میری ماں بیمار کے واسطے لایا ہے۔'' (نسخۂ مطبوعہ ۱۸۷۸ء، ص ۱۲۷)

یہاں دو ہفتے کے اس سفر کے سلسلے میں بانسرے کا حوالہ موجود نہیں، لیکن اس سے پہلے مقتولہ کا شوہر اس کی وضاحت اس طرح کر چکا ہے:

''میں نے اپنی بی بی کی خاطر قصد بانسرے کا کیا اور.....تین سیب، فی دانہ ایک ریال دے کر مول لیے۔'' (ایضاً، ص ۱۲۶)

(۲) شہادتوں کے اس سلسلے کا دوسرا اقتباس یہ ہے:

''بانسرے کا وزیر اعظم شہر کی حقیقت، رعیت کی کیفیت دیکھنے کو نکلا تھا۔ نورالدین کو دیکھا۔ اجنبی.....سمجھ کے قریب بلایا۔ استفسارِ حال فرمایا۔ اس نے کہا: مصری ہوں، کیرو مولد ہے۔''

عبدالکریم نے وزیر اعظم اور نورالدین کی اس ملاقات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''وزیر اعظمِ بادشاہِ بانسرہ.....واسطے ملاحظۂ حال نیک و بد اہل شہر کے آیا تھا..... جب سواری اس کی نزدیک نورالدین کے پہنچی.....

پوچھا کہ تو کون ہے اور کدھر سے آتا ہے؟ نورالدین علی نے کہا:
خداوند! میں مصری ہوں اور کیرو میرا مولد ہے۔'' (ایضاً، ص ۱۳۰)

(۳) تیسرا اقتباس حسب ذیل ہے:

''(ماہی گیر نے) دریائے ٹکرس کے کنارے پہنچ کے جال پھینکا۔''

عبدالکریم نے یہ بات اس طرح کہی ہے:

''ماہی گیر نے..... دریائے ٹکرس کے کنارے جال کو کھولا۔''

(ایضاً، ص ۱۲۴)

اس سلسلے کی آخری شہادت کے طور پر نیر صاحب نے حجام کے پانچویں بھائی کے نام ''النسچر'' کا حوالہ دیا ہے۔ عبدالکریم نے بھی اس کا ذکر اسی نام سے کیا ہے۔ اس کے ہاں اس قصے کا عنوان ہی ''قصہ حجام کے پانچویں بھائی کا جس کا نام النسچر تھا'' ہے۔

ان شواہد کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ 'شبستانِ سرور' کی تالیف کے وقت مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کے سامنے عبدالکریم کے 'ترجمۂ الف لیلہ' کے علاوہ اس سلسلے کی کوئی اور کتاب موجود نہ تھی، کیونکہ 'شبستانِ سرور' سے قبل اردو میں 'الف لیلہ' کے جتنے ترجمے ہو چکے تھے، دستیاب معلومات کے مطابق ان میں یہ واحد ترجمہ ہے جو کتاب کے اصل عربی متن کی بجائے اس کے ایک انگریزی ترجمے پر مبنی ہے۔

مولوی عبدالکریم مرزا غالبؔ کے ''مخلصِ صادق الولا'' مولوی سراج الدین احمد کے چچا تھے۔ ان کا آبائی وطن لکھنؤ تھا لیکن سرکاری ملازمت کے سلسلے میں ان کی عمر کا بڑا حصہ کلکتے میں بسر ہوا۔ غالبؔ جس زمانے میں اپنے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں کلکتے میں مقیم تھے، مولوی صاحب موصوف گورنر جنرل کے دفتر خانۂ فارسی میں میر منشی کی حیثیت سے برسرِ کار تھے۔ اس دفتر میں فارسی میں جو درخواستیں موصول ہوتی تھیں، انھیں انگریزی میں ترجمہ کر کے حکّامِ بالا کی خدمت میں پیش کرنا ان کی اصل منصبی ذمہ داری تھی۔ ظاہر ہے کہ انگریزی کی اچھی استعداد کے بغیر یہ کام ممکن نہ تھا۔ انگریزی کی اس اضافی لیاقت کے علاوہ وہ اپنے زمانے کے معیارِ علم کے مطابق عربی سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ اس کا اندازہ

ان کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ کلکتے کے زمانۂ قیام میں وہ شیخ احمد یمنی کی شائع کردہ عربی 'الف لیلہ' (مطبوعہ ۱۸۱۴ء و ۱۸۱۸ء) کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے لیکن کتاب کے حصول میں ناکامی کی وجہ سے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد جب وہ لکھنؤ میں خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے تو انھیں اتفاق سے اس کتاب کا ایک انگریزی ترجمہ دستیاب ہوگیا اور اس طرح اس دیرینہ شوق کی تکمیل ہوگئی جسے وہ کلکتے میں پورا نہ کر پائے تھے۔ کتاب کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے دو سال میں اردو میں اس کا ترجمہ کر ڈالا۔ دیباچے میں ترجمے کے اس پس منظر، اس کی مقبولیت اور طباعت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''راقمِ اثیم کو کہ معروف بہ منشی عبدالکریم ہے، ابتدائے شعور سے کمال شوق دیکھنے کتابوں قصے کہانی کا تھا اور سب قصوں میں تمنا الف لیلہ کی زیادہ رہتی تھی اور وہ عربی میں الف لیلہ ولیلہ یعنی ایک ہزار ایک رات ہے۔ جس وقت راقم بیچ دارالامارۃ کلکتہ کے عہدۂ جلیلۂ میر منشی گری دفتر فارسی نواب گورنر جنرل بہادر سے سرفراز تھا، وہ کتاب سوا دوسو رات کی کہ جس کو شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے واسطے پڑھانے صاحبانِ عالی شان کالج کلکتہ کے بہ کمالِ تلاش عرب سے منگوا کر چھپوایا تھا، میسر نہ آئی۔ آخر کار جب راقم بہ سبب شدتِ امراض کے بعد تقرر پینشن بیت السلطنت لکھنؤ میں کہ مولد اپنا ہے، خانہ نشین ہوا، وہ نسخہ تمام وکمال انگریزی زبان میں مع تصویرات بہم پہنچا۔ راقم نے اس کو اول سے آخر تک بہ سبب استعداد سمجھنے زبانِ انگریزی کے دیکھا۔ ازبس کہ قصے دلچسپ تھے، دو برس تک اس کا ترجمہ کرتا رہا اور سنہ بارہ سو اٹھاون ہجری میں تمام کیا۔ شہر میں شہرہ ہوا۔ اکثر لوگوں نے منگوا کر نقل اس کی لی۔ کم تر مسودہ راقم کے گھر رہا، دست بہ دست پھرا کیا، چنانچہ پانچ سات جزو تلف ہوئے۔ راقم کو اس کے لکھنے

میں دوبارہ تکلیف کرنا پڑی اور طلب کرنے احباب کے سے نہایت تنگ آیا۔ جس کو نہ دیتا، وہ خفا ہوتا اور دینے میں اپنی کتاب سے ہاتھ دھوتا۔ آخر کو خیال ہوا کہ یہ کتاب چھپ جائے، تا سب کے ہاتھ آئے اور راقم بھی ایک ایک نسخہ اس کا عزیزوں اور دوستوں کو بانٹے۔ فقط اسی واسطے راقم نے جس طرح ہوسکا، بیچ عہدِ دولت مہد پادشاہِ جم جاہ.....محمد امجد علی شاہ.....اور وزارتِ وزیر اعظم نواب.....امداد حسین خاں بہادر..... کے چھپوایا اور سنہ ہجری طبع اس کتب کے بارہ سو تریسٹھ اور عیسوی اٹھارہ سو سینتالیس ہیں۔''[11]

عبدالکریم کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ 'الف لیلہٰ' کے انگریزی ترجمے کا جو نسخہ ان کے پیشِ نظر تھا، وہ باتصویر تھا اور انھیں ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء سے دو ڈھائی برس قبل دستیاب ہوا تھا۔ جین صاحب کی تحریر کے مطابق یہ فارسٹر کا ترجمہ تھا جس کی اولین اشاعت کا سال ۱۸۰۲ء ہے، لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہوسکا ہے، ۱۸۰۲ء کا یہ پہلا ایڈیشن مصوّر نہ تھا۔ اس کے بعد اس کے کئی اور ایڈیشن شائع ہوئے جن میں جی. موائر بسی (G. Moir Bussey) کی نظرِ ثانی و اصلاح اور مفصل تعارفی مقدمے کے ساتھ ۱۸۳۹ء میں لندن سے شائع شدہ ایڈیشن غالباً سب سے قدیم ہے۔ اس ایڈیشن میں آر سمر کے (R. Smirke) کی تیار کردہ چوبیس تصویریں بھی شامل تھیں۔ قوی امکان یہ ہے کہ عبدالکریم نے اسی ایڈیشن سے استفادہ کیا ہوگا۔

سرورؔ نے 'الف لیلہٰ' کے ترجمے کا کام، بہ قولِ خود، لکھنؤ میں انگریزی عمل داری کے قیام (۷/فروری ۱۸۵۶ء/ ۲۹/جمادی الاول ۱۲۷۲ھ) کے بعد شروع کیا تھا لیکن ابھی چھے سات جز ہی لکھ پائے تھے کہ حالات کی نامساعدت کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، تا آں کہ جولائی ۱۸۵۹ء/ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ میں مہاراجا ایشری پرشاد نرائن سنگھ کی دعوت پر وہ لکھنؤ سے بنارس چلے آئے۔ یہاں کے زمانۂ قیام میں انھوں نے بعض نئے کاموں کے ساتھ اپنے کئی ادھورے کام بھی مکمل کیے۔ ان میں اس ترجمے کی تکمیل بھی شامل ہے۔ سرورؔ

۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء میں اس کام سے فارغ ہوئے اور مسوّدے پر نظرِ ثانی کے بعد ۲۱؍رجب ۱۲۸۰ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۶۴ء کو انھوں نے ایک ہبہ نامے کے ذریعے اس کا حقِ تالیف اپنے دوست مولوی محمد یعقوب انصاری کے نام منتقل کر دیا۔ مولوی صاحب موصوف نے اس کے تییس (۲۳) سال بعد ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں اسے اپنے مطبعِ نجم العلوم، کارنامہ، واقع لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہی اس ترجمے کا پہلا اور آخری ایڈیشن ہے۔

اب یہ معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ مولوی عبدالکریم ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں اپنے ترجمے کی اشاعتِ اول کے بعد کب تک زندہ رہے، البتہ غالبؔ کے ایک خط موسومہ منشی شیونرائن آرامؔ، مورخہ ۴؍جنوری ۱۸۵۹ء کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۹ء سے قبل وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اپنے ماخذ کے بارے میں سرورؔ کی غلط بیانی کے پیشِ نظر یہ شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے انھوں نے اس ترجمے کی تکمیل و اشاعت کو مصلحتاً موخر کر دیا ہو، کیونکہ مولوی عبدالکریم کے ترجمے سے استفادے کے بعد ان کی زندگی ہی میں سرورؔ کا اپنے ترجمے کو منظرِ عام پر لے آنا اس لحاظ سے خطرے سے خالی نہ تھا کہ اگر مولوی صاحب کو اس کا علم ہو جاتا اور وہ ان کہانیوں سے اپنی دلچسپی کے باعث اور انھیں انگریزی سے اردو میں منتقل کرنے کی دوسالہ مشقّت کے پیشِ نظر اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے تو یہ بات ان سے مخفی نہ رہتی کہ سرورؔ نے دیدہ و دانستہ ان کے ترجمے کا چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ان کا سرقے کے الزام سے بچ پانا مشکل ہو جاتا۔ صورتِ حال کچھ بھی رہی ہو، مجملاً واقعہ یہ ہے کہ 'شبستانِ سرور' مولوی عبدالکریم کے 'ترجمۂ الف لیلہ' سے ماخوذ ہے اور سرورؔ نے اس کے متعلق یہ دعویٰ کر کے کہ انھوں نے براہِ راست عربی سے ترجمہ کیا ہے، صریحاً سخن سازی بلکہ دروغ گوئی یا غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

حواشی

۱ الف لیلہ کے انگریزی تراجم اور ان کے مختلف ایڈیشنوں سے متعلق معلومات کے لیے راقم السطور جناب عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے تعاون کا رہینِ منت ہے۔

۲،۳ اردو کی نثری داستانیں: از ڈاکٹر گیان چند جین، شائع کردہ یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۷ء، ص ۶۲۱

۴ ایضاً، ص ۶۲۲

۵ ایضاً، ص ۵۶۹

۶، ۷، ۸ ایضاً، ص ۶۲۳

۹ رجب علی بیگ سرور، حیات اور کارنامے: شائع کردہ شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، ۱۹۶۷ء، ص ۲۹۵

۱۰ ایضاً، ص ۲۹۶

۱۱ جلد پہلی ترجمۂ الف لیلہ، مطبعِ مصطفائی، کان پور، ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء، ص ۴، ۵

(شش ماہی 'غالب نامہ'، نئی دہلی، شمارہ جولائی ۲۰۰۴ء
وسہ ماہی 'صحیفہ'، لاہور، شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء)

غالبؔ اور عیوبِ قوافی

مندرجۂ بالا عنوان کے تحت جناب منصور عمر (استادِ شعبۂ اردو، سی۔ ایم۔ کالج، دربھنگا) کا ایک مختصر مضمون ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے ۱۵؍نومبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، جس میں ''غالبؔ کے قارئین، ناقدین اور ماہرینِ عروض و بلاغت'' سے یہ استفسار کیا گیا تھا کہ ''غالبؔ کی مشہور غزل ''دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا'' میں ''تسلی'' اور ''راضی'' کا قافیہ ''تقویٰ'' اور ''عیسیٰ'' کہاں تک درست ہے؟'' جیسا کہ اس سوال سے از خود واضح ہے، مضمون نگار کا موقف یہ تھا کہ غالبؔ نے متذکرہ غزل میں یہ دونوں قافیے نظم کر کے غلطی کی ہے۔ بعد کے شماروں میں ان کے اس خیال کی تردید اور غالبؔ کے موقف کی حمایت میں کئی مراسلے شائع ہوئے لیکن وہ منصور عمر صاحب کو مطمئن نہیں کر سکے۔ حق یہ ہے کہ ان مراسلات میں صحیح علمی تناظر میں اصل مسئلے کے تجزیے اور تفہیم سے زیادہ غالبؔ کی طرف داری کا پہلو نمایاں تھا اور فاضل مضمون نگار نے اپنے جوابی مراسلوں میں ان کی خامیوں اور کمزوریوں کی جو گرفت کی ہے، وہ بڑی حد تک درست ہے۔ چنانچہ کئی ماہ تک چلنے والے اس طویل مباحثے کے باوجود یہ سوال کہ ''تقویٰ'' اور ''عیسیٰ'' کو ''تسلی'' اور ''راضی'' کا قافیہ بنایا جا سکتا ہے یا نہیں، اپنی جگہ برقرار ہے۔

ہمارے خیال میں یہاں متذکرۂ بالا تمام جوابی تحریروں کو موضوعِ بحث بنانے اور

ان میں پیش کردہ دعووں اور دلیلوں پر گفتگو کرنے کی بجائے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ براہِ راست اصل سوال پر غور کیا جائے کہ اصولی اور روایتی طور پر ''تسلی'' اور ''راضی'' وغیرہ کے ساتھ ''تقویٰ'' اور ''عیسیٰ'' کو بہ طورِ قافیہ نظم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ غالبؔ نے یہ قافیے ایک ہی غزل کے جن اشعار میں استعمال کیے ہیں، وہ درجِ ذیل ہیں:

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی — گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ — نا توانی سے حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

موضوع کی مناسبت سے یہاں اسی سلسلے کے ایک اور لفظ ''کیلیٰ'' کو بھی شاملِ بحث کر لینا بے محل نہ ہوگا۔ غالبؔ نے اپنی ایک اور غزل میں اسے ''تسلی'' اور ''شادی'' وغیرہ کے ساتھ بہ طورِ قافیہ نظم کیا ہے۔ اس غزل کا مطلع اور وہ شعر جس میں ''لیلی'' بہ طورِ قافیہ آیا ہے، درجِ ذیل ہے:

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا — گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلی نہ سہی

امرِ واقعہ یہ ہے کہ ''تقویٰ'' اور ''عیسیٰ'' اور اس قبیل کے ان تمام الفاظ کو جو ''ی'' کے ساتھ لکھے اور ''الف'' کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، یائے معروف کے ساتھ پڑھنا اور نظم کرنا از روے لغت بھی جائز ہے اور روایتاً بھی درست سمجھا جاتا رہا ہے۔ لفظ ''تقویٰ'' کے بارے میں صاحبِ 'غیاث اللغات' کا بیان ہے:

''بہ فتحِ اول و فتحِ واؤ۔ در استعمالِ فارسیاں گاہے بہ کسرِ واؤ نیز مستعمل''

مراد یہ ہے کہ اس لفظ کا اصل تلفظ اگرچہ ''تقویٰ'' ہے لیکن فارسی والے کبھی کبھی واؤ کے کسرے کے ساتھ یعنی ''تقوی'' بھی لکھتے رہے ہیں۔

''عیسیٰ'' اور ''موسیٰ'' کا حوالہ اسی لغت میں حرف ''الف' کی تفصیلات کے تحت موجود ہے۔ مولّف نے ''الف'' کی چوبیس قسمیں بتائی ہیں۔ ان میں سے بائیسویں

قسم ''الفِ مجہول الاصل'' کی ہے۔اس کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ ''ایں را بہ یا نویسند۔ گاہے فارسیاں ایں الف را بہ اعتبارِ صورتِ کتابت یا خوانند، چوں موسی وعیسی'' یعنی اس الف کو ''ی'' کی صورت میں لکھا جاتا ہے لیکن فارسی والے کبھی کبھی کتابت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے ''ی'' کے طور پر بھی پڑھتے ہیں مثلاً موسی وعیسی۔

فارسی کے مستند اور ممتاز شعرا اس قسم کے تمام الفاظ کو جن کا اوپر کی مثالوں میں ذکر کیا گیا ہے، اپنی ضرورت یا صواب دید کے مطابق بلا تکلف یائے معروف کے ساتھ پڑھتے اور لکھتے رہے ہیں اور ان پر اس سلسلے میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کبھی کوئی اعتراض وارد نہیں کیا گیا۔ بہ طورِ مثال عہدِ شاہ جہانی کے ملک الشعرا ابو طالب کلیم کاشانی کی ایک غزل کے یہ اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں:

بدل کر دم بہ مستی عاقبت زہد ریائی را — رسانیدم بہ آب از یمنِ مے بنیادِ تقوی را
زسینہ ایں دلِ بے معرفت رامی کنم بیروں — چرا بے ہودہ گیرم در بغل مینائے خالی را
گذشتن از جہاں ناید بہ پائے ہمتِ ہر کس — نباشد ہیچ معجز بہتر از تجرید عیسی را
بود آرائشِ معشوق حالِ درہمِ عاشق — سیہ روزیِ مجنوں سرمہ باشد چشمِ لیلی را

دو مصرع در سبک روحی کلیم آں طور می باید
کہ در پروازِ شہرت بال باشد مرغِ معنی را

اسی زمین میں مرزا صائب اصفہانی نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

صفائے ساعدت نیلی شمارد دستِ موسی را — بنا گوشِ تو سازد تازہ ایمانِ تجلی را
ندارد شکرے در چاشنی گردونِ مینائی — بہ حرف وصوت می دارد نگہ آئینہ طوطی را
بہ چندیں سوزنِ الماس حیرانست مژگانش — کہ از پائے کہ بیروں آورد خارِ تمنی را
بحمد اللہ نہ مردم آں قدر کز گردشِ دوراں — قدح در دست، مینا در بغل دیدیم تقوی را

دراں کشور کہ گردد گوہر افشاں خامۂ صائب
رگِ ابرِ بہاراں طے کند طومارِ دعوی را

بحر کی تبدیلی کے ساتھ انھی قوافی اور اسی ردیف میں صائب کے یہ اشعار بھی

ملاحظہ طلب ہیں:

لب مے گونِ تو خمّار کند تقوی را　　چشمِ بیمارِ تو آرد بہ زمیں عیسی را
سرو بسیار بہ رعنائیِ خود می نازد　　جلوۂ سرکن و کوتاہ کن ایں دعوی را
حرف وصوتیست ہمیں حاصلِ اربابِ سخن　　ہیچ کس سبز نسازد سخنِ طوطی را
نقشِ معنی ننشیند اگر از قحطِ تمیز　　نتواں کرد ملامت قلمِ مانی را

عجبے نیست دلِ صائبؔ اگر رامِ تو شد
دانۂ خالِ تو در دام کشد وحشی را

شوکتؔ بخاری کا دیوان فی الوقت ہماری دسترس میں نہیں، اس لیے ایک ثانوی ماخذ کے حوالے سے اس بحث کے ضمن میں اس کے یہ دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

نگاہِ غیر از نظّارۂ خطّش تسلی شد　　زمرد مرہم زنگارِ زخمِ چشمِ افعی شد
ہنرمندانہ از قیدِ تعلق پاک کن خود را　　کہ سوزن جوہرِ آئینۂ تجریدِ عیسی شد

ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں فیضؔی کا جو مرتبہ ہے، اس سے اہلِ علم بہ خوبی واقف ہیں۔ اس کی مثنوی ''مرکزِ ادوار'' کی یہ بیت بھی فارسی کی اس عام روایت کی جس کے حوالے سطورِ بالا میں پیش کیے گئے ہیں، تائید کرتی ہے:

بستہ درِ گنج بہ مہرِ خفی　　دادہ کلیدش بہ کفِ مصطفیٰ

روایتی طور پر شعرائے فارسی کے معمولات ومختارات اردو والوں کے لیے سند کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے اگر غالبؔ نے اپنی محولۂ بالا غزلوں میں ان پر عمل کیا تو کسی قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اس کے علاوہ اس معاملے میں وہ یکہ وتنہا بھی نہیں۔ ان کے پیش رو اردو کے بزرگ شعرا میں مصحفیؔ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اردو اور فارسی کی طرح عربی زبان پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے اور اس میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔ ہماری محدود معلومات کے مطابق اگرچہ انھوں نے اپنے کسی شعر میں (غزلیات کی حد تک) ''تقویٰ'' یا ''عیسیٰ'' کو ''ساقی'' اور ''راضی'' وغیرہ کا قافیہ نہیں بنایا ہے تاہم ان کے ہاں اس زمرے کے کئی الفاظ کے یائے معروف کے ساتھ استعمال کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں ''موسیٰ'' کی بجائے ''موسی'' اور ''لیلیٰ'' کی بجائے ''لیلی'' کا استعمال ''عیسی''

کے جواز کے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے بھی اہم تر مثال ''تمنّا'' کی بجائے ''تمنّی'' کے استعمال کی ہے جس کی موجودگی میں ''تقوی'' کی صحت پر اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔اشعار یہ ہیں:

جو رنگ بدلے ٹک اس چرخِ آبنوسی کا — یہ رنگ کیوں ہو مرے اشکِ سندروسی کا
میں وہ نہیں ہوں کہ سر بر ہو مجھ سے خصمِ رکیک — کہ خامہ ہاتھ میں میرے عصا ہے موسی کا

(دیوانِ اول)

میں ہجر میں کب خونِ جگر پی نہیں رہتا — کیا کیجے کہ تجھ بن تو مرا جی نہیں رہتا
فریاد کناں آئے ہے مجنوں پسِ محمل — افتاد سے پر ناقۂ لیلی نہیں رہتا
کھولے ہے جہاں اپنا وہ مہ چاکِ گریباں — واں دل کوئی بے داغِ تمنّی نہیں رہتا

(دیوانِ چہارم)

''عیسی'' اور ''موسی'' کی صحت کے ثبوت میں یہ دلیل بھی دی جاسکتی ہے کہ مرکّبات کی صورت میں جب بھی یہ الفاظ بہ طورِ مضاف استعمال ہوتے ہیں تو ان پر الف پر ختم ہونے والے الفاظ کے قاعدۂ اضافت کا اطلاق نہیں ہوتا۔یعنی انھیں بہ طورِ مثال یاے اضافت کے اضافے کے ساتھ ''عیساے مریم'' یا ''موساے عمراں'' نہیں لکھا جاتا، حرفِ آخر کو مکسور کر کے ''عیسیِ مریم'' یا ''موسیِ عمراں'' لکھا جاتا ہے۔'ہفت بندِ کاشی' کی یہ بیت اس سلسلے میں سند کی حیثیت رکھتی ہے:

حاجب دیوانِ امرت موسیِ دریا شگاف — پردہ دارِ بامِ قصرت عیسیِ گردوں نشیں

اس قبیل کے الفاظ میں ''لیلیٰ'' فارسی واردو میں یاے معروف کے ساتھ نظم ہونے والا غالباً سب سے کثیر الاستعمال لفظ ہے۔انعام اللہ خاں یقینؔ نے جو مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے، اپنی ایک غزل میں اسے ''تسلی'' اور ''جدائی'' وغیرہ کا قافیہ بنایا ہے۔اس غزل کے دو شعر یہ ہیں:

مارے ہی جاتے ہیں آخر کوہکن سے سر چرے — خسروِ بے چارہ اور شیریں بچاری کیا کرے
چاہنے والے کے مرنے کو کوئی چاہے ہے کب — عشق ہی دشمن ہو مجنوں کا تو لیلی کیا کرے

انشاؔ نے اپنی ایک ریختی کے مندرجہ ذیل مطلع میں اسے ''کچیلی'' کے قافیے کے طور پر نظم کیا ہے:

ہم نے یہ دیکھا ہے اک میلی کچیلی کا دماغ ایڑیاں رگڑے جہاں مجنوں کی لیلی کا دماغ

اسی طرح شوقؔ لکھنوی نے مثنوی 'زہرِ عشق' کی مندرجہ ذیل بیت میں اسے ''پھیلی'' کے ساتھ ہم قافیہ کیا ہے:

بوے الفت تمام پھیلی ہے گو کہ اب قیس ہے نہ لیلی ہے

بہ طورِ مضاف اس کے استعمال کی مثال مرزا دبیرؔ کے ایک مرثیے کے مندرجہ ذیل بند کے تیسرے مصرعے میں دیکھی جا سکتی ہے:

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیِ زہرہ لقب ہوئی مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے

ترکیبِ اضافی کی یہی صورت جوشؔ کے مندرجہ ذیل شعر میں بھی پائی جاتی ہے:

لیلیِ آفاق الٹتی ہی رخ سے نقاب اور یاں عورت، مناظر، عشق، صہبا، انقلاب

سطورِ بالا میں پیش کردہ دلائل اور مثالوں سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ غالبؔ نے ''تسلّی'' اور ''راضی'' کے ساتھ ''تقوی'' اور ''عیسی'' یا ''لیلی'' کو بہ طورِ قوافی نظم کر کے لغت کی شہادت اور روایت کے تسلسل پر اعتبار کرتے ہوئے تلفظ کی ایک رعایت سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ ذاتی پسند و ناپسند کی بنا پر ان کے اس عمل سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اصولی طور پر اسے قابلِ اعتراض نہیں کہا جا سکتا۔

(منصور عمر صاحب نے اپنے مضمون میں قافیے کے صرف ایک عیب سے بحث کی ہے۔ اس اعتبار سے اس کا عنوان ''غالبؔ اور قوافی کا ایک عیب'' یا ''غالبؔ اور قافیے کا ایک عیب'' ہونا چاہتے تھا۔ راقم نے اس احساس کے باوجود 'ہماری زبان' میں شائع شدہ اس سلسلے کی تحریروں سے اپنے ان معروضات کا ربط قائم رکھنے کی غرض سے اصل عنوان کو علیٰ حالہ برقرار رکھا ہے۔)

(ہفت روزہ 'ہماری زبان'، شمارہ ۲۲/ مارچ ۱۹۹۰ء)

مرزا دبیر

(شعرائے اردو کے تذکروں میں)

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت میر تقی میرؔ کے تذکرے 'نکات الشعرا' سے شروع ہوتی ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس کے بعد سے ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں اردو کی پہلی ادبی تاریخ 'آبِ حیات' کی اشاعت تک کے خاصے طویل زمانے کو بجا طور پر تذکرہ نگاری کا دور کہا جا سکتا ہے۔ سوا سو سال سے زائد کی اس درمیانی مدت میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں شعرائے اردو کے جو تذکرے لکھے گئے انھوں نے اردو میں ادبی تاریخ نویسی، سیرت نگاری اور نقدِ شعر کے آغاز اور فروغ کی راہیں ہموار کیں اور ایسے بے شمار شاعروں کو بے نام و نشاں ہونے سے بچا لیا جو بہ صورتِ دیگر قعرِ گم نامی میں کھو گئے ہوتے اور اس کے نتیجے میں تاریخِ ادب کی بہت سی کڑیاں منتشر ہو گئی ہوتیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تذکرے مختلف معروف و غیر معروف شاعروں کے بارے میں جو گراں قدر معلومات فراہم کرتے ہیں اور ادبی روایات و اقدار کے نقطۂ نظر سے حال کا رشتہ ماضی کے ساتھ استوار کرنے میں ان کا جو کردار رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ان سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ تذکروں کی اہمیت

وافادیت کے اس اعتراف کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ تذکرہ نگاروں نے عام طور پر غزل گوئی کو اصل شاعری تصور کرتے ہوئے صرف غزل گو شعرا کے تعارف سے سروکار رکھا ہے اور دوسری اصنافِ سخن کو ذیلی و ضمنی حیثیت دے کر ان کے نمائندہ فن کاروں کو نظر انداز کر دینے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان تذکروں میں قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ جیسی معروف اور اہم اصنافِ ادب میں نمایاں حیثیت رکھنے والے شعرا میں سے صرف وہی شاعر جگہ پا سکے ہیں جو غزل گوئی کے میدان میں بھی اپنی طبّاعی کے جوہر دکھانے میں معاصر شعرا سے پیچھے نہیں رہے ہیں یا جنھوں نے مقدار و معیار سے قطعِ نظر اس صنف میں بھی کلام کے کچھ نمونے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ، انیسؔ کے بعد اردو کے دوسرے بڑے مرثیہ گو شاعر ہیں، جن کے کلام کا مطالعہ مختلف فکری، فنی اور لسانی زاویوں سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اس اعتبار سے اردو کی ادبی تاریخ میں ایک مستقل اور ناگزیر موضوعِ بحث کی حیثیت رکھتا ہے۔ دبیرؔ ۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ مطابق ۲۹/ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے، لیکن کم سنی ہی میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ دہلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہیں رواجِ زمانہ کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہیں تقریباً بارہ سال کی عمر میں انھوں نے شاعری کی ابتدا کی اور میر مظفر حسین ضمیرؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ یہیں انھوں نے مختلف ادبی معرکے سر کر کے اساتذہ اور معاصرین سے اپنی پختہ گوئی اور قادرالکلامی کا لوہا منوایا، یہیں سے ان کی شہرت ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلی اور بالآخر ۲۹/ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۹/ مارچ ۱۸۷۵ء کو اسی خاک کی آغوش میں ابدی نیند سو کر انھوں نے اپنی داستانِ حیات کا آخری باب مکمل کیا۔

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کی مشہور تصنیف 'فسانۂ عجائب' کا پہلا ایڈیشن ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں مطبعِ حسینی میں چھپ کر شائع ہوا، لیکن اس کا نقشِ اوّل ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں تیار ہو چکا تھا۔ اس کتاب میں 'بیانِ لکھنؤ' کے تحت سرورؔ نے جن مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے، ان میں دلگیرؔ، ضمیرؔ، خلیقؔ اور فصیحؔ وغیرہ کے ساتھ دبیرؔ کا نام بھی شامل ہے۔

قرائن کے مطابق یہ اندراج ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) یا اس کے معاً بعد کے تین چار برسوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر یہ قیاس غلط نہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) کے آس پاس دبیرؔ مرثیہ گو کی حیثیت سے لکھنؤ کے نام بر آوردہ شعرا میں شمار ہونے لگے تھے۔ 'فسانۂ عجائب' کے دیباچے ہی میں سرورؔ نے مرزا محمد رضا برقؔ کے ہاں ہر مہینے شبِ ماہ میں صحبتِ مشاعرہ کے انعقاد کا ذکر کیا ہے۔ مرزا کلب حسین خاں نادرؔ اور سید افضل حسین ثابتؔ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ دبیرؔ اس محفل میں شرکت کرتے تھے۔[۲] شہرت و ناموری اور مشاعروں میں شرکت کے متعلق ان باوثوق اطّلاعات کے باوجود ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء کے بعد لکھے جانے والے شعرائے اردو کے زیادہ تر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ اس کا سبب بہ ظاہر اس کے علاوہ کچھ اور نہیں معلوم ہوتا کہ دبیرؔ بنیادی طور پر مرثیے کے شاعر تھے جب کہ تذکرہ نگاروں کی محفل میں باریابی کے لیے غزل گوئی شرطِ اول کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگرچہ شروع میں انھوں نے غزلیں بھی کہی تھیں، جن کے چند اشعار اس زمانے کے بعض معتبر مآخذ میں محفوظ بھی رہ گئے ہیں، تاہم عام تذکرہ نگاروں کا ان کی غزل گوئی سے بے خبر رہنا اور اس لیے اپنے ہاں ان کا ذکر نہ کرنا کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں جسے غیر ذمہ داری یا بے اعتنائی کا نام دیا جا سکے۔ غلط یا صحیح، تذکرہ نگاروں نے اپنے لیے بعض حدیں مقرر کر رکھی تھیں۔ ان حدوں کے اندر رہتے ہوئے انھوں نے ادب کی جو خدمت انجام دی ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

'خوش معرکۂ زیبا' مؤلّفہ سعادت خاں ناصرؔ وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں دبیرؔ کا ذکر آیا ہے۔ 'خوش معرکۂ زیبا' تاریخی نام ہے جس سے اس تذکرے کا سالِ آغاز ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ اتمام ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں ہوا۔ متذکّرہ سالِ ہجری کتاب کے آخر میں درج مختلف شعرا کے قطعاتِ تاریخ سے اور سالِ عیسوی میر علی اوسط رشکؔ کے مستخرجہ مادۂ تاریخ 'تذکرۂ شرکا' سے معلوم ہوتا ہے۔[۳] اس تذکرے کو ہندوستان میں ڈاکٹر شمیم انہونوی نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے جولائی ۱۹۷۱ء میں اور پاکستان میں جناب مشفق خواجہ مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور سے اپریل ۱۹۷۰ء (جلدِ اول) و مارچ ۱۹۷۲ء (جلدِ دوم) میں شائع

کر چکے ہیں۔

تذکرے عام طور پر حروفِ تہجّی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیے گئے ہیں۔ ناصؔر نے اس کے برخلاف استادی وشاگردی کے رشتے کو ترتیب کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یعنی پہلے کسی مشہور استاد کا اور اس کے بعد اس کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ ابتدا مرزا محمد رفیع سوداؔ کے ذکر سے ہوئی ہے، جن تک خود مولّف کا سلسلۂ شاگردی منتہی ہوتا ہے۔ چونکہ تمام شعرا کا سلسلۂ تلمذ معلوم ہونا ممکن نہیں تھا، اس لیے تذکرے کو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حصّہ اول میں ان شاعروں کا ذکر ہے جن کی استادی وشاگردی کے سلسلے معلوم ہیں۔ دوسرا حصّہ ان شاعروں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے جن کی استادی وشاگردی کے متعلق معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ تیسرا حصّہ شاعرات سے متعلق ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے مرتّب کردہ نسخے کے مقدمے میں مختلف قلمی نسخوں میں شعرا کی کمی بیشی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی مجموعی تعداد آٹھ سو چوبیس متعیّن کی ہے۔[۴] موصوف کا بیان ہے کہ ''شعرائے لکھنؤ کے سلسلے میں 'خوش معرکۂ زیبا' سے بہتر کوئی ماخذ نہیں۔ ناصؔر نے اپنے ہم عصروں اور ان شعرا کے بارے میں جو اس سے کچھ عرصے قبل گزر چکے تھے، ایسی معلومات پیش کی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔''[۵] علاوہ بریں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول ''معاصرین میں چونکہ بہتوں سے ان کی ملاقات اور دوستانہ مراسم تھے، اس لیے ناصؔر کے بیانات ان کے سلسلے میں عینی شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں۔''[۶]

دبیرؔ کا ذکر اس تذکرے میں ان کے استاد میر مظفّر حسین ضمیرؔ کے فوراً بعد آیا ہے۔ ناصؔر نے تذکرہ نگاری کی روایت کے مطابق تخلص اور نام کے اندراج کے بعد دبیرؔ کی جودتِ طبع اور مضمون آفرینی کی تعریف کرتے ہوئے انھیں مرثیہ گوئی میں تمام شعرا سے سبقت لے جانے اور زمینِ سلام کو فکرِ بلند سے آسمان تک پہنچا دینے پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے اور ان کے استاد میر ضمیرؔ کے درمیان بےلطفی کی روداد اس طرح بیان کی ہے:

''استاد اور اس میں جو بےلطفی ہے، ایک بزرگ کی زبانی مختصراً اسے بیان کرتا ہوں۔ میاں دبیرؔ اوائل میں ایک مرثیہ اصلاح کے واسطے

میر ضمیرؔ کی خدمت میں لائے۔ کہیں کہیں اصلاح دی اور بہت پسند کیا، بلکہ فرمایا کہ یہ مرثیہ ہمیں دو کہ راجہ میوہ رام کے یہاں ہم پڑھیں۔ اس نے کہا کہ بہتر، میں بھیج دوں گا۔ دبیرؔ نے اس مرثیے کی دو نقلیں لیں، ایک بھیج دی اور ایک اپنے پاس رکھی۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ میر صاحب نے اس سے کہا کہ اس مرثیے کو راجہ میوہ رام کی مجلس میں نہ پڑھنا۔ قصہ کوتاہ جب مجلس کا دن آیا، میر صاحب مع دبیرؔ تشریف فرما ہوئے۔ مجلس کے گداز کرنے کو دبیر سے کہا: منبر پر جاؤ اور کچھ پڑھو۔ اس ناحق شناس نے سامعین کو ہمہ تن اشک دیکھ کر وہی مرثیہ پڑھا۔ رقّت اور تعریف ایسی ہوئی کہ میر ضمیرؔ کے پڑھنے کی گنجائش نہ رہی اور خاتمہ اسی پر ہوا۔" (جلدِ اول، ص ۵۲۴)

تذکرے کے ایک اور قلمی نسخے مخزونہ کتب خانۂ انجمن ترقیِ اردو، پاکستان کے مطابق دبیرؔ کے منبر سے اتر آنے کے بعد:

"میر ضمیرؔ نے راجہ کے کہنے سے دو چار بند کسی مرثیے کے پڑھے اور نہایت بے مزا منبر سے اترے۔ پڑھنا میوہ رام کی مجلس میں اور ملاقاتِ دبیرؔ کو برابر ترک کیا۔" (جلدِ اول، حاشیہ ص ۵۲۳)

دبیرؔ اور ضمیرؔ کے درمیان تعلقات کی ناخوش گواری سے متعلق اس واقعے کے بیان کو مشفق خواجہ نے 'خوش معرکۂ زیبا' کی اوّلیات میں شمار کیا ہے۔[۷] ناصرؔ کو اس اوّلیت کا فخر حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دبیر کا ذکر کرنے والے سب سے پہلے تذکرہ نگار ہیں۔ جہاں تک اصل واقعے کا تعلق ہے، اس کی صحت میں شبہے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ جزئیات کے فرق سے قطعِ نظر افضل حسین ثابتؔ (شاگردِ دبیرؔ) کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔[۸]

انتخابِ کلام کے تحت ناصرؔ نے سب سے پہلے ایک غزل کا یہ شعر اس صراحت کے ساتھ کہ "اکثر دوستوں سے اس کے نام پر سنا ہے"، نقل کیا ہے:

مے سے توبہ کی ستم گر نے، غضب تو دیکھو
جب کہ تیّار مری خاک سے پیمانہ ہوا

دبیرؔ سے قبل ضمیرؔ کے کلام کے تحت بھی اسی زمین میں ایک مطلع نقل کیا جا چکا ہے۔(ص۵۲۲) ممکن ہے استاد اور شاگرد دونوں نے ایک ہی طرح میں غزلیں کہی ہوں۔ ضمیرؔ کا مطلع یہ ہے:

تب میسر مجھے اک بوسۂ جانانہ ہوا
جب کہ میں خاک ہوا، خاک سے پیمانہ ہوا

دبیرؔ کے کلام میں غزل کے مندرجۂ بالا شعر کے بعد ایک سلام کے دس اشعار اور ایک رباعی نقل کر کے ناصرؔ نے ناظرین سے یہ معذرت کی ہے کہ:

''اور غزل مرزا صاحب کی ہر چند تلاش کی، بجز ایک شعر سابق دستیاب نہ ہوئی۔ بہ مجبوری سلام و رباعی تحریر ہوئے۔''

اس کے بعد ایک رباعی اور منقول ہے، جس کے مصرعِ اول ''بے فائدہ ہر بند پہ بتلاتا ہے'' کے حوالے سے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ''اس رباعی میں طعن ہے میر انیسؔ صاحب پر، کہ وہ اپنے پڑھنے (کے وقت) مرثیے پر ہر بند میں بتلاتے جاتے ہیں۔'' (جلدِ اول، ص۵۲۶)

سید محسن علی محسنؔ لکھنوی ناصرؔ کے بعد دوسرے تذکرہ نگار ہیں، جنھوں نے اپنے تذکرے 'سراپا سخن' میں دو جگہ دبیرؔ کا ذکر کیا ہے۔ 'سراپا سخن' خود مؤلّف کے بیان کے مطابق دس سال کی محنت کے بعد ۱۲۶۹ھ کے آغاز (۱۸۵۲ء) میں مرتّب ہوا۔ اس کے آٹھ برس بعد ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں مطبعِ منشی نول کشور، لکھنؤ سے پہلی بار اس کی اشاعت ہوئی۔ بعد ازاں ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء اور ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں اسی مطبعے سے اس کے دو ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۷ء میں ہندوستان میں ڈاکٹر سید سلیمان حسین اور ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں ڈاکٹر اقتدا حسن اس کی تلخیص بھی شائع کر چکے ہیں۔ تذکرے کے سببِ تالیف کے متعلق مؤلّف کا بیان ہے کہ جس زمانے میں وہ بہ سلسلۂ تجارت کان پور

میں مقیم تھے، ایک مرتبہ شیخ الٰہی بخش عشقی سے ملاقات کے دوران برسبیلِ تذکرہ ناسخ کا یہ مصرع سامنے آیا:

جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں

اور خیال ہوا کہ اگر اسی انداز سے سارے اعضاے جسمانی پر ناسخ کی غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان سراپا کے نام سے مرتب کر دیا جائے، لیکن ناسخ کی عمر نے وفا نہ کی۔ بعد ازاں محسن نے مختلف شعرا کا کلام جمع کر کے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ اس تذکرے میں علیحدہ علیحدہ مختلف اعضاے جسمانی کے زیرِ عنوان ایسی غزلیں اور اشعار یکجا کر دیے گئے ہیں جن میں ان اعضا کے نام بہ طور ردیف یا جزوِ ردیف نظم ہوئے ہیں اور ہر نئے شاعر کا کلام نقل کرنے سے پہلے اختصار کے ساتھ اس کا تعارف بھی سپردِ قلم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس طرح کسی شاعر کا کلام جتنے عنوانات کے تحت نقل ہوا ہے، اتنی ہی بار اس کے مختصر حالات بھی نقل کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر محسن نے اس تذکرے میں کل سات سو اکتیس شاعروں کے کلام کے نمونے پیش کیے ہیں۔ دبیر کا ذکر 'آنکھیں' اور 'ہاتھ' کے عنوانات کے تحت دو جگہ آیا ہے اور ان دونوں مواقع پر ان کی ایک ایک رباعی نقل کی گئی ہے۔ پہلی بار ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''مرثیہ گوئی میں طاق، صف آرائی اور مضموں خیزی میں شہرۂ آفاق، مرزا سلامت علی دبیر ولد مرزا غلام حسین، متعلقانِ مرزا آغا جان کا غذ فروش باشندۂ لکھنؤ، ارشدِ تلامذۂ میر مظفر حسین ضمیر مرثیہ گو۔''

(طبع ثانی، ص ۱۰۸)

دوسری جگہ مزید اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف اس قدر لکھا گیا ہے:

''مرزا سلامت علی دبیر مرثیہ گو ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش، باشندۂ لکھنؤ، شاگردِ میر مظفر حسین ضمیر۔'' (طبع ثانی ص ۲۱۵)

دبیر اور مرزا آغا جان کے تعلق کی نوعیت پوری طرح واضح نہیں۔ دبیر کے والد مرزا غلام حسین کے جاری کردہ ایک استشہاد مورخہ ۷/رجب ۱۲۱۵ھ (۲۴/نومبر ۱۸۰۰ء)

سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی سوتیلی ماں کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کی وجہ سے بچپن کے کچھ دن دہلی کے ایک رئیس مرزا فتح علی خاں کے ہاں گزارے تھے۔ رئیسِ موصوف مرزا غلام حسین کے والد کے ساتھ ''صیغۂ اخوت'' اور ''روابطِ قدیم'' رکھتے تھے۔ جب حالات کی ناسازگاری کے باعث وہ مبتلائے عسرت ہوئے تو دہلی سے ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ چلے آئے۔ مرزا غلام حسین بھی انھی کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے۔ استشہاد کی تحریر کے وقت مرزا فتح علی خاں کے صاحب زادے فضلِ علی خاں عرف آغا جان مرزا غلام حسین کے مکان پر سکونت پذیر تھے۔[9] ان حالات کے پس منظر میں محسنؔ کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دبیرؔ اور ان کے خاندان کو کم حیثیت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے ان بیانات میں انھوں نے پہلی بار مرزا آغا جان کو اور دوسری مرتبہ دبیرؔ کے والد مرزا غلام حسین کو کاغذ فروش قرار دے کر اس معاملے کو مزید الجھا دیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزادؔ نے دبیرؔ کے ذکر میں محسنؔ کے اسی اختلافِ بیان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''مصنّفِ موصوف کو شوق ہے کہ ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ نکتہ طنز کا نکال لیتے ہیں، اس لیے خاندان کے بیان میں نہ یقین ہے نہ شک۔''[10]

شعرائے اردو کا تیسرا تذکرہ جس میں دبیرؔ کا ذکر ملتا ہے، عبدالغفور نساخؔ کا 'سخنِ شعرا' ہے۔ نساخؔ بنگال کے رہنے والے تھے اور شروع میں مہجورؔ تخلص کرتے تھے۔ لکھنؤ کے معاصر شعرا سے چشمک کے بعد انھوں نے ناسخؔ کے مقابلے میں نساخؔ تخلص اختیار کیا۔ نثر و نظم میں متعدد تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ 'سخنِ شعرا' ان کے تذکرے کا تاریخی نام ہے، جس سے ۱۲۸۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ دیباچے کے مطابق ''بارہ برس کی محنت میں یہ تذکرہ تیار ہوا تھا۔'' اس اعتبار سے اس کی ابتدا ۱۲۶۹ھ مطابق ۵۳-۱۸۵۲ء میں ہوئی ہوگی۔ اس کا پہلا ایڈیشن مطبعِ نول کشور، لکھنؤ سے ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ تذکرے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) کے بعد بھی متعدّد اضافے کیے گئے ہیں۔ شعرا کی مجموعی تعداد دو ہزار چار سو پچاس (۲۴۵۰) ہے۔ مؤلف نے بقولِ

خود ''اشعارِ آبدار میں اطناب و اعجاز اور احوالِ شعرا میں اختصار و ایجاز'' سے کام لیا ہے۔ دبیرؔ کے متعلق ان کا بیان ہے کہ:

''دبیرؔ تخلص، مرزا سلامت علی ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش لکھنوی، شاگردِ مظفر حسین ضمیرؔ۔ مرثیہ اچھا کہتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ عیوبِ شاعری سے پاک ہو۔ راقم نے ان کو عظیم آباد میں دیکھا ہے۔''
(ص ۱۵۸)

اس مختصر تعارف کے بعد ایک غزل کے دو شعر نقل کیے گئے ہیں:

رواں کرتا تھا خنجر گاہ، گاہے روک لیتا تھا عجب ناز و ادا سے اس نے کاٹا میری گردن کو
دلا ان تنگ چشموں سے نہ چشمِ مہر تو رکھیو کسی کے حال پر روتے نہ دیکھا چشمِ سوزن کو

ناسخؔ نے دبیرؔ کے والد مرزا غلام حسین کو کاغذ فروش لکھا ہے۔ یہ بیان بہ ظاہر تذکرۂ 'سراپا سخن' پر جو ان کے مآخذ میں شامل ہے، مبنی معلوم ہوتا ہے۔ دبیرؔ کی شاعری کے بارے میں مؤلّف کا یہ قول بھی کہ ''مرثیہ اچھا کہتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ عیوبِ شاعری سے پاک ہو''، کلام کے منصفانہ تجزیے سے زیادہ شعرائے لکھنؤ کے خلاف ان کے معاندانہ رویّے کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ انھوں نے میر انیسؔ کے بارے میں بھی کم و بیش انھی الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''سوائے مرثیہ کے اور کسی صنفِ سخن میں دخل نہیں رکھتے۔ بلکہ مرثیہ بھی ان کا ایسا نہیں کہ عیوبِ شاعری سے پاک ہو۔'' (ص ۵۶)

انیسؔ اور دبیرؔ دونوں کے بارے میں ناسخؔ نے یہاں مجملاً جو رائے ظاہر کی ہے، اس کی تفصیل کے لیے ان کی تصنیف 'انتخابِ نقص' کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ۳۲ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ جس میں اردو کے ان دونوں بڑے مرثیہ گویوں کے کلام کی غلطیاں نکالی گئی ہیں، ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں مطبعِ نظامی، کان پور سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

مرزا کلب حسین خاں نادرؔ، ناسخؔ کے نامور تلامذہ اور دبیرؔ کے ممتاز معاصرین میں

شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے نثر ونظم میں مختلف موضوعات پر متعدّد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ان میں ان کے مخمسات کا ایک مجموعہ 'دیوانِ غریب' بھی شامل ہے، جو اپنے نام کے اعداد کے مطابق ۱۲۸۳ھ(۶۷-۱۸۶۶ء) میں مرتب ہوا تھا اور ۱۲۸۴ھ (۶۸-۱۸۶۷ء) میں مطبعِ دل کشا، فتح گڑھ میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔اس مجموعے میں نادؔر کے چند طبع زاد مخمسات کے علاوہ پانچ سو اکیس شاعروں کی غزلوں پر ان کی تضمینیں شامل ہیں۔دیوان میں ہر خمسے کے شروع میں اختصار کے ساتھ اس شاعر کا حال بھی لکھ دیا گیا ہے جس کی غزل پر مصرعے لگائے گئے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے مختلف شاعروں سے متعلق ان تعارفی کلمات کو ہر شاعر کے پانچ پانچ اشعار کے ساتھ یکجا کر کے ۱۹۵۷ء میں 'تذکرۂ نادؔر' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔اس طرح نادؔر کی اس تصنیف کو اصلاً تذکرہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک مستقل تذکرے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور یہ تذکرہ اس اعتبار سے اہم بھی ہے کہ اس میں ایسے بہت سے شعرا کے مختصر حالات اور کلام کے نمونے موجود ہیں، جن کا ذکر کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔علاوہ بریں اس کی بدولت ایسے متعدد شعرا کی غزلیں بھی محفوظ ہوگئی ہیں جو غزل گو کی حیثیت سے معروف نہیں۔مرزا دبیرؔ بھی شاعروں کے اسی دوسرے زمرے میں شامل ہیں۔نادؔر نے ان کے بارے میں نہایت مختصر الفاظ اور رسمی انداز میں جو کچھ لکھا ہے وہ حسبِ ذیل ہے:

''مرزا سلامت علی، سخن سنجِ گرامی، مرثیہ گوے نامی، متوطّنِ لکھنؤ۔''(ص ۶۶)

البتہ تضمین کے لیے ان کی جس غزل کا انتخاب کیا ہے، اس کے متعلق ان کی یہ اطلاع اہم ہے کہ ''یہ وہ غزل ہے جو مرزا صاحب نے مشاعرۂ فتح الدولہ میں بہ عہد مرزا غازی الدین حیدر شاہ اودھ کے پڑھی تھی۔'' یہ وہی غزل ہے جس کے دو شعر 'سخنِ شعرا' کے حوالے سے گذشتہ سطور میں نقل کیے جا چکے ہیں۔نادؔر کی اس تحریر سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل غازی الدین حیدر کی زندگی میں یعنی ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء سے قبل کہی جا چکی تھی، وہیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ دبیرؔ نے اس زمانے تک

غزل گوئی اور مشاعروں میں شرکت ترک نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ اس بیان سے فتح الدولہ برقؔ کے ہاں مشاعروں کے انعقاد کا زمانہ متعیّن کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

نواب یار محمد خاں شوکتؔ بھوپال کے شاہی خاندان کے ایک فرد اور مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے۔ ان کی تصانیف میں ایک مختصر تذکرہ 'فرح بخش' بھی شامل ہے، جو مطبعِ نظامی، کان پور میں ۲۷/ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸/ مارچ ۱۸۷۲ء کو چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ یہ تذکرہ شوکتؔ نے ۱۵/شعبان ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۰/نومبر ۱۸۷۰ء کو اپنے زمانے کے ''بعض شعرائے نازک خیال'' کے اشعار اپنی بیاض سے منتخب کر کے صرف ایک شب میں مرتّب کیا تھا۔ انھوں نے اسے چار گلشنوں میں تقسیم کیا ہے۔ گلشنِ اوّل سے گلشنِ سوم تک ترتیب وار بھوپال سے تعلق رکھنے والے ان شاعروں کا ذکر ہے جو (۱) تذکرے کی تالیف کے وقت بہ قیدِ حیات تھے اور بھوپال میں مقیم تھے (۲) جو ماضیِ قریب میں وفات پا چکے تھے اور (۳) جنھوں نے بھوپال سے ترکِ سکونت کر کے کسی اور جگہ بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ان شاعروں کی مجموعی تعداد اکیس ہے۔ گلشنِ چہارم میں مؤلّف کے الفاظ میں ''تذکرہ ان ادبائے نامدار کا ہے جن کی وجہ سے ہندوستان نقشۂ گلشنِ بے خار کا ہے۔'' ان ادبائے نامدار کی کل تعداد صرف پانچ ہے، جن میں مرزا غالبؔ، ان کے ایک معروف شاگرد اور نواب صدیق حسن خاں کے بڑے بھائی سید احمد حسن عرشیؔ اور مرزا دبیرؔ کے ساتھ دو غیر معروف و گم نام شاعر واکرؔ صاحب اور سید شریف حسین بھی شامل ہیں۔ اس گلشن کی ابتدا غالبؔ سے اور اختتام دبیرؔ پر ہوا ہے۔ دبیرؔ کے بارے میں مؤلّف کا بیان ہے:

> ''شاعرِ بے نظیر، قدسی ضمیر، مرزا دبیر سلمہٗ اللہ القدیر۔ جنابِ ممدوح کا کلام تمام ہندوستان میں مثل نیرِ اعظم مشہور ہے۔ میں دو بند مرثیے کے لکھتا ہوں اور اس رسالے کو ختم کرتا ہوں۔ **لَا عِطْرَ بَعدَ العُود** اہلِ عرب میں ضرب المثل ہے اور بہترینِ حلویات بقولِ حضرتِ امیر عسل ہے۔'' (ص ۷۶)

اس کے بعد مرثیے کے یہ دو بند نقل کیے گئے ہیں:

رودار ہے خورشید پر ابرو نہیں رکھتا ابرو مہِ نو رکھتا ہے، یہ رو نہیں رکھتا
قد رکھتا ہے شمشاد، یہ گیسو نہیں رکھتا سنبل کے ہیں گیسو، قدِ دلجو نہیں رکھتا
گر آنکھ ہے نرگس کے، یہ بینائی نہیں ہے
غنچے کا دہن ہے پہ یہ گویائی نہیں ہے
زہرہ دفِ شادی کو بجاتی ہوئی آئی شب آئینۂ ماہ دکھاتی ہوئی آئی
نُقل اختر تاباں کے لٹاتی ہوئی آئی اور قاضیِ گردوں کو جگاتی ہوئی آئی
نوشاہ کے خلعت کی جو طلعت نظر آئی
سہرا لیے کشتی میں شعاعِ قمر آئی

اس تذکرے میں ایک ادیبِ نامدار کی حیثیت سے دبیرؔ کی شمولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان کی مرثیہ گوئی مذہبی حلقوں سے نکل کر ادبی حلقوں میں بھی اپنا لوہا منوا چکی تھی اور لکھنؤ سے باہر بھی ایک ایسا حلقہ موجود تھا جس میں وہ انیسؔ سے زیادہ معروف ومقبول تھے۔

'فرح بخش' کے بعد اگلا تذکرہ جس میں ہمیں دبیرؔ کا ذکر ملتا ہے 'ارمغانِ گوکل پرشاد' ہے۔ اس کے مولّف گوکل پرشاد رسا قصبہ کھجوا، ضلع فتح پور کے رہنے والے تھے۔ ان کا یہ تذکرہ منشی بہاری لال کے مطبعِ مطلعِ نور، واقع کان پور میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ مختلف قطعاتِ تاریخ کی رو سے اس کا سالِ ترتیب ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۷ء اور سالِ طباعت ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء قرار پاتا ہے۔ 'ارمغانِ گوکل پرشاد' سے ۱۸۷۵ء برآمد ہوتا ہے، اس لیے بر بنائے قیاس یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا آغاز ۱۸۷۵ء میں اور اتمام ۱۸۷۷ء میں ہوا ہوگا۔ تذکرہ دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ شاعروں کے تعارف کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد گیارہ سو دو ہے۔ دوسرے حصّے میں 'سراپا سخن' کی طرح محبوب کے سراپا، آرائش وزیبائش، زیورات وملبوسات، حرکات وسکنات اور رفتار وگفتار کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت مختلف شاعروں کے منتخب اشعار ان کے تخلص اور حصّہ اول میں تعارف کے سلسلہ نمبر کے التزام کے ساتھ یکجا کیے گئے ہیں۔ حصّہ اوّل کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۹۷۵ء میں انجمن ترقیِ

اردو پاکستان، کراچی سے دوبارہ شائع کر دیا ہے اور یہی اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے، اس میں دبیرؔ کے متعلق مختصراً یہ معلومات فراہم کی گئی ہے:

''مرزا سلامت علی ولد مرزا غلام حسین، مرثیہ گویانِ نامی شہر لکھنؤ سے ہیں۔ میر مظفر حسین ضمیرؔ کے شاگرد ہیں۔ آپ کے مرثیے چند جلدوں میں مطبعِ منشی نول کشور میں چھاپے گئے ہیں۔''

اس بیان میں مطبع نول کشور سے چند جلدوں میں مرثیوں کی اشاعت سے متعلق اطّلاع کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں۔ ڈاکٹر محمد زماں آزردہؔ کی تحریر کے مطابق مطبعِ نول کشور سے دبیرؔ کے مرثیوں کی صرف دو جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ پہلی جلد دبیرؔ کے انتقال کے صرف نو ماہ بعد دسمبر ۱۸۷۵ء میں اور دوسری جلد اس کے تین چار مہینے بعد اپریل ۱۸۷۶ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس کے بعد بھی یہ دونوں جلدیں مرثیوں کی کمی بیشی کے ساتھ اسی مطبعے سے کئی بار شائع ہو چکی ہیں،[۱۱] لیکن اب تقریباً نایاب ہیں۔

'ارمغانِ گوکل پرشاد' کا دوسرا حصّہ ہماری دسترس میں نہیں اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں دبیرؔ کے کتنے اشعار نقل کیے گئے ہیں اور وہ کس صنف یا اصناف سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ اس تذکرے کے مآخذ میں 'خوش معرکۂ زیبا'، 'سراپا سخن' اور 'سخنِ شعرا' بھی شامل ہیں، اس لیے قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ گوکل پرشاد نے مراثیِ دبیرؔ کے علاوہ ان تذکروں سے بھی اشعار منتخب کیے ہوں گے۔

'بزمِ سخن' مولّفہ نواب علی حسن خاں سلیمؔ، ہماری معلومات کے مطابق شعرائے اردو کا ساتواں تذکرہ ہے جس میں دبیرؔ کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ تذکرہ دبیرؔ کی وفات کے پانچ برس بعد ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں مرتّب ہوا اور اس کے اگلے سال یعنی ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں مطبعِ مفیدِ عام، آگرہ میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ اس کی تالیف کے وقت مولّف کی عمر صرف چودہ سال تھی، اس لیے لالہ سری رام، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور بعض دوسرے اہلِ علم کا خیال ہے کہ شعرائے فارسی و اردو کے جو تذکرے نواب علی حسن خاں کے نام سے شائع ہوئے ہیں، وہ اصلاً ان کی تصنیف نہیں۔[۱۲] شعرائے فارسی کا تذکرہ 'بزمِ سخن'

سے بھی دو برس پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ یعنی اس کی تالیف کے وقت مولّف کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ مولانا محمد عباس رفعتؔ شروانی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ 'بزمِ سخن' دراصل منشی محمد صابر حسین صباؔ سہسوانی کی تالیف ہے۔[۱۳] اس تذکرے میں کل چار سو تینتیس (۴۳۳) شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ دبیرؔ کے متعلق صاحبِ تذکرہ کا بیان درجِ ذیل ہے:

''مرزا سلامت علی خلف مرزا غلام حسین لکھنوی با ضمیرؔ پیوندِ تلمذ داشت۔ مرثیہ خوش ترمی گفت۔ بیتے بیش از گفتارش دست نداد۔''

(ص ۴۸)

اس حد درجہ مختصر تعارف میں رسمی معلومات کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاہم تذکرہ نگار نے یہ لکھ کر کہ ''مرثیہ خوش ترمی گفت''، بالواسطہ طور پر اپنی اس رائے کا اظہار کر دیا ہے کہ دبیرؔ کی غزل ان کے مرثیے کی بہ نسبت کمتر درجے کی چیز ہے۔ اگلے جملے میں ایک شعر سے زیادہ کلام دستیاب نہ ہونے سے دراصل اشعارِ غزل کا فراہم نہ ہونا مراد ہے۔ یہ ایک شعر جو نمونۂ کلام کے طور پر اس تذکرے میں نقل کیا گیا ہے، عبدالغفور نساخؔ کے تذکرے میں نقل شدہ دو اشعار میں سے پہلا شعر ہے اور اس غزل سے تعلق رکھتا ہے، جو کلب حسین خاں نادرؔ کے بقول فتح الدولہ برقؔ کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔

شعرائے فارسی کے تذکرے فی الوقت ہمارے دائرۂ گفتگو میں شامل نہیں، تاہم یہاں ضمنی طور پر 'بزمِ سخن' کے مولّف نواب علی حسن خاں ہی کے نام سے شائع شدہ فارسی تذکرے 'صبحِ گلشن' کا حوالہ بے محل نہ ہوگا۔ یہ تذکرہ جیسا کہ اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے 'بزمِ سخن' سے دو برس پہلے جمادی الاولیٰ ۱۲۹۵ھ مطابق مئی ۱۸۷۸ء میں مرتّب و مکمل ہو کر اسی سال مطبعِ شاہ جہانی، بھوپال سے شائع ہوا ہے۔ اس تذکرے میں نسبتاً تفصیل کے ساتھ دبیرؔ کے بارے میں یہ معلومات فراہم کی گئی ہے:

''نامش سلامت علی، دراصل ہندو نژاد بود۔ بہ طیبِ خاطر بہ شرفِ اسلام مشرف شد و مذہبِ شیعہ اختیار نمود۔ طبعش از اصنافِ شعر بس کہ مائل بہ مرثیہ گوئی بہ زبانِ اردو افتاد، در مراثیِ خود دادِ شاعری علی وجہ

الکمال داد۔ غیر میر ببر علی انیسؔ دریں فن نظیر خود نداشت واحیاناً درزبانِ فارسی بہ مدحت ائمہ آہنگ برمی داشت۔ ہفت بندِ کاشی رادر سلکِ تضمین کشیدہ وبست ونہم ماہِ محرم سنہ یک ہزار ودوصد ونود ودواز کشمکشِ ایں دارالمحن آرمیدہ۔'' (ص۱۶۳)

دبیرؔ کا اصلاً ہندو ہونا اور بعد میں مشرف بہ اسلام ہوکر مذہب شیعہ اختیار کرنا یکسر خلافِ واقعہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولّف کو کسی غلط فہمی کی بنا پر دبیرؔ اور دلگیرؔ کے درمیان التباس ہوا ہے اور انھوں نے دلگیرؔ کے قبولِ اسلام کا واقعہ دبیرؔ سے منسوب کر دیا ہے۔ اس مغالطے سے قطعِ نظر 'صبحِ گلشن' کے مولّف کو مرزا صاحب کی تاریخِ وفات درج کرنے کے معاملے میں ہماری معلومات کی حد تک اردو اور فارسی کے تمام تذکرہ نگاروں میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ انتخابِ کلام کے تحت صاحب تذکرہ نے صرف 'ہفت بندِ کاشی' کی متذکرۂ بالا تضمین کے چار بند نقل کیے ہیں۔ یہ تضمین بہ شکلِ مخمس ۱۸۲ (ایک سو بیاسی) بندوں پر مشتمل ہے اور رجب ۱۲۸۰ھ (دسمبر ۱۸۶۳ء و جنوری ۱۸۶۴ء) میں 'شمس المشرقین' کے نام سے مطبعِ اودھ گزٹ، لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔[۱۴] اس کے علاوہ 'دفترِ ماتم' کی انیسویں جلد میں بھی شامل ہے۔

دبیرؔ کے حالات کے بیان میں صاحب 'صبحِ گلشن' سے جس قسم کی غلطی ہوئی ہے، اسی نوعیت کا ایک سہو تذکرۂ 'یادگارِ ضیغم' میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ تذکرہ محمد عبداللہ خاں ضیغمؔ لکھنوی، نزیلِ حیدرآباد کی تالیف ہے اور ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں مطبعِ گلزارِ دکن، حیدرآباد میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ مؤلّف نے بقولِ خود:

حدیثِ زندہ گویم، مردہ درگور

کے بہ مصداق اس تذکرے میں صرف ان شاعروں کا حال اور کلام درج کیا ہے جو ۱۳۰۲ھ (۸۵-۱۸۸۴ء) میں بہ قیدِ حیات تھے البتہ اگر کسی مرحوم شاعر کا ذکر اس کے کسی شاگرد کے بیان میں آ گیا ہے تو مجملاً اس کا حال بھی لکھ دیا گیا ہے۔ دبیرؔ 'یادگارِ ضیغم' کی تالیف سے دس سال پہلے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں وفات پا چکے تھے، اس لیے ان کا نام اس تذکرے کی

فہرستِ شعرا میں شامل نہیں لیکن ضمناً ان کے سلسلے کے آٹھ شاعروں کے حالات میں ان کا ذکر موجود ہے۔ان میں سے صفیر بلگرامی (ص ۲۲۱)، میر مہدی حسن عقیل (ص ۲۵۶)، مرزا محمد طاہر رقیع ابن مرزا محمد جعفر اوج (ص ۳۹۸) اور مرزا غلام حسین جوش مدراسی شاگردِ زکی (ص ۳۹۹) کے حالات میں انھیں صرف ''مرزا دبیر''، ''مرزا دبیر مرحوم'' یا ''مرزا دبیر مرحوم لکھنوی'' لکھا گیا ہے، جب کہ بہادر حسین وحید لکھنوی کے ترجمے میں ان کا ذکر ان کے پورے نام ''مرزا سلامت علی دبیر مرحوم لکھنوی'' کے ساتھ آیا ہے (ص ۲۶۳)۔ان پانچ مقامات کے برخلاف سید بندہ رضا آرزو بلگرامی شاگردِ زکی (ص ۲۹) کے حال میں ان کا نام ''مرزا ببر علی بیگ دبیر مرحوم''، محمد رضا خاں رضا (ص ۱۶۱) کے ترجمے میں ''مرزا ببر علی بیگ مرحوم دبیر لکھنوی'' اور محمد شکر اللہ خاں رشید لکھنوی (ص ۱۶۲) کے تعارف کے تحت ''مرزا ببر علی مرحوم لکھنوی'' بتایا گیا ہے۔ یہ غلطی بہ ظاہر میر انیس کے نام کے ساتھ التباس کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

ضیغم نے متذکرۂ بالا شعرا کے تراجم میں حسبِ معمول کہیں کہیں دبیر کی مرثیہ گوئی کے متعلق بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً آرزو بلگرامی کے حال میں انھیں ''اس فن خاص میں اکمل'' قرار دیا ہے۔ (ص ۲۹) محمد رضا خاں رضا کے حال میں لکھا ہے کہ ''مرزا صاحب مرحوم مرثیہ گوئی میں یگانۂ آفاق تھے۔'' (ص ۱۶۱) بہادر حسین وحید کے حالات میں مرثیہ وسلام میں مرزا صاحب سے مشورۂ سخن کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''ایک استادِ نامی اس فن میں گزرے ہیں۔'' (ص ۲۶۲) محمد طاہر رقیع کے حالات کے تحت ان کے والد مرزا محمد جعفر اوج کے اپنے پدرِ بزرگوار، مرزا دبیر سے کسبِ فیض کا ذکر کرتے ہوئے انھیں ''مرثیہ گوئی میں مسلّم الثبوت'' گردانا ہے۔ (ص ۳۹۸) رشید لکھنوی کے حال میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کے بارے میں یہ معلومات فراہم کی گئی ہے:

> ''مرزا ببر علی دبیر مرحوم لکھنوی..... مرثیہ گوئی میں طاق، شہرۂ آفاق تھے..... مرزا صاحب مرحوم کے علم وفضل اور باکمال ہونے کا اک جہاں معرف ہے، کچھ حاجت بیان نہیں۔ چھ سات برس ہوئے کہ

اس جہان سے رحلت کی۔'' (ص ۱۶۲)

جیسا کہ اس تذکرے کے تعارف کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ دبیرؔ اس کی تالیف سے پورے دس سال پہلے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں فوت ہو چکے تھے، اس لیے ان کی وفات کو چھے سات برس پہلے کا واقعہ قرار دینا درست نہیں۔ تین جگہ نام کے غلط اندراج کے بعد یہ دوسری غلطی ہے جو دبیرؔ کے حالات کے سلسلے میں 'یادگارِ ضیغم' کے مولّف سے سرزد ہوئی ہے۔

'خم خانۂ جاوید' وہ آخری تذکرہ ہے جس کی طرف رجوع کے ساتھ تذکروں کی حد تک دبیرؔ سے متعلق براہِ راست یا معاصرانہ معلومات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ شعرائے اردو کا یہ سب سے ضخیم مگر ناتمام تذکرہ لالہ سری رام دہلوی کی تصنیف ہے۔ انھوں نے اس کا آغاز ۱۸۹۲ء میں کیا تھا۔ سترہ سال کے بعد ۱۹۰۸ء میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی جب کہ پانچویں اور آخری جلد جو ردیف عین کے تحت حرفِ ثانی 'ز' پر ختم ہوئی ہے، مولّف کے انتقال (۲۵ر مارچ ۱۹۳۰ء) کے پورے دس برس بعد ۱۹۴۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔ دبیرؔ کا ذکر اس کی تیسری جلد میں آیا ہے۔ سرورق کے اندراج کے مطابق یہ جلد ۱۹۱۷ء میں دلّی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ لیکن مختلف تقریظوں اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۹۱۳ء کے اواخر یا ۱۹۱۴ء کے اوائل میں ہو چکی تھی اور اصل متن ۱۹۱۵ء میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا۔ دبیرؔ کے لیے اس تذکرے میں کل تیرہ صفحات وقف کیے گئے ہیں۔ ان میں سات صفحات سوانح کے لیے اور باقی چھے صفحے انتخاب کے لیے مخصوص ہیں۔ دو ہزار چھے سو سے زائد شعرا کے حالات پر مشتمل اس تذکرے میں جن لوگوں کا حال اس قدر تفصیل سے لکھا گیا ہے، ان کی تعداد بہت محدود ہے۔ تعارف کے آغاز میں سب سے پہلے جلی حروف میں ''امامِ کعبۂ بلاغت، ناظمِ عطارد تحریر، مرزا سلامت علی دبیرؔ مرحوم'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے، بعد ازاں ''خم خانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی'' کے ذیلی عنوان کے تحت مرزا صاحب کے خاندانی و ذاتی حالات تحریر کیے گئے ہیں لیکن سات صفحات کے اس خاصے مفصّل بیان میں کوئی ایسی بات نہیں جو ثابتؔ لکھنوی کی

تصنیف 'حیاتِ دبیر' میں موجود نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 'خم خانۂ جاوید' کے لیے دبیر کے حالات بھی اصلاً ثابت لکھنوی ہی نے لکھے ہیں۔ لالہ سری رام نے ان کی تحریر کے آخر میں جن چند جملوں کا اضافہ کیا ہے، وہ یہ ہیں:

''آپ کے صاحب زادے حضرتِ اوج بڑے باکمال مرثیہ گو ہیں۔ ان کی خدمت میں راقم کو بہ مقام لکھنؤ دوبار نیاز حاصل ہوا تھا۔ ہنگامِ ملاقات حضرت نے بہ کمالِ توجہ جناب دبیر کے حالات بھی سنائے تھے۔'' (ص ۱۵۸)

اس کے بعد فاضل مولّف نے ثابت لکھنوی کی اعانت کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں لکھا ہے:

''مندرجۂ بالا حالات کے لیے راقم منشی افضل حسین ثابت کا مشکور ہے، جنھوں نے ایک پورا رسالہ موسوم 'خم خانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی' مرزا دبیر کے حالات میں بھیج کر 'خم خانۂ جاوید' سے اپنی دل چسپی کا ثبوت دیا۔'' (ایضاً ص ۱۵۸)

اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ دبیر کے اس تعارف کے آغاز میں جو ذیلی عنوان (خم خانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی) قائم کیا گیا ہے، وہ بھی دراصل ثابت ہی کا تجویز کردہ ہے۔ اس انکشاف کے بعد مشترک بیانات کے سلسلے میں 'حیاتِ دبیر'، 'دربارِ حسین' اور 'سبعِ مثانی' کے دیباچے کے ساتھ 'خم خانۂ جاوید' کا حوالہ تو ضرور دیا جاسکتا ہے لیکن کسی معمولی جزوی اختلاف کی صورت میں یہ کہنا کہ مؤلّفِ 'خم خانۂ جاوید' نے ثابت کے بیان پر یہ اضافہ کیا ہے، یا کسی روایت کے متعلق یہ بیان کہ افضل حسین ثابت اور لالہ سری رام دونوں اس کے ناقل ہیں، قطعاً درست نہ ہوگا۔

'خم خانۂ جاوید' میں دبیر کے کلام کے جو نمونے پیش کیے گئے ہیں، ان میں مختلف مرثیوں کے سولہ مکمل بند اور سات متفرق اشعار، انیس رباعیاں، پندرہ اشعار پر مشتمل دو غزلیں اور تین سلاموں کے چودہ منتخب شعر شامل ہیں۔ ان میں ایک غزل کی پیشانی پر

''غزلِ کمیابِ مرزا دبیرؔ منقول از مجموعۂ مرسلہ'' کے اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ثابتؔ کے لکھے ہوئے اس رسالے کے ساتھ دبیرؔ کا کلام بھی منسلک تھا۔ لیکن پیش کردہ کلام میں خود لالہ سری رام کے پسندیدہ اشعار بھی شامل ہیں، اس لیے متن اور انتساب دونوں ہی کے نقطۂ نظر سے اس کی صحت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ فی الوقت اس سلسلے میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس انتخاب میں کم از کم دو ایسی رباعیاں ضرور شامل ہیں جو دبیرؔ کی نہیں، انیسؔ کی تصنیف ہیں۔ یہ دونوں رباعیاں درج ذیل ہیں:

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں، بو تیری ہے

☆☆☆☆☆

دل کو مرے شغلِ غم گساری کا ہے — غفلت میں (بھی) طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرّہ! — ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

اسی طرح مرثیے کے ایک منتخبہ بند کے پہلے دو شعر صفحہ ۱۶۱ کی سطر ۱۷، ۱۸ پر لکھے گئے ہیں اور ٹیپ کی بیت چھے سطروں کے فرق سے صفحہ ۱۶۲، سطر نمبر ۴ پر نقل ہوئی ہے۔ درمیان کی ان چھے سطروں پر بغیر کسی فصل کے تین رباعیاں منقول ہیں۔

ایک اہم اختلاف جو اس تذکرے اور دوسرے اہم مآخذ کے درمیان پایا جاتا ہے اور بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے، وہ دبیرؔ کی تاریخِ وفات سے تعلق رکھتا ہے۔ 'خم خانۂ جاوید' کے مطابق انھوں نے ۳؍محرم ۱۲۹۲ھ کو انتقال کیا، جب کہ ثابتؔ لکھنوی نے اپنی تمام تحریروں میں مرزا صاحب کی تاریخِ رحلت ۳۰؍محرم ۱۲۹۲ھ لکھی ہے۔[۱۵] یہ غلطی بہ ظاہر سہوِ قلم (۳؍محرم بجائے ۳۰؍محرم) کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے جس کے لیے ثابتؔ لکھنوی، لالہ سری رام اور کاتبِ تذکرہ تینوں میں سے کوئی بھی شخص ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ ۳۰؍محرم کی صحت پر ثابتؔ لکھنوی کو اس حد تک اصرار ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں مولانا محمد حسین آزادؔ کے بیان کی تردید کو ضروری خیال کرتے ہوئے نہایت باوثوق انداز میں لکھا ہے کہ:

''مولانا آزادؔ فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب نے ۲۹؍محرم ۱۲۹۲ھ کو

انتقال فرمایا، مگر صحیح یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ۳۰؍محرم ۱۲۹۲ھ کو رحلت کی۔''[۱۶]

اس موثّق فیصلے اور بعد کے بیشتر محققین کے اس سے اتفاق کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ یہ تاریخ صحیح نہیں۔ ثابتؔ لکھنوی نے اس سلسلے میں اپنی تمام تحریروں میں منیرؔ شکوہ آبادی (شاگردِ دبیرؔ) کے مستخرجہ مادۂ تاریخ ''پگاہ سلخ و سہ شنبہ مہِ عزابودہ'' اور عبدالعلی آسیؔ مدراسی کی کہی ہوئی تاریخ کے ایک مصرعے ''سلخِ محرم آمدہ روزِ وصالِ او'' سے استدلال کیا ہے۔ ان دو تاریخوں کے علاوہ سید حسین لطافتؔ لکھنوی کے قطعۂ تاریخ کے پہلے مصرعے ''روز سہ شنبہ تھا اور سلخِ محرم، وقتِ صبح'' اور مرزا محمد جعفر اوجؔ (فرزندِ دبیرؔ) کی ایک رباعی کے مصرعِ ثانی ''تھا سلخ کو غرۂ محرّم اپنا'' سے بھی ماہِ محرم کے آخری دن رحلت کی تائید ہوتی ہے۔[۱۷] لیکن یہ فیصلہ کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی کہ اس دن حتمی طور پر مہینے کی تیسویں تاریخ تھی، انتیسویں نہیں۔ اس کے برخلاف 'اودھ اخبار' کے ۱۰؍مارچ ۱۸۷۵ء مطابق یکم صفر ۱۲۹۲ھ کے شمارے میں ''جناب مرزا دبیرؔ صاحب کی وفات'' کے زیرِ عنوان نہایت واضح لفظوں میں یہ اندراج موجود ہے کہ ''منگل کی اخیر شب کو یعنی ۲۹؍محرم کو یہ حادثہ واقع ہوا۔''[۱۸] اسی اخبار کے اگلے شمارے مورخہ ۱۴؍مارچ ۱۸۷۵ء میں ''مختصر سوانح عمریِ حضرت دبیرؔ مغفور'' کے تحت ایک بار پھر یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ''۲۹؍محرم کو عاشقِ حسین نے اس دارِفانی سے کوچ فرمایا اور رونق افزائے دارالبقا ہوئے۔''[۱۹] مزید براں منشی فدا علی فارغؔ کے ایک قطعۂ تاریخ سے بھی جو 'اودھ اخبار' ہی کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا، یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی وفات محرم کی ۲۹؍تاریخ کو ہوئی تھی۔ اس قطعے کے دو ابتدائی اشعار درج ذیل ہیں:

انتیسویں کو ماہِ محرم کی چرخ نے — کیا لکھنؤ میں فتنۂ ماتم بپا کیا
یعنی کہ نقشِ ہستیِ مرزا دبیرؔ کو — حرفِ غلط کی طرح سے اس نے مٹا دیا[۲۰]

مولّفِ 'صبحِ گلشن' اور مولانا محمد حسین آزادؔ کے بیانات گذشتہ سطور میں نقل کیے جا چکے ہیں، ان سے بھی ۲۹؍محرم ہی کی توثیق ہوتی ہے۔ ۳۰؍محرم کی تائید میں قدیم ترین بیان

ثابتؔ لکھنوی کا ہے لیکن یہ مرزا صاحب کی وفات کے ۳۷، ۳۸ سال بعد پہلی بار ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں قلم بند کیا گیا ہے۔[۲۱] اس لیے معاصر شہادتوں بالخصوص 'اودھ اخبار' کے اندراجات کے مقابلے میں کسی طرح قابلِ ترجیح نہیں۔ بحث کا ماحصل یہ ہے کہ مرزا دبیرؔ کی تاریخِ وفات سہ شنبہ ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۹ مارچ ۱۸۷۵ء ہے۔ تقویم کی رو سے اگر ان ہجری و عیسوی تاریخوں کے درمیان دو دن کا فرق واقع ہوتا ہے تو یہ چنداں اہم نہیں۔ معاصر شہادتوں کی بنیاد پر تقویم کے تخمینی حساب کو بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

'آبِ حیات' کی اشاعت کے بعد بھی اگرچہ تذکرہ نگاری کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا اور 'خم خانۂ جاوید' جیسے اہم تذکرے کے علاوہ کئی اور تذکرے بھی لکھے گئے لیکن مرزا دبیرؔ کے حالات و کلام کے مطالعے میں ان سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ بعد کے ان تذکرہ نگاروں میں سے جن لوگوں نے دبیرؔ کا ذکر کیا ہے، انھوں نے بالعموم وہی باتیں دوہرائی ہیں جو ان کے پیش رو تذکرہ نگار اپنے تذکروں میں لکھ چکے ہیں یا جن کی مکمل تفصیلات ثابتؔ لکھنوی کی تصانیف میں موجود ہیں، اس لیے اس گفتگو کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

حواشی

۱ حیاتِ دبیر مصنّفہ سید افضل حسین ثابتؔ لکھنوی، اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء، جلدِ اول، ص ص ۱و۲۰ وسبعِ مثانی، مرتبہ سید سرفراز حسین خبیرؔ لکھنوی، نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۰ء، دیباچہ ص ۹

۲ (۱) تذکرۂ نادر مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء ص ۶۶ وسبعِ مثانی، دیباچہ، ص ۲۳

۳ عیسوی تاریخ ''تذکرۂ شرکا'' محسنؔ لکھنوی نے اپنے تذکرے 'سراپا سخن' (طبعِ ثانی، ۱۸۷۵ء، ص ۳۲۳) میں درج کی ہے۔

۴ خوش معرکۂ زیبا مرتبہ مشفق خواجہ، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء، جلدِ اول، مقدمۂ مرتب، ص ۸۴

۵ ایضاً، خوش معرکۂ زیبا، جلدِ اول، مقدمۂ مرتب، ص ۴۱

۶ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۷

۷ خوش معرکۂ زیبا، جلدِ اول، مقدمۂ مرتب، ص ۶۸

۸ حیاتِ دبیر، جلدِ اول، ص ۳۲ تا ۳۵ وسبعِ مثانی، دیباچہ، ص ۱۹و۲۰

۹ تفصیل کے لیے دیکھیے: حیاتِ دبیرؔ، جلدِ اول، ص ۷ تا ۹

۱۰ آبِ حیات، نول کشور پریس، لاہور، ۱۹۰۷ء حاشیہ ص ۵۱۵۔ مولانا آزادؔ نے محسنؔ کے بیانِ ثانی کے حوالے سے دبیرؔ کے والد کا نام مرزا آغا جان لکھ دیا ہے (ان کے والد مرزا آغا جان کاغذ فروش تھے) جو یکسر خلافِ واقعہ ہے اور بہ ظاہر کسی غلط فہمی یا سہو کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

۱۱ مرزا سلامت علی دبیر، مطبوعہ سری نگر، طبعِ اول، ۱۹۸۱ء، ص ۳۶۷

۱۲ خم خانۂ جاوید، جلدِ چہارم، ص ۲۴۱ و اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ

نگاری، ص۶۰۳

۱۳؎ بیاضِ رفعت (قلمی)، مملوکہ کالی داس گپتا رضاؔ، بہ حوالہ ماہ نامہ 'شاعر'، بمبئی، جلد۵۲، شمارہ ۵ و ۶ بابت ۱۹۸۱ء، ص۷۲

۱۴؎ اس اطلاع کے لیے راقم مکرمی پروفیسر نیر مسعود رضوی کا ممنون ہے۔

۱۵؎ حیاتِ دبیر، جلدِ اول، ص ص ۱، ۴۶ و ۱۲۹ و سبعِ مثانی، دیباچہ، ص۹، ۴۱

۱۶؎ حیاتِ دبیر، ص۴۶

۱۷؎ لطافتؔ کے اس قطعے اور اوجؔ کی رباعی کے لیے ملاحظہ ہو:
تحقیقی نوادر از ڈاکٹر اکبر حیدری، اردو پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء، ص۳۴۰ و ۳۴۱

۱۸؎ بہ حوالہ تحقیقی نوادر، ص۳۳۷، مرزا سلامت علی دبیر، ص۱۵۲ و سہو و سراغ از کالی داس گپتا رضاؔ، مطبوعہ بمبئی، ۱۹۸۰ء ص۱۶۳

۱۹؎ بہ حوالہ مرزا سلامت علی دبیر، ص۱۵۱، تحقیقی نوادر، ص۳۳۹ و سہو و سراغ، ص۱۶۳ و ۱۶۴

۲۰؎ بہ حوالہ تحقیقی نوادر، ص۳۴۲

۲۱؎ ثابتؔ لکھنوی نے یہ تاریخ سب سے پہلے 'حیاتِ دبیر' میں درج کی ہے۔ یہ کتاب دیباچے کی تاریخِ تحریر کے مطابق ۲۹/ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ (۱۹/دسمبر ۱۹۱۲ء) سے کچھ پہلے مکمّل ہوئی تھی۔
(ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، شمارہ اگست ۱۹۸۷ء)

منشی انوار حسین تسلیم

منشی انوار حسین تسلیم کا آبائی وطن اور مولد اتر پردیش کا قصبہ سہسوان ضلع بدایوں تھا۔ وہ منشی احتشام الدین کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے اور شیوخِ صدیقی کے ایک ذی علم اور ذی حیثیت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق ان کا تاریخی نام خورشید علی تھا اور ان کی ولادت بروزِ چہارشنبہ، ۲۱ر رجب ۱۲۳۰ھ (۲۸ر جون ۱۸۱۵ء) کو ہوئی تھی۔[۱] چونکہ ان کے والد وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے اور اس سلسلے سے مستقلاً مرادآباد میں رہتے تھے، اس لیے وطن میں ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد انھوں نے مرادآباد میں انھی کے زیرِ سایہ درسیات کی تکمیل کی۔ اس سلسلے کی بعض ابتدائی کتابیں انھوں نے اپنے چچا منشی صدرالدین اور پھوپی زاد بھائی سید مراد علی سے پڑھیں اور قصائدِ بدر چچا، گلِ کشتی، شبنمِ شاداب اور رسائلِ طغرا جیسی اعلیٰ کتبِ درسیہ کی تحصیل مرزا احمد بیگ لکھنوی اور میر عارف علی عارفؔ امروہوی شاگردِ مصحفیؔ سے کی۔[۲] بعض تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان و ادب پر عبورِ کامل کے علاوہ انھیں عربی زبان اور علم طب میں بھی بہ قدرِ ضرورت دستگاہ حاصل تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں تسلیم کا نکاح ان کے عمِ محترم منشی

قیام الدین بے قیدؔ کو توالِ شہر مراد آباد کی صاحبزادی سے ہوا۔ اسی زمانے میں انھوں نے عدالتِ دیوانی مراد آباد میں بہ حیثیت امین ملازمت کا آغاز کیا۔ ابتدا میں کچھ دنوں تک بہ حصولِ رخصت وطن میں آمد ورفت کا سلسلہ قائم رہا لیکن ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء میں والد کے انتقال کے بعد انھوں نے مراد آباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔[۳] ۱۸۵۷ء کے انقلابِ عظیم کے بعد مختلف سرکاری محکموں میں جو اصلاحات اور تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کے نتیجے میں ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء میں تسلیمؔ ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔[۴] اس کے بعد اگلے چند برس انھوں نے رام پور میں گزارے۔ یہ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کی فرماں روائی اور نواب کلب علی خاں کی ولی عہدی کا زمانہ تھا۔ تسلیمؔ کی متعدد تحریریں ان دونوں رئیسوں سے ان کے رابطۂ قربت واخلاص کی شاہد ہیں لیکن بہ حیثیت ملازم ریاست سے وابستگی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

۸/نومبر ۱۸۶۵ء/ ۱۸/ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۲ھ کو تسلیمؔ منشی نول کشور کی دعوت پر رام پور سے ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ پہنچے اور مطبعِ اودھ اخبار سے وابستہ ہو گئے۔[۵] یہاں ابتدائی طور پر ترتیب وتصحیحِ کتب اور خاتمہ وتقریظ وتاریخ لکھنے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اپنی معاملہ فہمی اور حسنِ کارکردگی کی بنا پر مطبعے کی شاخِ کان پور کے مہتمم بنا دیے گئے۔[۶] ان دونوں ہی حیثیتوں میں انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی اس حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیے کہ رفتہ رفتہ انھیں منشی نول کشور کے ادبی مشیری اور رفیق وہمدم کا مقام حاصل ہو گیا۔[۷] مطبعِ اودھ اخبار سے یہی تعلق ملک کے معاصر اہلِ علم وفن سے ان کے روابط اور علمی وادبی دنیا میں ان کی شہرت وناموری کا وسیلہ ثابت ہوا، جس کا خود انھوں نے بھی کئی جگہ اعتراف کیا ہے۔ بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر ملازمت کا یہ سلسلہ ۲۸/فروری ۱۸۷۹ء کو ختم ہو گیا۔[۸] ممکن ہے کہ تسلیمؔ کی نازک مزاجی اور زود حسی اس کا سبب رہی ہو۔ اس کے بعد انھوں نے دو برس سات ماہ کے قریب لکھنؤ ہی میں خانہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ اس اثنا میں وہ ایک بار اپنے عزیز شاگرد اور قدرداں راجا کشن کمار وقارؔ رئیس مراد آباد کی دعوت پر جنوری ۱۸۸۱ء میں کچھ دنوں کے لیے مراد آباد آئے۔ اس قیام کے دوران راجا صاحب

موصوف اور بعض دوسرے شاگردوں اور دوستوں نے انھیں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ عمر کے باقی ماندہ ایّام مراد آباد ہی میں بسر کریں۔ چنانچہ مزید کچھ دن لکھنؤ میں گزار کر شروع اکتوبر ۱۸۸۱ء میں تسلیم مستقل طور پر مراد آباد چلے آئے۔[۹] یہیں ۱۲ر شوال ۱۳۰۹ھ مطابق ۹ر مئی ۱۸۹۲ء کو بہ حسابِ سنہ عیسوی ستتر سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا[۱۰] اور گل شہید کے قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔[۱۱]

تسلیم نے اردو اور فارسی نثر و نظم میں متعدد تصنیفات و تالیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں لیکن ادبی دنیا میں ان کی شہرت و عظمت ان کی تاریخ گوئی کی بدولت قائم ہے۔ شعر گوئی کی ابتدا انھوں نے کس عمر میں کی، اس سلسلے میں ان کا کوئی واضح بیان موجود نہیں۔ البتہ ایک قطعۂ تاریخ سے جو انھوں نے بہ زمانۂ مکتب نشینی چودہ سال کی عمر میں کہا تھا اور جس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''چوں بہ گوشِ استاد رسید، خوش گردید و فوائدِ تاریخ تعلیم فرمود''،[۱۲] یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ چودہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے انھیں شعر کہنے کی اچھی خاصی مشق ہو گئی تھی۔ دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں اپنا کلام بھی بہ غرضِ اصلاح اپنے فارسی کے استاد میر عارف علی عارفؔ امروہوی کو دکھانے لگے تھے۔ بعد میں انیس سال کی عمر میں وہ باقاعدہ طور پر مصحفی ہی کے ایک اور شاگرد شیخ علی بخش بیمارؔ (متوفّٰی ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء) کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے[۱۳] اور جب تک وہ زندہ رہے ان سے رشتۂ تلمذ استوار رکھا۔ فارسی کی ایک غزل کے مقطعے میں بیمارؔ سے اس اکتسابِ فیض کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہست تسلیم ز فیضِ بیمارؔ غزلِ تازہ کہ انشا کردم

ابتدا میں تسلیم اپنے نام کا جزوِ اول انوارؔ بہ طور تخلص استعمال کرتے تھے چنانچہ متذکرۂ بالا قطعۂ تاریخ میں جو ان کی شاعری کا قدیم ترین دستیاب نمونہ ہے، انھوں نے یہی تخلص نظم کیا ہے۔ احمد حسین سحرؔ کاکوروی نے بھی اپنے تذکرے 'بہارِ بے خزاں' (مرتبہ ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء) میں ان کا ذکر اسی تخلص کے تحت کیا ہے لیکن آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ''اکنوں تسلیم تخلص می کند''۔[۱۴]

تسلیم انتہائی غیور طبع اور وارستہ مزاج انسان تھے۔انھوں نے تاعمر تصنیف وتالیف کے علاوہ کسی اور مشغلے سے سروکار نہ رکھا لیکن جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ ان کی مزاجی کیفیت کی بدولت خود انھی کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ان کی مالی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ اپنی کتابیں خود چھپوائیں اور یہ بات ان کے مزاج کے خلاف تھی کہ وہ اس کام کے لیے اپنے تعلقات وذرائع کا سہارا لیں۔چنانچہ منشی نول کشور جیسے معروف وممتاز ناشر سے انتہائی قریبی روابط کے باوجود انھوں نے اپنی کسی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اپنی طرف سے کبھی کوئی سلسلہ جنبانی نہیں کی۔مطبع سے وابستگی کے زمانے میں ان کی جو دو کتابیں (مثنوی سعدین وتاج المدائح) وہاں سے شائع ہوئیں، ان کی اشاعت میں بہ ظاہر ان تعلقات کا کوئی دخل نظر نہیں آتا۔تصنیف وتالیف میں غیر معمولی انہماک اور کتابوں کی اشاعت کے معاملے میں بے نیازی کے اس رویّے کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے جمع شدہ تحریری سرمائے کو وقتاً فوقتاً نذرِ آتش کرتے رہتے تھے۔چنانچہ نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کے نام ایک عرض داشت مورخہ ۱۱ر ستمبر ۱۸۸۲ء میں اپنے اس معمول کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس مدّاحِ خرد دشمن نے لکھنؤ میں ۲۵ر اگست ۱۸۷۵ء کو چار سو باسٹھ جز نظم ونثر اردو وفارسی اپنی تصنیف وتالیف کے جلا دیے۔ بارِ دیگر یکم ستمبر ۱۸۸۲ء کو بہ مقام مرادآباد دو بستے پھونک ڈالے جن میں مسودات کے سوا یہ کتابیں مرتب ومکمل تھیں:
>
> (۱) مثنویِ اردو، نو ہزار بیت کی (۲) دیوانِ فارسی، متن وحاشیہ بیس جز (۳) دیوانِ اردو، متن وحاشیہ پچاس جز (۴) رسالہ قواعدِ تاریخ گوئی، انیس جز۔''[۱۵]

اپنی اولادِ معنوی کے ساتھ شقی القلبی کے اس پیہم مظاہرے کے باوجود تسلیم نے تحریر وتصنیف کا سلسلہ آخر عمر تک بہ دستور قائم رکھا۔اپنے اس شغل کو انھوں نے ایک جگہ ''چراغِ تازہ درکاشانۂ شوق افروختن'' سے تعبیر کیا ہے۔[۱۶] شوق کی اسی تازہ کاری کا نتیجہ تھا کہ یکم ستمبر ۱۸۸۲ء کے حادثے کے بعد اگلے چار ساڑھے چار سال میں ایک بار پھر

فارسی واردو کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ 'کتاب درقواعدِ نظم ونثرِ فارسی' کے خاتمے میں انھوں نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

''دوبار اجزائے نظم ونثر تصنیف وتالیفِ خود را کہ زائد از شش صد جز بود، پیراہنِ شعلۂ آتش ساختہ ام وبعد آں کہ بہ حکمِ شغل بے کاری جمع شدہ، تفصیلِ آں این است:

نمبرا۔ رسالہ درفن تاریخ گوئی، نہ جز، نمبر۲۔ خوابِ اردو، پنج جز، نمبر۳۔ دیوانِ فارسی شش جز متن وحاشیہ، نمبر۴۔ دیوانِ اردو، شانزدہ جز، نمبر۵۔ رسالہ حاملِ ہفت صد سوال مع جواب، نمبر۶۔ مثنویِ اردو، دہ ہزار وشش صد وشست ویک بیت، نمبر۷۔ نظم ونثر فارسی واردو، ہفتا دو یک جز، نمبر۸۔ بہارِ ہند، مصطلحاتِ اردو، یک صد وسی جز، نمبر۹۔ کتابِ ہٰذا درقواعدِ نظم ونثر، ہفتدہ جز''

سہ کتاب چوں جاں درقالبِ طبع آمدہ اند:

نمبرا۔ مثنویِ سعدین، اردو، نمبر۲۔ تاج المدائح، فارسی نظم ونثر درمدحِ والیِ رام پور، نمبر۳۔ مثنویِ فارسی درمحامدِ والیۂ بھوپال۔''[۱۷]

ہفت روزہ 'نیر اعظم' میں اس خاتمے کی اشاعت کے بعد تسلیم مزید پانچ سال زندہ رہے۔ ظاہر ہے کہ معمول کے عین مطابق یہ زمانہ بھی خدمتِ لوح وقلم سے بے تعلقی کی حالت میں نہ گزرا ہوگا لیکن اس زمانے میں انھوں نے کیا کہا اور کیا لکھا، اس سلسلے میں مطلقاً کوئی معلومات موجود نہیں۔ ان کے انتقال کے بعد دستبردِ زمانہ سے بچے ہوئے سرمائے کے طور پر صرف دو کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئیں۔ یہ دونوں فنِ تاریخ گوئی سے متعلق ہیں۔

تسلیم کی شائع شدہ کتابوں میں سے تین کا تعلق فارسی زبان وادب سے ہے۔

ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) تاج المدائح: یہ کتاب جو بہ قولِ مصنف ''بہ ایمائے فیض پیرائے (نواب کلب علی خاں) والیِ رام پور'' لکھی گئی تھی، ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں مطبعِ منشی نول کشور، لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا بابِ اول ''سخن و اقسامِ آں'' کے بیان پر اور بابِ دوم ''ہر آنچہ بہ ریاست لازم و ملزوم است'' کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس دوسرے باب میں ان معروف و ممتاز عالموں، شاعروں، خوش نویسوں، مصوّروں اور موسیقاروں کا ذکر بھی آ گیا ہے جو نواب کلب علی خاں کے دورِ حکومت میں متوسلین ریاست میں شامل تھے۔ یہ دونوں ابواب ۱۲۸۳ھ/ ۶۷-۱۸۶۶ء کے لکھے ہوئے ہیں۔ بابِ دوم کے اختتام پر 'ضمیمۂ تاج المدائح' کے عنوان سے بہ تفصیلِ ذیل مصنف کی سات مختلف نگارشات شاملِ کتاب ہیں:

(۱) نثر در بیانِ قلت بارش و خشک سالی (۲) ذکرِ زمستاں (۳) ذکرِ شدتِ تابستان (۴) ذکرِ خزاں (۵) بہار (۶) شورشِ عشق (۷) برشگال

ان میں سے 'ذکرِ زمستاں' اور 'شورشِ عشق' واضح طور پر ۱۲۷۶ھ/ ۶۰-۱۸۵۹ء یعنی زمانۂ قیامِ رام پور کی تصنیف ہیں۔ آخری تحریر 'برشگال' ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء میں لکھنؤ میں لکھی گئی تھی۔ باقی چاروں تحریریں بھی بہ ظاہر ۱۲۷۶ھ/ ۶۰-۱۸۵۹ء ہی کی یادگار معلوم ہوتی ہیں۔ کتاب کا اختتام ''معمّا بہ اسمِ سامی و نامِ نامی حضرت نواب کلب علی خاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ'' پر ہوا ہے۔ یہ آٹھ اور سات اشعار کے دو فارسی قطعات پر مشتمل ہے جو کتاب کے سالِ طبع یعنی ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۲ء میں نظم کیے گئے ہیں۔ کتاب میں ان دو قطعوں کے علاوہ، مثنویات، رباعیات، قطعات اور متفرق اشعار کی صورت میں مصنف کے کلام کے اور نمونے بھی موجود ہیں۔

(۲) تاج الکلام: یہ مثنوی نواب شاہ جہاں بیگم رئیسۂ بھوپال کے زیرِ تعمیر قصر ''تاج محل'' کے جشنِ افتتاح کے موقع پر پیش کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ لیکن جشن کے انعقاد میں بہ وجوہ تاخیر ہوتی رہی، اس لیے سرکار عالیہ کے حسب الحکم اسے پہلے ہی

۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں سرکاری چھاپے خانے موسوم بہ مطبعِ صدیقی سے شائع کرکے ''مشتاقانِ چشم براہ'' کی خواہش پوری کردی گئی۔ ''تاج الکلام'' بہ ظاہر مدحیہ مثنویوں کے زمرے میں آتی ہے۔ خود مصنّف نے بھی اسے ''محامدِ والیۂ بھوپال'' سے منسوب کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے کل ایک ہزار چودہ اشعار میں سے صرف باسٹھ شعر ''ذکرِ صاحب رائے صائب، مربیِ اہلِ مصائب فرماں روائے بھوپال'' کی مدح کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ انچاس شعروں میں ان کے شوہر نواب صدیق حسن خاں کی مدح اور چھبیس اشعار میں منشی سید عبدالعلی، نائبِ ریاست کی تعریف کی گئی ہے۔ باقی آٹھ سو ستتر اشعار ریاست و متعلقینِ ریاست کی تفصیل و توصیف پر مشتمل ہیں۔ حافظ خان محمد خاں شہیرؔ شاگردِ غالبؔ نے اپنی تقریظ میں اس مثنوی کی مجموعی کیفیت ان الفاظ میں بیان کردی ہے:

> ''کسے کہ دیدنی ہائے بھوپال راندیدہ باشد، دریں کتاب بنگرد..... وہر کہ بہ کا ملانِ ایں دیار نرسیدہ باشد، بحسنِ عبارتش ببیند..... ہر یکے رابداں الفاظِ فراخورِ حالت یادکردہ کہ بہ آں درخور و قابل است۔''[۱۸]

ملخّصِ تسلیم: یہ فنِ تاریخ گوئی سے متعلق تسلیمؔ کی وہ جامع اور مبسوط تصنیف ہے جس کی بدولت انھیں اس فن کے ماہرین میں مقامِ بلند حاصل ہوا ہے۔ تسلیمؔ نے اس کی تسوید کا کام بہ قولِ خود انہتر سال کی عمر میں یعنی ۱۲۹۹ھ میں شروع کیا تھا۔ تکمیل کے بعد ''ملخّصِ تسلیم'' اس کا نام رکھا گیا، جس سے ۱۳۰۰ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ مصنّف کے انتقال کے بعد منشی امجد علی مالکِ اخبار نیرِ اعظم و مطبعِ مطلع العلوم، مرادآباد کو اس کا مسوّدہ ان کے شاگرد راجا کشن کمار وقارؔ کے کتب خانے سے حاصل ہوا، جسے انھوں نے منشی شاکر حسین نکہتؔ برادر زادۂ مصنّف کی تصحیح و نظرِ ثانی کے بعد دسمبر ۱۸۹۶ء/ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۴ھ میں اپنے مطبعے سے شائع کردیا۔ یہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ حصّۂ اول میں مصنف نے فنِ تاریخ گوئی کے اصول و قواعد سے بحث کی ہے۔ حصّۂ دوم ''مخترعاتِ مولّف'' پر مشتمل ہے۔ 'کتاب در قواعدِ نظم و نثر' کے خاتمے میں تسلیمؔ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''درفنِ تاریخ گوئی (ونیز درنظم ونثر) بسیار قاعدہ مستخرجۂ طبعِ من
است۔ممکن نیست کہ در بطلانِ دعویم مدّعی کتابے درسند آرد۔''[19]

یہ کتاب ان کے اس دعوے پر مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہے۔

ان تین کتابوں کے علاوہ تسلیم کی فارسی نثر ونظم کے متعدد نمونے مطبع نول کشور کی مطبوعہ کتابوں کی منثور ومنظوم تقریظوں اور قطعاتِ تاریخ نیز مرادآباد اور لکھنؤ کے معاصر اخبارات میں شائع شدہ متفرق نگارشات کی صورت میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ان کے ایک فارسی دیوان کی نقل بھی موجودہ صدی کے عشرۂ چہارم تک ان کے ایک شاگرد مرزا احمد شاہ بیگ جوہر مرادآبادی کے پاس محفوظ تھی لیکن ہمیں باوجود تلاش اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔گمانِ غالب یہ ہے کہ اسی طرح ان کی باقی ماندہ دیگر تصانیف بھی اب ضائع ہو چکی ہیں۔

حواشی

۱ ملخّصِ تسلیم، مطبعِ مطلع العلوم، مرادآباد، ۱۸۹۶ء، ص۸۲.....و.....مضمون بہ عنوان 'تسلیم سہسوانی' از مرزا احمد شاہ بیگ جوہر، شاگردِ تسلیم، مشمولہ سہ ماہی 'العلم' کراچی، شمارہ اپریل تا جون ۱۹۷۱ء، ص ۱۱۷

۲ سہ ماہی 'العلم'، شمارہ مذکور الصّدر، ص ۱۱۷

۳ بہ حوالہ تحریر دستی منشی شاکر حسین نکہت، برادر زادۂ تسلیم، مملوکہ راقم

۴ ملخّصِ تسلیم، ص ۳۳ ۵ سہ ماہی 'العلم' شمارہ مذکور الصّدر، ص ۱۱۶

۶ بہ حوالہ 'اودھ اخبار'، شمارہ ۱۶/جون ۱۸۶۸ء

۷ مکتوبِ مرزا رجب علی بیگ سرور بنام تسلیم، مشمولہ ماہ نامہ 'خیاباں'، لکھنؤ، شمارہ مارچ ۱۹۳۴ء، عکس بالمقابل ص ۱۴۶

۸و۹ ہفت روزہ 'نیر اعظم'، مرادآباد، شمارہ ۷/نومبر ۱۸۸۱ء

۱۰ یادداشت منشی شاکر حسین نکہت، برادر زادۂ تسلیم

۱۱ سہ ماہی 'العلم'، شمارہ مذکور الصّدر، ص ۱۱۶

۱۲ ملخّصِ تسلیم، ص ۸۲ ۱۳ سہ ماہی 'العلم'، شمارہ مذکور الصّدر

۱۴ بہارِ بے خزاں، مرتبہ حفیظ عباسی، مجلسِ اشاعتِ ادب، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۴۸

۱۵ ہفت روزہ 'تہذیب'، مرادآباد، شمارہ ۴/اکتوبر ۱۸۸۲ء

۱۶ ملخّصِ تسلیم، ص ۶

۱۷ خاتمۂ 'کتاب درقواعدِ نظم ونثر'، بہ حوالہ ہفت روزہ 'نیر اعظم' شمارہ ۲۵/اپریل ۱۸۸۷ء

۱۸ مثنوی 'تاج الکلام'، مطبعِ صدیقی، بھوپال، ۱۸۸۵ء، ص ۴۷

۱۹؎ خاتمۂ 'کتاب درقواعدِ نظم ونثر' بہ حوالہ سابق

۲۰؎ سہ ماہی 'العلم'، شمارہ مذکورالصّدر، ص ۱۱۶

(برائے 'دانش نامۂ زبان وادبِ فارسی درشبہ قارّہ' مرسلہ ۲۳؍نومبر ۱۹۹۸ء)

محاکمۂ تسلیم سہسوانی بہ مقدمۂ دبیر و انیس

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی (ولادت: جون ۱۸۱۰ء۔ وفات: مئی ۱۸۹۲ء) فن تاریخ گوئی کے اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن یہ ان کی شخصیت کا صرف ایک پہلو تھا جو اس موضوع سے متعلق ان کی دو کتابوں کی اشاعت کی وجہ سے زیادہ نمایاں ہو کر اہل علم کے سامنے آیا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک جامع الحیثیات مصنّف تھے جو فارسی و اردو دونوں زبانوں میں بیشتر رائج الوقت اصنافِ ادب پر استادانہ دسترس رکھتے تھے۔ نظم میں غزل اور مثنوی اور نثر میں تقریظ، انشائیہ، افسانہ، تذکرہ نویسی، مضمون نگاری، لغت اور صحافت ان کی دلچسپی کے وہ خاص موضوعات تھے جن کی صورت گری میں ان کا قلم کسی وقفے کے بغیر ساٹھ سال سے زیادہ عرصے تک رواں دواں رہا لیکن اپنی اولادِ معنوی کے ساتھ ان کا سلوک اس قدر غیر متوقع اور حیرت ناک تھا کہ اس کا تصور بھی سوہانِ روح ہے۔ ایک متوسط زمین دار گھرانے سے تعلق اور مزاج کی قلندرانہ ساخت کی بنا پر انھوں نے تا عمر لکھنے پڑھنے کے علاوہ اور کسی کام سے سروکار نہ رکھا، اس کے باوجود ان کی عمر بھر کی کمائی کا حاصل کل پانچ کتابیں ہیں جن میں فنِ تاریخ گوئی سے متعلق دو کتابوں ''ملخّصِ تسلیم'' اور ''عدد التاریخ'' کے علاوہ صنائع و بدائع اور چند انشائیوں پر مشتمل فارسی نثر کی ایک کتاب ''تاج المدائح''

اور فارسی و اردو کی دو مثنویاں ''تاج الکلام'' اور ''سعدین'' شامل ہیں۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وقتی رجحان طبیعت کے مطابق دو ایک موضوعات کا انتخاب کرتے اور ان پر خامہ فرسائی شروع کر دیتے، جب وہ کتابیں مکمل ہو جاتیں تو کسی اور موضوع پر طبع آزمائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس طرح جب چار چھ ہزار صفحات پر مشتمل مسودات یکجا ہو جاتے تو انہیں بڑی بے نیازی کے ساتھ نذرِ آتش کر دیتے۔ راجہ شمشیر بہادر آخگر رئیس اجے گڑھ نے جو اس قسم کے ایک واقعے کے عینی شاہد تھے، جب ان سے پوچھا کہ منشی صاحب ایسا کس واسطے کیا جاتا ہے؟ تو ان کا جواب تھا کہ ''ارے بھائی اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں گا جو انھیں شائع کراؤں''۔ اس سلسلے میں یہ امر بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ تسلیم تقریباً سولہ برس اپنے زمانے کے مشہور ترین اشاعتی ادارے مطبعِ نول کشور سے وابستہ رہے اور اس عرصے میں بھی انھوں نے زیادہ تر مطبع کی شاخِ کان پور کے مہتمم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مزید براں اس مطبع میں ان کی حیثیت ایک عام ملازم کی نہیں تھی، مرزا رجب علی بیگ سرور کے بقول وہ منشی نول کشور کے ''رفیق و ہمدم'' کا درجہ رکھتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی درویش مزاجی اور خودنگہداری نے انھیں کبھی اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی اس حیثیت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی تصانیف کی اشاعت کی کوئی راہ نکالیں۔ ان کی قناعت پسندی کا تو یہ عالم تھا کہ اس پوری ملازمت کے دوران انھوں نے روزمرہ کے معمولی اخراجات کے لیے درکار محدود رقم کے علاوہ کبھی کوئی باقاعدہ مشاہرہ قبول کرنا بھی پسند نہیں کیا۔

تسلیم کی یہ افتادِ طبع شہرت و مقبولیت کے اعتبار سے ان کی ہمہ جہت شخصیت کے پوری طرح بروے کار آنے میں حائل رہی۔ انھوں نے اپنی کسی کتاب یا کسی تحریر کو قارئین کے لیے عام کرنے یا محفوظ رکھنے کی شعوری طور پر کبھی کوئی کوشش نہیں کی البتہ آخری دور کے وہ چند مسووات جو تکمیل کے بعد اتفاقاً کسی شاگرد یا قدر شناش کے قبضے میں آ گئے یا وہ تحریریں جو کسی ہنگامی ضرورت یا وقتی محرک کے تحت معاصر اخبارات میں شائع ہو گئیں، بہ ایں وجہ اس کلّیے سے مستثنیٰ رہیں کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی سرد مہری یا بے دردی کا مظاہرہ ان کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ فنِ تاریخ گوئی سے متعلق دونوں شائع شدہ کتابیں جن کے

مسودے ان کے دو شاگردوں راجا کشن کمار وقارؔ رئیسِ مرادآباد اور مرزا احمد شاہ بیگ جوہرؔ مرادآبادی کے پاس محفوظ تھے، اسی زمرے میں آتی ہیں۔ اس سلسلے کے باقی مسودات یا تو شدائدِ زمانہ کی تاب نہ لاکر بالآخر ضائع ہوگئے یا کسی ایسے ادبی دفینے کا حصہ بن چکے ہیں جس تک رسائی ناممکن ہے۔ اخبارات میں شائع شدہ جن تحریروں کے تراشے مختلف واسطوں سے گزر کر کسی قدر شکستہ و بوسیدہ حالت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ ان میں ایک اہم مضمون ''محاکمۂ تعلیم سہسوانی بہ مقدمۂ دبیرؔ و انیسؔ'' بھی شامل ہے، جس کا تعارف فی الوقت مقصود ہے۔

اس مضمون کی تحریر اور اشاعت کا پس منظر یہ ہے کہ ''ایک صورت نادیدہ اور نام ناشنیدہ لکھنوی'' نے کسی ''راقمِ گمنام'' کا لکھا ہوا ایک مضمون جس میں میر انیسؔ کے دو اور مرزا دبیرؔ کے ایک بند کی روشنی میں ان دونوں مرثیہ نگاروں کے طرزِ شاعری اور معیارِ کلام کا موازنہ کیا گیا تھا، اس فرمائش کے ساتھ تسلیم کے پاس بھیجا تھا کہ وہ اس کے متعلق ''اپنی رائے ظاہر کر کے مرادآباد کے کسی اخبار میں چھپوائیں'' اور مضمونِ مطبوعہ کی ایک کاپی انہیں بھی بھیج دیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی گئی تھی کہ اصل کاغذ ''بہ صیغۂ بیرنگ'' جلد واپس کریں کہ ''صاحبانِ لکھنؤ بھی قلم سے کام لیں گے۔'' تسلیمؔ نے ان کے اس ارشاد کی تعمیل کو اس خیال سے وقتی طور پر ملتوی رکھا کہ دیکھا جائے لکھنؤ والے اس مضمون کے متعلق کس ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جب تین مہینے تک ادھر سے صدائے برنخاست کا عالم رہا یعنی لکھنؤ کے کسی اخبار میں اس موضوع پر کوئی مضمون شائع نہیں ہوا تو انھوں نے اپنے تأثرات قلمبند کر کے بہ غرضِ اشاعت ہفتہ روزہ ''نجم الہند'' مرادآباد کے ایڈیٹر کو بھیج دیے جس نے انھیں اس اخبار کے ۷؍مئی ۱۸۸۸ء کے شمارے میں شائع کر دیا۔

تسلیمؔ نے اپنے اس جوابی مضمون میں دو شاعروں کے درمیان موازنۂ کلام کے جواز پر کئی اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے لکھنوی مضمون نگار کے اس دعوے پر کہ ''محاکمہ انصاف کے ساتھ ہوگا، جس میں تعصّب کی بو نہ ہوگی، طرف داری کی چھینٹ نہ ہوگی''، تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ظاہراً و باطناً یہ دعویٰ اس وقت سر اٹھا سکتا

ہے کہ حَکَم اپنے مذاقِ طبیعت کو بالائے طاق رکھ دے اور یہ غیر ممکن۔'' آئندہ سطور میں اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

''ایسے دو شخصوں کے کلام میں جن کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں سے گزر چکی ہے، وہی شخص محاکمہ کر سکتا ہے جو اپنے مذاقِ طبیعت کو دخل نہ دے اور ہر مصرعے اور ہر ٹیپ اور ہر بند کو اسی مذاق اور اسی حیثیت پر دیکھے جس پر داز پر وہ کہے گئے ہیں، نہ موافق اپنے مذاقِ طبیعت کے۔ (اور).....ایسی صفت کے شخص کا دستیاب ہونا دہانِ محبوب اور کمرِ معشوق (کے ہاتھ آنے) سے کم نہیں۔''

اس تفصیل سے قبل فارسی کے بعض مشہور شعرا کے حوالے سے اختلافِ طبائع اور انفرادِ مذاق کی چند مثالیں پیش کر کے اس بنیادی نکتے کی اس طرح وضاحت کی جا چکی ہے:

''بعض حضرات روزمرہ وزبان کہتے ہیں جیسے حافظؔ شیراز و شیخ سعدیؔ اور بعض تشبیہ واستعارہ پسند کرتے ہیں جیسے شوکتؔ بخاری اور بدرالدین چاچی۔ بعض معنی و حاصل پر جان دیتے ہیں جیسے نظیریؔ وظہوریؔ، جلال اسیرؔ نازک خیالی کا شیفتہ، شیخ علی حزیںؔ فربہ مضامین کا فریفتہ، صائبؔ مثال کا مخترع، خاقانیؔ اغلاق کا مبدع۔ ایسا ہی حال اردو میں ہے۔''

مضمون نگار کے مختلف بیانات پر سلسلہ بہ سلسلہ گفتگو کے بعد اگلے مرحلے میں انھوں نے اپنے طور پر انیسؔ و دبیرؔ کے اختلافِ مذاق اور اس کی روشنی میں دونوں کے کلام کے بنیادی فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے مدِّ نظر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مختلف رنگِ سخن کے حامل ان دو شاعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے سے بہتر و برتر ثابت کر دینا از روے انصاف ممکن نہیں۔ اپنا یہ مدلّل فیصلہ انھوں نے ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے:

''اردو گوئی اور فارسی گوئی اہلِ زبان کی باہم دیگر ایسی ہے جیسے کوئی آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہو، یعنی ایک ہی رنگ ہے اور ایک ہی طرز ہے، تشبیہ و استعارہ و سلاست و روزمرہ پر نظر رکھنا۔ تشبیہ و

استعارہ سے کوئی کلام خالی نہیں ہوسکتا، اس واسطے کہ معنی و بیان کا مدار انھی دو پر ہے، قلت و کثرت دوسرا امر ہے۔ غرض یہی رنگ ان دونوں بزرگوں نے آپس میں بانٹ کر اپنا اپنا حصہ کر لیا اور اپنے اپنے مقام پر ہر ایک نے اپنے رنگ کا برتاؤ ویسا ہی کیا جیسا اس کا حق تھا۔ الحاصل جس شخص کا مذاق فارسی میں حافظؔ و سعدیؔ کو پسند کرتا ہے، اس کے نزدیک میر انیسؔ لاکھوں میں انتخاب اور جس کا مذاق ظہوریؔ و نظیریؔ پر غش ہے، اس کے نزدیک مرزا دبیرؔ لاجواب۔''

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انیسؔ زبان اور روزمرہ کے شاعر ہیں اور دبیرؔ اختراعِ مضامین و ابداعِ خیال کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گویا ان دونوں شاعروں نے اپنے اپنے قصرِ شاعری کی تعمیر دو بالکل مختلف النوع بنیادوں پر کی ہے، اس لیے ان کے ہاں وحدتِ موضوع کے باوجود وہ حقیقی مماثلتیں مفقود ہیں جو موازنے کے لیے شرطِ اول کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مضمون کے آخر میں تسلیمؔ نے مرزا دبیرؔ کا ایک بند انتخاب کر کے اس پر چار اعتراضات وارد کیے ہیں، لیکن ان اعتراضات کا مبدا و منشا دبیرؔ کے کلام کے نقائص نہیں، لکھنوی مضمون نگار کی کج فکری و کج بحثی ہے۔ اپنے مزاج اور موقف کے برخلاف گفتگو کے اس خاص رخ کا جواز پیش کرتے ہوے انھوں نے لکھا ہے:

''جو کہ گمنام صاحب نے دو بند پر میر انیسؔ کے اور ایک بند پر مرزا دبیرؔ کے اپنی گدبدی بکرِ فکر کو ابھارا کہ اس نے بڑے ٹھسّے کی چٹک مٹک سے انگلیاں چمکائیں، ہم بھی انگلی کاٹ شہیدوں میں ملتے ہیں، تعداد پوری کرنے کو مرزا صاحب کے ایک بند پر چار اعتراض کرتے ہیں۔ اہلِ مذاق ملاحظہ فرمائیں، ہنسی کے منہ کو ٹانکے لگائیں۔''

''انگلی کاٹ شہیدوں میں شامل ہونے'' اور ''ہنسی کے منہ کو ٹانکے لگانے'' کی بات سے صاف ظاہر ہے کہ تسلیمؔ کا مقصد کلامِ دبیرؔ کی تنقیص یا خوردہ گیری نہیں، اعتراض برائے

اعتراض کے اس رجحان کی بیخ کنی ہے جو گروہ بندی اور جنبہ داری کے ماحول میں پرورش پاتا ہے اور کوتاہ فکری و تنگ نظری سے تقویت حاصل کر کے دوسروں کے لیے گم راہی کا سامان فراہم کرتا ہے۔

اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے کہ تسلیم کے ان اعتراضات کی اصل نوعیت کیا ہے اور ان میں کس حد تک سنجیدگی پائی جاتی ہے، ان میں سے صرف پہلے اعتراض کا حوالہ کافی ہوگا۔ یہ اعتراض زیرِ تبصرہ بند میں استعارے کے پیچ در پیچ عمل سے متعلق ہے۔ عام تصور کے مطابق مرثیے کی اصل غرض و غایت رونا رلانا اور اس طرح شہدائے کربلا کی یاد تازہ رکھنا ہے، اس لیے اصولاً اسے جملہ تکلّفات سے عاری اور راست طرزِ بیان کا حامل ہونا چاہیے۔ اس پس منظر میں تسلیم استعارے کے اس تفاعل کو ''کوہے کندیدن و کاہے برآوردن'' کا مصداق قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس تکلّف کو تکلیف دینا کیا ضرور تھا۔ صاف صاف کہتے اور صاف بھی ایسا۔ شعر
>
> چشمانِ تو زیر ابر و انند دندانِ تو جملہ در دہانند
>
> کہ عام لوگ سمجھتے۔ میر پیٹو مجلسِ عزا گرم کرتے۔ ہائے ہائے کا شور و غوغا، بسمل کی طرح تڑپنا ہوتا۔ مویا گری نعاتِ عربی و فارسی سے بے نیاز ہے، نہ صنائع بدائع کی محتاج۔''

معلوم یہ ہوتا ہے کہ گمنام لکھنوی معترض کا تعلق حامیانِ دبیر کے گروہ سے تھا اور ان کے اعتراضات کا ہدف میر انیس تھے، لیکن اپنی اس خوردہ گیری کو مبنی بر انصاف اور خالی عن الاعتساف ثابت کرنے کے لیے انھوں نے رسماً مرزا دبیر کے ایک بند کی چند خامیوں کی طرف بھی اشارے کر دیے تھے۔ بہ ظاہر ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ معروف اربابِ قلم میں سے کچھ لوگوں کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلا کر اور انھیں اپنے ان دلائل سے متاثر کر کے ان سے اپنے حسبِ منشا مضامین لکھوا لیے جائیں اور اس طرح اپنے ممدوح کی برتری ثابت کر کے حریفوں کے بالمقابل اپنا سر بلند رکھا جائے۔ تسلیم کے مضمون سے ان کی یہ توقعات

پوری نہیں ہوئیں، اس لیے غالباً یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ موجودہ معلومات کے مطابق تسلیم کا زیر بحث مضمون موازنۂ انیس و دبیر کے سلسلے کی اولین دستیاب تحریر ہے۔ اس اعتبار سے اس کی اہمیت مسلّم ہے، لہٰذا بہ نظرِ تحفظ و استفادۂ عام اسے مِن وعَن سطورِ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ایک صاحب صورت نادیدہ، نام ناشنیدہ لکھنوی نے بہ ایمائے قدردانی و بہ خیالِ منزلت افزائی عنایتِ غائبانہ کا کرّ و فر دکھایا، میرے ذرۂ ناچیز کو آفتاب اور قطرۂ باطل الحقیقت کو دریا بنایا۔ شرح اس بیان کی یہ ہے کہ مضمون ریختۂ قلمِ جادو کار بلکہ اعجاز نگارِ حضرت راقمِ گمنامِ بے نشاں بہ ایں ارشاد بھیجا کہ بندۂ نحیف نسبتِ مضمونِ موصوفہ اپنی رائے ظاہر کر کے مرادآباد کے کسی اخبار میں چھپوائے اور بہ ارسالِ مطبوع اعزازِ امتیاز حاصل کرے اور اصل کاغذ بہ صیغۂ بیرنگ جلد واپس کرے کہ صاحبانِ لکھنؤ بھی قلم سے کام لیں گے۔ شکریۂ یادفرمائی کے بعد عرض کرتا ہوں کہ تیسرا مہینا تمام ہونے پر ہے۔ لکھنؤ کے کسی اخبار میں وفائے وعدہ کا نشاں نہ دیکھا۔ ناچار سبقت کرتا ہوں ؎

ہے جو شاعر کی طرف، منصف نہیں نکتہ ور ہے شعرِ موزوں کی طرف

واقعی مضمون لطف مشحوں مرتبۂ اعلیٰ اور رتبۂ بالا پر ہے۔ فقروں کی چستی، جملوں کی درستی دل لبھاتی ہے۔ نشست و برخاستِ الفاظِ ترکانی لحاظ دیوانہ بناتی ہے۔ طبعِ مستی زا کی شوخیاں محبوبوں کی دلاویز انگیزوں سے سوا۔ ہر کنایہ کا نکیلا تیور حسینوں کی کن انکھیوں کی چھیڑ چھاڑ دکھانے والا۔ لیکن بعض جملۂ معترضہ نے قیامت ڈھائی ہے کہ خبر نے ان کی محبت میں مبتدا سے آنکھ چرائی ہے۔ کلکِ کوتاہ عبارت انگریزی طور کی بلاغت میں اچھی ہے اور بہت اچھی ہے۔ رہا نفسِ مضمون، وہ اپنی اپنی رائے کی جلوہ انگیزی و کرشمہ بینری ہے۔

اس وقت مضمونِ موصوفہ میں علاوہ ان فقراتِ دل ربا اور خاطر فریب کے جن کے حاصلِ معنی بڑے لق و دق میدانِ بیان میں ہر طرف راستہ بہکانے پر تلے کھڑے ہیں، اُس پر غور کی جاتی ہے جس کا اقرار بہ قسم کیا ہے کہ ''محاکمہ انصاف کے ساتھ ہوگا، جس میں

تعصّب کی بو نہ ہوگی، طرف داری کی چھینٹ نہ ہوگی''، ہے یا نہیں۔ ظاہراً و باطناً یہ دعویٰ اس وقت سر اٹھا سکتا ہے کہ حَکَم اپنے مذاقِ طبیعت کو بالائے طاق رکھ دے اور یہ غیر ممکن۔ اس جملۂ بالا جمال کی تفصیل آگے ہوگی۔ اصحابِ حق بیں اور اربابِ انصاف گزیں ملاحظہ فرمائیں گے۔ مناسبِ موقع و محلِ واقعی ایک حکایت کا نقل کرنا واجب و لازم ہے:

مرزا محمد علی صائبؔ جن کے کمالات کا ذکر کرنا ایسا ہے جیسا آفتاب کی روشنی کے صفات بیان کیے جائیں، ان بزرگ سے کسی نے کہا کہ آپ اپنے کلام کا انتخاب کر دیجیے۔ انھوں نے فرمایا کہ میرا سب کلام منتخب ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ ڈیڑھ لاکھ سے سوا بیت ایک شخص کے نتائجِ طبع سے کیوں کر پسندیدہ و برگزیدۂ خلائق ہو سکتی ہے۔ آخر مرزا صاحب کی رائے سے یہ بات قرار پائی کہ ایک مجلّد میں یک رخہ اشعار لکھوا کر بازار میں رکھ دیے جائیں اور برابر مجلّد کے مقراض اور یہ بات مشتہر کی جائے کہ اس مجلّد میں جو شعر جس کو پسند آئے، کتر لے جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب میعادِ معیّنہ کے بعد مجلّد کو دیکھا تو بجز حلقۂ اوراق کوئی شعر نہ تھا۔

اس حکایت کی نقل سے یہ غرض ہے کہ طبائع مختلف، مذاق مختلف، بعض حضرات روزمرہ و زبان کہتے ہیں جیسے حافظِ شیراز و شیخ سعدیؔ اور بعض تشبیہ و استعارہ پسند کرتے ہیں، جیسے شوکتؔ بخاری و بدرالدین چاچی۔ بعض معنی و حاصل پر جان دیتے ہیں، جیسے نظیریؔ و ظہوریؔ۔ جلال اسیرؔ نازک خیالی کا شیفتہ، شیخ علی حزیںؔ فربہ مضامین کا فریفتہ، صائبؔ مثال کا مخترع، خاقانیؔ اغلاق کا مبدع۔ ایسا ہی اردو میں حال ہے جو لکھنؤ اور دہلی کی زبان میں ہو گیا۔ اب وہ موقع ملا کہ اس مجمل فقرے کی تفصیل کریں جس کو پیشتر لکھ چکے ہیں۔ ایسے دو شخصوں کے کلام میں جن کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں سے گزر چکی ہے، وہی شخص محاکمہ کر سکتا ہے جو اپنے مذاقِ طبیعت کو دخل نہ دے اور ہر مصرعے اور ہر ٹیپ اور ہر بند کو اسی مذاق اور اسی حیثیت پر دیکھے جس پر داز پر وہ کہے گئے ہیں، نہ موافق اپنے مذاقِ طبیعت کے۔ اس زمانۂ تنگ و تاریک میں ایسی صفت کے شخص کا دستیاب ہونا دہانِ محبوب اور کمرِ معشوق اور مجھ بیمار کی تندرستی سے کہ بڑھاپے کا منظر ہوں، ناتوانی کا پیکر ہوں، پائے بے حسی کا زنجیر

ہوں، اپنے اعمال کا تقدیر ہوں، کم نہیں۔ بہ فرضِ محال اگر کوئی شخص متصف بہ صفاتِ محمودہ و اوصافِ ستودہ ہو تو اس منصفانہ محاکمے کے لیے کافی فرصت کا ملنا عنقا کے شکار سے کم نہیں۔ اس بیان سے یہ مقصد نہیں کہ گمنام صاحب نے عادلانہ داد نہیں دی، الّا میر و مرزا کے مرتّبہ سنج کہہ سکتے ہیں کہ اس کے لکھنے والے نے اپنے مذاقِ طبیعت کے چونچلوں کو جوئی کی شمیم میں بسایا ہے۔ اگرچہ خوشبو بھینی بھینی ہے مگر دماغ کو مثلِ بوے سیر پریشان کرنا چاہتی ہے۔ ہر چند گمنام صاحب کی یہ رائے عمدگی میں ایک بلیغ مضمون کے شعر سے کم نہیں ہے بلکہ مضامینِ متینِ قصائدِ انوری و خاقانی سے زائد ہے: ''میر و مرزا کے بند ایک ہی مضمون کے ایک ہی مقام پر لکھے جائیں، پھر اس پر غور اور خوض آنکھ ڈالے۔'' اس تحصیلِ حاصل سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ جو میر صاحب کا رنگ پسند کرنے والا ہے، وہ اس پر سر دھنے گا، جس کا دل مرزا صاحب کی طرز پر لوٹ ہے، وہ اس پر جی دے گا۔ اب فرمائیے کہ اس بات کا فیصلہ کیوں کر ہو کہ دونوں میں کون اچھا ہے؟

گمنام صاحب نے دو بند میر صاحب کے لکھے اور ایک بند مرزا صاحب کا اور وہ بھی مختلف مضامین کے۔ واہ واہ، سبحان اللہ، من چہ می گویم و طنبورۂ من چہ می سراید۔ یہ بد عہدی زیرِ نگرانیِ خدائے تعالیٰ! بھلائی برائی آخر کو کہی جائے گی۔ ابھی ایک بھاری مقدمے کا فیصلہ کرنا ہے۔ وہ مقدمہ یہ ہے کہ گمنام صاحب نے اپنے منصفانہ محاکمے میں دونوں بزرگوں کے عیوب پر بھی خیالِ بلیغ و فکرِ رسا کا پرتو ڈالا ہے۔ اگرچہ اس کا رفعِ دخل بھی خود ہی کیا ہے۔ اس کا منصب فیصلہ کرنے کی حالت میں نہ رکھتے تھے کہ عیوب جو کچھ خشک و تر قرار دے، وہ اپنے مذاق کی بود و نمود کی نمائش گاہ ہیں۔ جب یہ ہے تو انصاف کہاں رہا۔ انصاف معدوم تو فیصلہ کیسا؟ سنیے صاحب! فیصلہ کیوں کر ہو کہ اشعار بہ منزلہ غذا کے ہیں۔ جس طرح لوگوں کو مختلف غذائیں بھاتی ہیں، اسی طرح اشعار بھی مختلف مطبوع و مرغوب، جو جس کو پسند آئے وہ اس کی غذا ہے۔ اس کا کہنے والا اس کے نزدیک اچھا ہے۔ ہاں پسند کرنے والے کا صاحبِ لیاقت ہونا مشروط ہے۔ لیاقت سیٹی بجانے والوں کی نہ ہو۔ یہی حال میر و مرزا کا ہے کہ جو جس کو پسند کرے وہ اس کے نزدیک افضل و اکمل ہے۔ اردو گوئی اور فارسی گوئی

اہلِ زبان کی باہم دیگر ایسی ہے، جیسے کوئی آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہو، یعنی ایک ہی رنگ ہے اور ایک ہی طرز ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے کوئی کلام خالی نہیں ہوسکتا، اس واسطے کہ معنی و بیان کا مدار انھی دو پر ہے۔ قلت و کثرت دوسرا امر ہے۔ غرض یہی رنگ ان دونوں بزرگوں نے آپس میں بانٹ کر اپنا اپنا حصہ کرلیا اور اپنے اپنے مقام پر ہر ایک نے اپنے رنگ کا برتاؤ ویسا ہی کیا، جیسا اس کا حق تھا۔ الحاصل جس شخص کا مذاق فارسی میں حافظؔ و سعدیؔ کو پسند کرتا ہے، اس کے نزدیک میر انیسؔ لاکھوں میں انتخاب اور جس کا مذاق ظہوریؔ و نظیریؔ پر غش ہے، اس کے نزدیک مرزا دبیرؔ لاجواب۔ اعتراض میں نہ ہرگلتی ہے نہ پھٹکری۔ واہی تباہی بکنے کو کیا چاہیے۔ نہ کوئی منہ مسلتا ہے، نہ تعزیراتِ ہند دباؤ ڈالتی ہے۔ گمنام صاحب ہر طرح آزاد ہیں، مرفوع القلم ہیں۔

نساخؔ صاحب ڈپٹی کلکٹر نے بھی میر و مرزا و شیخ ناسخؔ پر احکام محکمۂ شاعری کے جاری فرمائے مگر عدالت العالیۂ محاکمہ سے منسوخ ہوگئے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ اصحابِ متانت وارباب فطانت اعتراض کے کوچے میں قدم نہیں رکھتے ہیں۔ کبھی کسی نامی گرامی شاعر نے اپنی سنگینیِ وقار ہم ترازو کے مقابلے میں نہیں تولی۔ چھوٹی طبیعت والوں کا شیوہ ہے کہ بڑے دماغ والوں پر اعتراض کرنا اپنی بود و نمود سمجھتے ہیں۔ اس بدعتِ قبیحہ کے بادی متاخرین ہندی فارسی داں ہوے لیکن تشخص خاک میں مل گیا۔ مقولۂ مشہور صادق آیا کہ ''نہ کرد کہ نیافت''۔

جو کہ گمنام صاحب نے دو بند پر میر انیسؔ کے اور ایک بند پر مرزا دبیرؔ کے اپنی گدبدی بکرِ فکر کو ابھارا کہ اس نے بڑے ٹھسے کی چٹک مٹک سے انگلیاں چمکائیں، ہم بھی انگلی کاٹ شہیدوں میں ملتے ہیں، تعداد پوری کرنے کو مرزا صاحب کے ایک بند پر چار اعتراض کرتے ہیں۔ اہلِ مذاق ملاحظہ فرمائیں، ہنسی کے منہ کو ٹانکے لگائیں۔ وہو ہٰذا:

کوثر کا اشتیاق میں شہ کے یہ حال ہے — گویا وہ تشنہ لب ہے، یہ آبِ زلال ہے
یوں حورِ خلد غرفے سے محوِ جمال ہے — گویا وہ روزہ دار ہے اور یہ ہلال ہے
آوازِ پا کے دھیان میں رضواں خموش ہے

گویا یہ ہے اذاں، وہ نمازی کا گوش ہے

اعتراضِ اوّل: فرض کیا کہ بند حاملِ استعارہ ہے اور استعارہ بھی وہ جس کو اضافتِ مجازی کہتے ہیں چناں کہ سرِ ہوش و پائے فکر۔ ہوش وفکر کو شخص فرض کر کے اس کے واسطے ''سر'' و ''پا'' لائے۔ کوہے کندیدن وکاہے برآوردن کے یہی معنی ہیں۔ اس تکلّف کو تکلیف دینا کیا ضرور تھا۔ صاف صاف کہتے اور صاف بھی ایسا: شعر

چشمانِ تو زیرِ ابر و انند دندانِ تو جملہ در دہانند

کہ عام لوگ سمجھتے۔ میر پیٹو مجلسِ عزا گرم کرتے۔ ہائے ہائے کا شور وغوغا بسمل کی طرح تڑپنا ہوتا۔ مویا گری لغاتِ عربی وفارسی سے بے نیاز ہے، نہ صنائع بدائع کی محتاج۔

اعتراضِ دویم: آبِ زلال مبنی بر ہجوِ صریح وہجوِ قبیح، کس واسطے کہ اس لفظ نے کثیف الطبع ہونا مردمِ عرب کا ثابت کیا۔ (زلال اس کیڑے کا نام ہے جو برف میں پیدا ہوتا ہے۔ عرب والے ان کیڑوں کو نچوڑ کر پانی پیتے ہیں۔ دیکھو کتبِ لغت) لفظ ''زلال'' سے ٹپکتا ہے کہ بہشتوں میں دہلی، آگرہ، بدایوں، رام پور، عرب کا سا پانی کھاری ہے۔ خیر کیسا ہی ہو، ہم پئیں گے۔

اعتراضِ سویم: غرفہ دار بہشت بھی سنی ہے؟ غرفہ نہ کہو، قلعے کا رَند سمجھو، نہیں نہیں، آصف الدولہ کے امام باڑے کا مداخل۔ مداخِل بھی نئی بات ہے۔

پرانا میں شاعر ہوں، کہنا ہے کیا

اعتراضِ چہارم: اللہ کی حوروں کی تعریف تو پردے کی تھی۔ یہ حور شاید شدّاد کی بہشت کی ہوگی۔ اس نظارہ بازی کے قربان، میں اور حضرتِ رضوان۔

المختصر میری تمنا یہ ہے کہ جو صاحب میری رائے سے موافق یا مخالف ہوں، وہ جو کچھ تحریر فرمائیں، اسی اخبار نجم الہند میں بھیجیں کہ یہیں جواب بھی چھپے گا۔ باقی نیاز و منم

راقم، آثم، انوار حسین، تسلیم سہسوانی، شیخ صدیقی، سنّی طریق

منشی عبدالعزیز اعجازؔ

منشی عبدالعزیز اعجازؔ قصبہ سہسوان، ضلع بدایوں (اتر پردیش) کے شیوخِ صدیقی کے ایک ذی علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے آبائی وطن میں پیدا ہوئے۔ آغا میر ان کا تاریخی نام تھا جس کے مطابق ان کا سالِ ولادت ۱۲۵۲ھ (۳۷-۱۸۳۶ء) قرار پاتا ہے۔ اعجازؔ کے والد اصلح اللہ صدیقی بہ سلسلۂ ملازمت لکھنو میں مقیم تھے، اس لیے ابتدائی تعلیم کا مرحلہ طے کرنے کے بعد صغرسنی ہی میں اعجازؔ بھی لکھنؤ آ گئے۔ یہاں انھوں نے مختلف اساتذہ سے فارسی و عربی درسیات کی تکمیل کی۔ منشی کالکا پرشاد موجدؔ لکھنوی (متوفّٰی ۱۴؍جولائی ۱۸۶۹ء) سے نظم ونثر فارسی میں استفادے کے علاوہ خوش نویسی کے فن میں بھی مہارت بہم پہنچائی۔ سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد اولاً اردو میں شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ اس فن میں انھوں نے شروع میں مولوی الٰہی بخش نازشؔ خیرآبادی (متوفّٰی ۱۲۸۹ھ/۷۳-۱۸۷۲ء) سے اصلاح لی۔ بعد ازاں منشی مظفر علی اسیرؔ لکھنوی (متوفّٰی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) کی طرف رجوع کیا۔ ان کے انتقال کے بعد منشی امیر احمد امیرؔ مینائی (متوفّٰی ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے تک اعجازؔ کا قیام لکھنؤ ہی میں رہا جہاں وہ ''بہ کمالِ فارغ البالی'' بسر اوقات کرتے رہے۔ خاندانی روایات کے مطابق قیامِ لکھنؤ کے اسی زمانے میں انھوں نے چند وصلیاں لکھ

کر سلطانِ عالم واجد علی شاہ کی خدمت میں پیش کی تھیں جنھیں پسند کر کے انھوں نے انھیں ''اعجاز رقم خاں'' کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ یہ خطاب اس قدر مقبول ہوا کہ اس نے رفتہ رفتہ ان کے نام کی جگہ حاصل کر لی۔

۱۲۷۲ھ(۱۸۵۶ء) میں انتزاعِ سلطنت کے واقعے کے بعد ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) کی قیامتِ صغریٰ کے نتیجے میں سیاسی انتشار اور معاشی ابتری کا جو دور شروع ہوا، اس کے زیر اثر اعجاز لکھنؤ سے ترکِ سکونت کر کے بھوپال چلے گئے جو اس زمانے میں صاحبانِ علم و دانش کے لیے دارالامان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں انھیں ریاست کے محکمۂ فوج داری میں ایک معقول ملازمت مل گئی۔[۱] لکھنؤ میں وہ اپنے ابتدائی دور کا فارسی کلام منشی کالکا پرشاد موجد کو دکھاتے رہے تھے، بھوپال پہنچنے کے بعد انھوں نے مرزا غالب کے شاگرد ابوالفضل مولانا محمد عباس رفعت شروانی (متوفّٰی ۱۳۱۵ھ/ ۹۸-۱۸۹۷ء) سے باقاعدہ اصلاح لینا شروع کی۔ رفتہ رفتہ انھوں نے خود اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ایک ماہر فن استاد کی حیثیت حاصل کر لی اور شہر و بیرونِ شہر کے امرا اور عوام دونوں طبقات سے تعلق رکھنے والے شعرا کی ایک کثیر تعداد ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوگئی۔ چنانچہ بعض بزرگوں کے مطابق اعجاز خود کہا کرتے تھے کہ بھوپال کے رؤسائے مرازی خیل (افغانی پٹھانوں کا وہ قبیلہ جس سے فرماں روایانِ بھوپال کا تعلق تھا) میں کوئی شہزادہ ایسا نہیں جو میرا شاگرد نہ ہو۔ مرورِ ایّام کے ساتھ کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ ان میں سے بعض شاگردوں سے فرماں روائے وقت کے تعلقات ناخوش گوار ہوگئے۔ ملازمِ سرکار ہونے کی بنا پر مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اعجاز ان لوگوں سے اپنے روابط منقطع کر لیتے لیکن انھوں نے اس صورتِ حال کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً پندرہ سال تک ریاست کی خدمات انجام دینے کے بعد بالآخر وہ معتوبِ سرکار قرار پائے۔ چنانچہ ۱۵ر شعبان ۱۲۸۷ھ (۱۰ر نومبر ۱۸۷۰ء) سے کچھ پہلے مولّفِ 'فرح بخش' کے مطابق ''آب و دانہ ان کا بھوپال سے اٹھ گیا اور وہ دفعتاً موقوف ہو کے وطن کو چلے گئے۔''[۲]

خاتمۂ ملازمت کے بعد سہسوان واپس جانے کے صحیح زمانے کی طرح وہاں سے دوبارہ بھوپال آمد کا صحیح زمانہ بھی نا معلوم ہے، تاہم یہ طے شدہ ہے کہ رجب ۱۲۸۹ھ

(ستمبر۱۸۷۲ء) سے قبل وہ بھوپال پہنچ چکے تھے۔[۳] یہاں آنے کے بعد اعجاز نواب یار محمد خاں شوکت (متوفّٰی ۱۸/اگست۱۹۱۲ء) کے مصاحبین میں شامل ہو گئے۔ شوکت نواب فوج دار محمد خاں جاگیردارِ ریاست کے صاحبزادے اور مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان کی مصاحبت کے نتیجے میں اعجاز کو یک سوئی کے ساتھ اپنے کمالاتِ شاعری کے اظہار کا موقع مل گیا تھا لیکن فرماں روائے وقت کی ناراضگی اور عتاب اپنی جگہ تھا، چنانچہ چند سال کے اندر ہی غالباً ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں انھیں بھوپال مستقلاً چھوڑ دینا پڑا[۴] اور وہ وہاں سے گوالیار منتقل ہو گئے۔

گوالیار میں شعر و ادب کی سرپرستی کا وہ ماحول نہ تھا جو بھوپال کی خصوصیت بن چکا تھا، اس لیے وہاں اعجاز کی ان کے حسبِ حیثیت قدر و منزلت نہیں ہوئی۔ 'مہرِ منیر' کے مولّف نے اس صورتِ حال کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ''اگرچہ از نا یاوریِ طالع بہ عہدۂ اعلیٰ نرسید مگر آبروے خود را معزز انہ نگاہ داشت۔''[۵] اعجاز نے دوسرے علوم و فنون کی طرح فنِ سپہ گری کی بھی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی اور اس کے بعض شعبوں میں خصوصی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ گوالیار کے زمانۂ قیام میں یہ مہارت و مشّاقی ان کے بہت کام آئی۔ والی ریاست مہاراجا مادھوراؤ سندھیا اور ان کے چھوٹے بھائی بھیّا بلونت راؤ اور دوسرے کئی عمائدین ریاست اس فن میں ان کے شاگرد ہو گئے۔ اس طرح وہ وہاں تقریباً اکیس سال پوری عزت اور وقار کے ساتھ ملازم رہے۔[۶]

جمادی الاخریٰ ۱۳۰۷ھ/ فروری ۱۸۹۰ء میں نواب شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے شوہر نواب صدیق حسن خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحے کے بعد بیگم صاحبہ کے مزاج اور افرادِ خاندان سے ان کے روابط کی نوعیت میں دھیرے دھیرے تبدیلی آنا شروع ہو گئی تھی۔ اعجاز کے قدر شناسوں اور بہی خواہوں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے قصور کی معافی کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کر دی چنانچہ کچھ دنوں کے بعد انھیں ریاست میں دوبارہ داخلے اور قیام کی اجازت مل گئی۔ اس طرح ۱۳۱۴ھ/ ۹۷-۱۸۹۶ء کے آس پاس وہ گوالیار سے ترکِ تعلق کر کے پھر بھوپال آ گئے۔ ان کے سابق سرپرست نواب یار محمد خاں شوکت اگرچہ اس وقت بہ قیدِ حیات تھے لیکن اس بار انھوں نے غالباً کسی مصلحت یا مجبوری کی بنا پر ان

سے توسّل قائم نہیں کیا اور شاہی خاندان ہی کے ایک اور فرد نواب یٰسین محمد خاں سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ان کے فرائضِ منصبی میں نواب صاحب کی مصاحبت کے علاوہ ان کے صاحبزادگان کی تعلیم و تربیت بھی شامل تھی۔ اس طرح وہ اپنی عمر کے آخری چند سال بھوپال میں گزار کر چہار شنبہ ۷/ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۳/ ستمبر ۱۸۹۹ء کو اس خاکدانِ ہستی سے رخصت ہوئے۔[۷]

اعجاز کے کئی معاصرین اور تلامذہ نے فنِ شعر میں ان کی قادرالکلامی اور زود گوئی کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے انھی ذرائعِ معلومات سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں یہ اطلاع دی ہے کہ انھوں نے مغرب کے بعد سے گیارہ بجے رات تک کا وقت شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس دوران وہ بالعموم دو ڈھائی سو شعر کہہ لیا کرتے تھے جن میں سے زیادہ تر شاگردوں کو عطا کر دیے جاتے تھے۔[۸]

'مہرِ منیر' کے مولّف نے ان کی اس مہارت و مشّاقی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''بہ گفتِ ہر گونہ نظم و نثر فارسی پایۂ بلند دارد..... در طرفۃ العین بہ ہر زمیں صد صد شعر می نویسد۔ افسوس کہ بہ تدوین دیوان و دیگر کلامِ خود نمی پردازد و گفتہ چاک می سازد۔''[۹]

شاگردوں میں اشعار کی تقسیم کے پہلو بہ پہلو اپنے نتائجِ افکار کے تحفّظ اور ان کی ترتیب و تدوین کی طرف سے بے اعتنائی کی اس روش ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ بسیار گوئی کے باوجود اعجاز کا کلام اب تقریباً ناپید ہے۔ بھوپال میں لکھے گئے شعرائے فارسی کے تین تذکرے 'شمعِ انجمن' (مؤلّفہ نواب صدیق حسن خاں) 'نگارستانِ سخن' (مؤلّفہ نواب نورالحسن خاں) اور 'صبحِ گلشن' (مؤلّفہ نواب علی حسن خاں) تو ان کے حالات و کلام سے غالباً اس لیے خالی ہیں کہ ان کی ترتیب و تالیف کے زمانے میں وہ معتوبینِ ریاست میں شامل تھے۔ البتہ 'روزِ روشن' (مؤلّفہ مولوی مظفّر حسین صبا) میں جو تقریباً اسی زمانے کی تالیف ہے، ان کا مختصر احوال موجود ہے۔ اس کی وجہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس تذکرے میں بہ طورِ خاص ان شاعروں کے ذکر کا اہتمام کیا گیا ہے جو متذکّرۂ بالا تینوں تذکروں میں جگہ نہیں پا سکے تھے۔ اس کے برخلاف تھوڑے دنوں کے بعد لکھے گئے شعرائے فارسی کے ایک غیر معروف تذکرے 'مہرِ منیر' (مؤلّفہ

صاحبزادہ ارجمند محمد خاں سلیمؔ شاگردِ اعجازؔ) میں جو بھوپال سے شائع ہونے والے اسی نام کے ایک ماہوار رسالے میں بالاقساط چھپا کرتا تھا اور غالباً مکمل نہیں ہو سکا، ان کا حال خاصی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس تذکرے میں ان کا تعارف ڈیڑھ صفحے کو محیط ہے۔ اس کے بعد نمونۂ کلام کے تحت فارسی کے پچیس شعر نقل کیے گئے ہیں۔ 'روزِ روشن' میں منقول آٹھ اشعار بھی ان پچیس شعروں میں شامل ہیں۔

شعر گوئی کے علاوہ اعجازؔ فن تاریخ گوئی میں اپنی استادانہ مہارت و مشاقی کے لیے بھی مشہور تھے۔ 'مہر منیر' کے مؤلف نے ان کے تعارف میں لکھا ہے کہ ''درفنِ تاریخ گوئی یدِ بیضا دارد۔ خواہد بہ یک ساعت بہ یاوریِ ذہنِ وقاد و طبعِ نقاد صد مادۂ تاریخ بہ صنائعِ رنگارنگ برنگارد۔''[۱۰]

'سیاحِ غریب' کے مصنف محمد حسین خاں، مہتمم اخبار 'دبدبۂ سکندری'، رام پور نے بھی ذاتی تجربے اور مشاہدے کے بعد اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ''فن تاریخ گوئی میں اس وقت منشی اعجازؔ کا نظیر نہیں، جو بات ہے خالی از نکاتِ دل پذیر نہیں۔ افسوس ہے کہ جیسے لائق و فائق ہیں، ویسی عزت نہیں۔''[۱۱] بھوپال کی بعض قدیم عمارات پر آج بھی ان کی کہی ہوئی تاریخیں کندہ ہیں اور ان کے زمانے کی بھوپال میں چھپی ہوئی متعدد کتابوں میں بھی ان کے طبع زاد قطعاتِ تاریخ موجود ہیں۔ حتّٰی کہ شعرائے فارسی کے ان تذکروں میں سے جن میں بہ حیثیت شاعر ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا، 'نگارستانِ سخن' میں تاریخ نوابی سید محمد صدیق حسن خاں بہادر سے متعلق ان کے نظم کیے ہوئے پانچ قطعات اور 'صبح گلشن' میں اس کے سالِ طباعت کے تین تاریخی قطعے شامل ہیں۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے اس فن پر ان کی غیر معمولی دسترس کے ثبوت میں ان کے ایک شاگرد مولوی نور الحسن نسیمؔ کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ ''اعجازؔ نے مرنے سے دو منٹ پہلے اپنی تاریخِ رحلت ''اعجاز رقم خاں مرد'' ہم لوگوں کے سامنے ایک کاغذ پر لکھ دی تھی جو بہ مشکل پڑھی گئی۔''[۱۲] اپنی برجستگی اور اختصار کے باعث یہ تاریخ فنی اعتبار سے ایک اعجاز کا درجہ رکھتی ہے۔

حواشی

۱ فرح بخش، نواب یار محمد خاں شوکتؔ، مطبعِ نظامی کان پور، ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ء ص ص ۶۲ و ۶۳۔ و۔ ارمغانِ گوکل پرشاد، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، انجمن ترقیِ اردو، پاکستان، کراچی، ص ۳

۲ فرح بخش، ص ۶۳۔ یہ تذکرہ کل چھبیس شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے اور مؤلّف کے بیان کے مطابق ۱۵/شعبان ۱۲۸۸ھ کو صرف ایک رات میں مرتب ہوا ہے۔

۳ یہ رائے رجب ۱۲۸۹ھ (ستمبر ۱۸۷۲ء) میں نواب یار محمد خاں شوکتؔ کے اعزاز میں منعقد ایک جشن میں اعجازؔ کے قصیدہ پیش کرنے اور اس جشن کی روداد مسمّٰی بہ 'گلدستۂ جشن' مرتبہ سید محمد تقی خاں، مطبوعہ مطبعِ سکندری بھوپال، ۱۲۸۹ھ کی تصحیح میں ان کے تعاون کی بنا پر قائم کی گئی ہے۔

۴ اعجازؔ نے نواب شاہ جہاں بیگم کے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء کے اواخر میں سفرِ دہلی کی روداد 'واقعاتِ سفرِ شاہ جہانی' کے تاریخی نام سے مرتب کی تھی۔ اس میں ان کا ایک قصیدہ بھی شامل ہے جس کے تاریخی عنوان 'بزمِ نادر نظم' سے ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء برآمد ہوتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء کے آغاز تک وہ بھوپال میں موجود تھے۔

۵ و ۶ مہرِ منیر ارجمند محمد خاں سلیمؔ، مرقعِ عالم پریس ہردوئی، ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷ء، ص ۸۰

۷ حکایاتِ ندرت طراز، سید خلیل احمد عاقلؔ سہسوانی، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۱۲ء، ص ۳۴

۸ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، مقالۂ تحقیقی برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ از ڈاکٹر سید سلیم حامد رضوی، نسخۂ قلمی

۹و۱۰؎ مہرِ منیر، ص ۸۰

۱۱؎ سیاحِ غریب، محمد حسین خاں، مطبعِ دبدبۂ سکندری، رام پور، ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء، ص ۲۱

۱۲؎ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ، علوی پریس، بھوپال، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۱

(برائے 'دانش نامۂ زبان و ادبیاتِ فارسی در شبہِ قارّہ'
مرسلہ ۲۳/جولائی ۱۹۹۷ء)

مکاتیبِ حالی

سرسید کے رفقا میں مولانا الطاف حسین حالؔی اس اعتبار سے سرِ فہرست ہیں کہ ان کی اہمیت اردو نثر اور نظم دونوں میں یکساں طور پر مسلّم ہے۔ اردو نثر میں انھیں تنقید کے بنیاد کی گزار کی حیثیت سے شرفِ اوّلیت حاصل ہے تو نظم میں جدید شاعری کے بانیوں میں ان کا نام سب سے نمایاں اور ان کا کلام سب سے زیادہ مقبول ہے۔ علاوہ بریں عربی و فارسی نثر و نظم میں بھی بہ یک وقت کوئی ان کا مدِّ مقابل نظر نہیں آتا۔ شبلؔی کی فارسی شاعری یقیناً خاصے کی چیز ہے لیکن فارسی نثر میں اور اس سے بڑھ کر عربی نظم میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتبار سے حالؔی بلا شبہ شبلؔی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اردو میں سوانح نگار کی حیثیت سے ان کا جو مقام ہے، اس سے بھی ہم سب بہ خوبی واقف ہیں، لیکن اس حقیقت سے شاید کم ہی لوگ باخبر ہوں کہ 'یادگارِ غالب' اور 'حیاتِ جاوید' کے بعد اس سلسلے کی ان کی تیسری معروف تصنیف 'حیاتِ سعدی' آج بھی اپنے موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ فارسی زبان و ادب اور اس کی تاریخ و تنقید پر ان کے غیر معمولی عبور کی ایک بیّن دلیل ہے۔ اسی طرح عربی زبان و ادب کے ایک رمز شناس کے بہ قول ان کی عربی نثر و نظم بھی بڑی حد تک اہلِ زبان کی تحریروں سے لگا کھاتی ہے۔ ان تمام خوبیوں پر مستزاد ان کی وہ شرافتِ نفس اور

منکسر مزاجی تھی جو انھیں اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اپنے بعض معاصرین کے برخلاف انھوں نے کبھی بھی اور کسی بھی معاملے میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے یا اپنے کارناموں کو عالمانہ ادّعا کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی بہت سی تحریریں وہ توجہ نہیں پاسکیں جس کی وہ فی الواقع مستحق تھیں۔ وہ جس پائے کہ عالم اور ادیب تھے، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ محفوظ ہو جانا چاہیے تھا مگر افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوسکا۔ ۱۵/اگست ۱۹۱۰ء کو مولانا ظفر علی خاں کے نام کے ایک خط میں انھوں نے اپنی گرتی ہوئی صحت کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی منتشر تحریروں کے سلسلے میں اس خیال کا اظہار کیا تھا:

> ''اپنا کلامِ نظم ونثر اردو وفارسی وغیرہ مرتب کرنا چاہتا ہوں مگر نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ کسی سے امید نہیں کہ میرے بعد کوئی اس کو بہ وجوہِ دلخواہ نہ سہی، سرسری طور پر ہی مرتب کردے۔''
>
> (مکاتیبِ حالی، ص ۶۳)

طرح طرح کے عوارض بالخصوص ضعفِ بصارت نے حالؔی کو ان کی زندگی کے آئندہ چار سالہ دور میں اس کا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے اس منصوبے کو حسبِ دلخواہ پایۂ تکمیل تک پہنچاتے۔ ان کی وفات کے بعد شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اس کام کی ذمہ داری سنبھالی اور مختلف ذرائع ووسائل سے ان کی منتشر تحریروں کو یکجا کر کے اور کتابی صورت میں ترتیب دے کر بڑی حد تک اس نقصان کا سدِّ باب کر دیا جو بہ صورتِ دیگر ناگزیر تھا۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انتہائی پرخلوص اور سنجیدہ کوشش کے باوجود اس قسم کی کتنی تحریریں ان کی دسترس سے بعید رہ گئیں اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کا کیا حشر ہوا؟ کم از کم ان کے مکتوبات کے بارے میں یہ بات کسی قدر وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کا ایک بڑا حصہ کتابی صورت میں محفوظ نہیں کیا جاسکا اور اب بہ گمانِ غالب ضائع ہو چکا ہے۔

شیخ محمد اسمٰعیل مرحوم کا مرتبہ مجموعہ ''مکاتیبِ حالی'' جو فی الوقت ہمارا موضوعِ گفتگو ہے، کل انہتر (۶۹) خطوط پر مشتمل ہے، جنھیں بہ اعتبارِ زبان تین حصوں میں تقسیم کر دیا

گیا ہے۔ حصۂ اوّل میں اردو کے چون (۵۴)، حصۂ دوم میں فارسی کے آٹھ (۸) اور حصۂ سوم میں عربی کے سات (۷) خط شامل ہیں۔ اردو کے چون (۵۴) خط انتالیس (۳۹) مکتوب الیہم کے نام ہیں۔ ان میں پانچ خط ایسے بھی ہیں جو اصل خطوط کی بجائے ان کے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ حصۂ دوم کے آٹھ فارسی خطوط میں سب سے اہم خط مرزا غالبؔ کے نام ہے، جس میں غالبؔ کے استفسار پر نظیریؔ کے ایک شعر کی تشریح کی گئی ہے۔

حالیؔ، غالبؔ کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے۔ یہ واحد خط ہے جو ان دونوں اساطینِ اردو کے درمیان مراسلت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ حالیؔ کے نام غالبؔ کا کوئی خط ان کے کسی مجموعۂ مکاتیب میں شامل نہیں۔ حتّٰی کہ 'اردوے معلّٰی' کے اس ایڈیشن میں بھی جو مطبعِ مجتبائی، دہلی نے اپریل ۱۸۹۹ء میں بہ طورِ خاص مولانا حالیؔ کی اجازت سے شائع کیا تھا اور جس کا حصۂ دوم خود مولانا موصوف کے عنایت کردہ ''قلمی مسودے'' پر مبنی ہے، اس قسم کی کوئی تحریر جگہ نہیں پا سکی ہے۔ یہ صورتِ حال اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ غالباً ان دونوں کے درمیان مراسلت و مکاتبت کا وسیلہ اردو نہیں، فارسی تھی۔ حالیؔ کا محولۂ بالا خط غالبؔ کے جس خط کے جواب میں لکھا گیا ہے، وہ یقیناً فارسی ہی میں تحریر کیا گیا ہوگا۔ مرزا صاحب کے اواخرِ عمر میں ان کے اور مولانا حالیؔ کے درمیان نمازِ پنجگانہ کے سلسلے میں جو منظوم تحریری مکالمہ ہوا تھا، اس کی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ اس سے بھی ہمارے متذکرۂ بالا قیاس کو تقویت ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسروں کے نام لکھے گئے استاد کے اردو خطوط کو محفوظ رکھنے والے سعادت مند شاگرد نے اپنے نام کے یہ خطوط بھی احتیاط سے رکھے ہوں گے، لیکن یہ احتیاط بھی انھیں ضائع ہونے سے نہ بچا پائی، یہ ایک بالکل مختلف امر ہے۔ 'یادگارِ غالب' کے بعض حوالوں سے یہ بات بہر حال پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حالیؔ کے پاس غالبؔ کے بعض ایسے فارسی خطوط موجود تھے جو ان کی زندگی میں 'پنج آہنگ' کے کسی ایڈیشن میں جگہ نہیں پا سکے تھے۔

اپنی محدود تعداد کے باوجود ''مکاتیبِ حالی'' کے یہ خطوط حالیؔ کی شخصیت، ان کے

افکار ونظریات اوران کے گردوپیش کے بارے میں معلومات کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی عرض کیا جا چکا ہے، حالؔی کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف ان کی منکسر مزاجی اور شرافتِ نفس تھی۔ بڑوں کا احترام، معاصرین کی قدر دانی اور چھوٹوں کی حوصلہ افزائی میں ان کی فراخ دلی مثالی حیثیت کی حامل تھی۔ ان خطوط میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی نے سرسید کی سوانح عمری 'حیاتِ جاوید' کو مدلّل مدّاحی قرار دے کر سرسید اور حالؔی دونوں کے معاملے میں جو منفی رویہ اپنایا تھا، وہ ایک مخصوص مزاجی کیفیت اور طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ اس کے برخلاف حالؔی نے شبلی کے علمی کارناموں کی پذیرائی اور ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں جس وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ اس سے بالکل مختلف اندازِ فکر اور کیفیتِ مزاج کی عکاس ہے۔ خود علامہ شبلی کے نام ۳۰ر نومبر ۱۹۰۶ء کے ایک خط میں جو پانی پت سے لکھا گیا ہے، ایک مقامی لائبریری کے لیے ان کی متعدد کتابوں کی خریداری کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مَنْ عَرَفَ مَعْرِ فَتَکُمْ فِی التَصْنِیْفِ کَلَّ لِسَانُہٗ. آپ کا وجود قوم کے لیے باعثِ فخر ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ سلامت رکھے۔'' (ص: ۴۰)

۱۹۰۷ء کے ایک اور خط میں مولانا کے مجموعۂ کلام 'دستۂ گل' کے بارے میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں سپردِ قلم کیے ہیں:

> ''کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانحِ مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں، شرابِ دوآتشہ ہے، جس کے نشے میں خمارِ چشمِ ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیاتِ حافظؔ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے زیادہ گرم ہیں۔'' (ص ۴۲)

مولانا ظفر علی خاں حالؔی کے کم عمر معاصرین میں سے تھے۔ وہ ایک کامیاب صحافی اور خطیب بھی تھے اور ایک اچھے نظم نگار بھی۔ وہ شاعروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کی تربیت انجمنِ پنجاب کے زیر اثر ہوئی تھی اور جو حالؔی و آزادؔ کی قیادت میں شاعری کی نئی شاہراہ پر گامزن تھا۔ جنوری ۱۹۰۵ء کے 'دکن ریویو' میں ان کی ایک نظم 'رودِ موسیٰ' شائع ہوئی تھی۔ اسے پڑھنے کے بعد حالؔی نے ۱۱/ مارچ ۱۹۰۵ء کو انھیں جو خط لکھا تھا، وہ ان کے طرزِ شاعری کے بارے میں تحسین آمیز اظہارِ خیال کے پہلو بہ پہلو خود نفسِ شاعری کے متعلق حالؔی کے نقطۂ نظر اور اپنے دور کے عام اندازِ شاعری سے ان کی بے اطمینانی پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''آپ کی نظم 'رودِ موسیٰ' .....اول سے آخر تک بڑے غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی۔ میرا حال اب یہ ہو گیا ہے کہ پرانے طرز کی نظمیں تو (اِلّا ماشاءاللہ) اس لیے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ان میں کوئی نئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئی طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیے اور جس کو ''جادو'' کے علاوہ اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متحیر ہو گیا۔ مرثیہ دیکھ کر بھی مجھے ایسا ہی تحیر ہوا تھا، لیکن اس وقت آپ کے دل کو لگی ہوئی تھی اور ایسا کلام جو دل کے جوش پر مبنی ہو، خواہی نخواہی موثر و دل کش ہوتا ہے لیکن رودِ موسیٰ پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے، یہ محض زورِ طبع اور شاعری کی خداداد قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید ہوتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔ مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کچھ طبع آزمائی کرتا۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھ والے بھی اب ہماری طرح پا در رکاب ہیں۔ صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں

کی صورتیں نظر آتی ہیں، بہ شرطے کہ آپ کو فکرِ معاش دم لینے دے اور یہ بھی دل کو لگی رہے۔''

چونکہ بات نئی شاعری کی نکل آئی ہے اور حالؔی اس طرزِ شاعری کے موسس اور پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے ایک اور خط کا بھی حوالہ دے دیا جائے، جس میں انھوں نے ''قومی جلسوں میں نظموں کی بھرمار'' کے خلافِ اظہارِ خیال کرتے ہوئے شاعری کے اصل منصب اور موضوعات کے تعین کی کوشش کی ہے۔ یہ خط مولوی محبوب عالم کے نام ہے اور اپریل یا مئی ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا ہے۔ حالؔی کا موقف یہ ہے کہ جن اداروں یا انجمنوں کے مقاصد میں فلاحی و رفاہی منصوبوں کے لیے چندہ جمع کرنا بھی شامل ہو، ان کے جلسوں میں عوام کو متوجہ اور متحرک کرنے کے لیے روایتی قسم کی نظمیں پڑھی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس جیسی تنظیموں کے لیے جن کے اجلاس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اہل الرائے حضرات کا مجمع ہوتا ہے، یہ مناسب نہیں کہ وہ نظم خوانی میں اپنا وقت ضائع کریں۔ لکھتے ہیں:

> ''ہم نہ قدیم شاعری کے مخالف ہیں، نہ جدید شاعری کے مزاحم، بلکہ ایک لحاظ سے جدید شاعری کے زیادہ موید ہیں، لیکن ہماری رائے میں نئی شاعری کو ترقی دینے یا اس کی داد لینے کا مقام بجائے قومی جلسوں کے نئی طرز کے مشاعروں کو قرار دینا چاہیے، جن کا عمدہ نمونہ ایک دفعہ پہلے لاہور میں قائم ہو چکا ہے۔ نئی طرز کے مشاعرے سے ہماری مراد یہ ہے کہ قدیم دستور کے موافق ان میں شعرا کو مصرعِ طرح نہ دیا جائے بلکہ کسی مضمون کو عنوان بنا کر نظمیں کہلوائی جائیں اور اس بات کا اختیار کہ وہ کس بحر یا کس صنف میں ترتیب دی جائیں، خود شعرا کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ نئی طرز کی شاعری میں سوا اس کے کہ لوگوں نے جا بہ جا مسلمانوں کے تنزل کا رونا رویا ہے، اور مضامین کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ حالانکہ نیچرل مضامین کا وسیع اور ناپیدا کنار

میدان موجود ہے، جس میں ہمارے شعرا طبیعت کی جولانیاں اور فکر کی بلند پروازیاں دکھا سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے قومی جلسوں میں شاعری کے جوہر دکھانے سے کوئی عمدہ نتیجہ شاعری یا قوم کے حق میں پیدا نہیں ہوسکتا۔'' (ص ۵۰)

حالؔی کی سیرت و شخصیت کا ایک نمایاں وصف یہ بھی تھا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی اور مبلّغ تھے۔ چنانچہ وہ اس قسم کی ہر کوشش کو قابلِ قدر و لائق ستائش سمجھتے تھے جس کا مقصد ان دونوں فرقوں کے باہمی اختلافات کا سدِّ باب اور ان کے درمیان اشتراک و تعاون کی تبلیغ و ترویج ہو۔ ان کی نگاہ میں یہ مقصد بجائے خود اس قدر اہم تھا کہ وہ اس کی کامیابی یا ناکامی کے امکانات پر بھی زیادہ غور و فکر اور بحث و تمحیص کے قائل نہ تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرؔر نے ۱۹۰۴ء میں 'اتحاد' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا، جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کو فروغ دینا تھا۔ بعض معاصر اخبارات ان کے اس اقدام کو ایک بے نتیجہ کوشش سے تعبیر کر رہے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں ان دونوں فرقوں کے اختلافات کا دور ہونا ایک امرِ محال تھا۔ حالؔی کے نزدیک نہ تو حالات اس قدر مایوس کن تھے اور نہ یہ نقطۂ نظر اصولی طور پر درست تھا۔ اسی لیے وہ شرؔر کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگر فرض کر لیا جائے کہ فی الواقع ان دونوں قوموں کا تنافر اس درجے کو پہنچ گیا ہے کہ کسی طرح دور نہیں ہوسکتا تو بھی اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ 'اتحاد' کا مقصد نہایت اعلیٰ اور اشرف ہے۔ جو لوگ دنیا میں ہمیشہ کے لیے امن اور مصالحت کی بنیاد ڈالنا اور جنگ و خوں ریزی کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں، ان کی نسبت بھی ایسا ہی خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی کوششوں کا بار ور ہونا غیر ممکن ہے، لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ نوعِ انسان کے ہوا خواہ اور خیر اندیش نہیں ہیں یا وہ دنیا کو بدی اور خباثت سے پاک کرنا نہیں

چاہتے۔'' (ص۵۳)

حالؔی کو یہ مقصد کس قدر عزیز تھا اور وہ اسے سہل الحصول نہ سمجھنے کے باوجود اس کی تکمیل کے کس قدر آرزومند تھے، اس کا اندازہ پیارے لال شاکرؔ میرٹھی مدیرِ 'العصر' کے نام ۱۸؍جون ۱۹۱۳ء کے ایک خط سے بھی ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی اس بات کا آرزومند ہوگا کہ ہندوستان کے ہندو، مسلمان اور مسیحی سب ایک دوسرے کے ایسے دوست ہوں جیسے ایک سگا بھائی دوسرے سگے بھائی کا دوست ہوتا ہے، مگر میرے نزدیک ایسی حالت ایک صدی سے ورے ہندوستان میں پیدا نہیں ہوسکتی مگر ہم کو کیا 'بعد از سرِ من کن فیکون شد، شدہ باشد'۔'' (ص۱۱۰)

ہندو مسلم اختلافات کی طرح مختلف اسلامی فرقوں کے باہمی تنازعات بالخصوص شیعہ، سنّی مناقشوں سے بھی حالؔی بے حد آزردہ اور بددل رہتے تھے۔ اسی بنا پر اس اقرار و اعتراف کے باوجود کہ ''اسلامی فرقوں کا اتحاد ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے کچھ کم دشوار نہیں ہے''، وہ ہمیشہ ''مذہبی تعصّبات کے گرد و غبار سے اسلام کا مطلع صاف کرنے'' کی کوشش میں سرگرم افراد کے حامی و ہم نوا رہے اور ان لوگوں کی ہمت شکنی کرتے رہے جو ان اختلافات کو ہوا دے کر اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ 'آبِ حیات' کے پہلے ایڈیشن میں مولانا محمد حسین آزادؔ بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر مومنؔ کے حالات شامل نہیں کر سکے تھے۔ چونکہ آزادؔ مسلکاً شیعہ تھے اور مومنؔ کا شمار اس مسلک کے مخالفین میں ہوتا تھا، اس لیے کتاب کی اشاعت کے بعد بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ مومنؔ کو نظر انداز کیے جانے کا سبب یہی اختلافِ عقائد ہے۔ حالؔی کے نزدیک یہ بدگمانی انتہائی ناپسندیدہ اور شر انگیز تھی۔ چنانچہ وہ اسے ''یاوہ سرائی'' سے تعبیر کرتے ہوئے مولانا آزادؔ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کے تبصروں کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھیں۔ ایک طویل خط کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''افسوس ہے کہ 'سفیرِ ہند' امرتسر میں جو مومنؔ کا حال چھپا ہے، وہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ صرف منشی ذکاء اللہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ کسی شخص نے ایسا کچھ لکھا ہے مگر دوسرے صاحب جو آپ پر کچھ منہ آئے ہیں، ان کا مضمون نواب احمد سعید خاں صاحب نے.....اخبار 'صبحِ صادق' میں دکھایا تھا۔ یہ خیال اکثر لوگوں کو ہے کہ آپ نے مذہبی تعصّب کے سبب مومنؔ کا حال نہیں لکھا، مگر اس سے بڑھ کر کوئی سخیف اور پوچ خیال نہیں ہوسکتا.....آپ لوگوں کی یاوہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیے.....اور اپنا کام کیے جائیے۔ نکتہ چینوں کے خوف سے مفید کام بند نہیں کیے جاسکتے۔'' (ص ۱۸)

حالؔی سرسید کے رفیقِ خاص اور علی گڑھ تحریک کے پرجوش مبلّغ اور قافلہ سالار تھے، لیکن سرسید کے صاحبزادے سید محمود نے جس قسم کا مزاج پایا تھا اور اپنے والد کی وفات کے بعد جس طریق کار پر وہ عمل پیرا تھے، وہ ایم.اے.او. کالج کے دوسرے بہت سے بہی خواہوں کی طرح حالؔی کے لیے بھی سخت تکلیف دہ اور کبیدگیِ خاطر کا سبب تھا۔ حالات کی اس روز افزوں خرابی کے تدارک کی ان کے نزدیک اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی کہ سید محمود کو جلد از جلد کالج کمیٹی کی صدارت سے برطرف کر دیا جائے۔ چنانچہ علامہ شبلی کو ۲۸ ستمبر ۱۸۹۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سید محمود کی بے اعتدالیاں اب حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور لوگوں کو ان کی آڑ میں کالج کے درہم برہم کرنے کا خاصا موقع مل گیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ محسن الملک کو نواب لفٹننٹ گورنر نے نینی تال بلایا ہے۔ سید محمود کو پریسیڈینسی سے علیحدہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ کاش ہز آنر ان کے برطرف کرنے کا مشورہ دیں.....سرِ دست کالج کی حالت نازک ہے۔ خدا انجام بخیر کرے۔'' (ص ۳۷)

سرسید، ان کی تحریک اور ان کے قائم کردہ کالج سے غیر معمولی ہمدردی اور تعلقِ

خاطر کے باوجود مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے سلسلے میں حالؔی کا واحد مطلوب ومقصود ایم.اے.او. کالج ہی نہ تھا، وہ ہر اس ادارے اور اس تنظیم کے ساتھ اشتراک وتعاون کو ضروری سمجھتے تھے جو اس مقصد کے حصول کے لیے سرگرم ہو۔ اپنی اس وسیع النظری کی بنا پر انھیں ان لوگوں سے کسی قدر شکایت بھی تھی جن کی تمام تر دلچسپی اور ساری ہمدردیوں کا مرکز ومحور صرف علی گڑھ تھا۔ صاحبزادہ سلطان احمد خاں، چیف جسٹس ریاست گوالیار کے نام ۲۵ رمئی ۱۹۰۹ء کے ایک خط میں انجمن حمایتِ اسلام، لاہور کے سفیر شیخ عبدالرحمٰن کا تعارف کرانے کے بعد انھوں نے اس طرح اپنے اس موقف کا اظہار کیا ہے:

> ''اگرچہ علی گڑھ پارٹی کے اصحاب سوائے ایم.اے.او. کالج اور کسی انسٹی ٹیوشن کی مدد بہ طوع ورغبت نہیں کرتے لیکن اب زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر ایک تعلیم گاہ کی پوری پوری امداد کی جائے، کیونکہ چھ کروڑ مسلمانوں کے لیے ایک محمڈن کالج کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا۔'' (ص ۹۹)

سرسید، ان کی تحریک اور اس تحریک سے وابستہ افراد کے حوالے اس مجموعے کے کئی خطوط میں موجود ہیں، لیکن غالبؔ کے بارے میں یہ تحریریں کوئی خاص معلومات فراہم نہیں کرتیں۔ ان کا ذکر بہ طورِ خاص نواب احمد سعید خاں طالبؔ دہلوی کے نام کے ایک خط میں آیا ہے۔ یہ خط اس خط وکتابت کے حوالے سے جو 'واقعاتِ انیس' کے بعض مضامین کے متعلق مکتوب الیہ موصوف اور اس کتاب کے مصنف سید امجد علی اشہرؔی کے درمیان ہوئی تھی، ۴ رمارچ ۱۹۰۹ء کو لکھا گیا ہے۔ اشہرؔی صاحب نے اپنی اس کتاب میں غالبؔ کے سفرِ لکھنؤ کے دوران ان کے اور میر انیسؔ کے درمیان ملاقات اور گفتگو کی جو روداد بیان کی ہے، حالؔی نے اسے یکسر خلافِ واقعہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میں اس باب میں.....صرف اس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ نہ مرزا کی ملاقات لکھنؤ میں میر انیسؔ مرحوم سے ہوئی اور نہ ہوسکتی تھی۔''
> (ص: ۹۵)

اپنے اس دعوے کی تائید میں مولانا نے جو دلائل پیش کیے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مرزا صاحب.....کلکتہ جاتے (ہوے).....اثنائے راہ میں چند روز لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ یہ زمانہ.....نصیر الدین حیدر کا تھا۔[۱]

(۲) نصیر الدین حیدر ۱۸۲۷ء میں تخت نشیں ہوئے اور ۱۸۳۷ء میں انھوں نے انتقال کیا۔

(۳) نصیر الدین حیدر..... کے بعد پانچ برس کے قریب محمد علی شاہ تخت نشین رہے، بعد ازاں امجد علی شاہ برسرِ اقتدار آئے۔

(۴) انیسؔ کے خاندان نے انھی امجد علی شاہ کے زمانے میں فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔[۲]

ان واقعاتی شہادتوں کے علاوہ اشہریؔ صاحب کے بیانات کے رد میں مولانا حالیؔ نے ایک منطقی دلیل بھی پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''واقعاتِ انیس.....(میں).....جو مکالمہ میر صاحب اور مرزا صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ دونوں صاحبوں کی شان سے نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب جو گویا کہ اہلِ لکھنؤ کے مہمان تھے، ان سے میر انیسؔ کا پہلی ملاقات میں یہ کہنا کہ غزل ایک مبتذل صنفِ کلام ہے اور ان سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کرنا اور گویا در پردہ یہ کہنا کہ اس میدان میں آؤ تو حقیقت معلوم ہو، کس قدر خلافِ انسانیت، خلافِ تہذیب اور خلافِ اخلاق باتیں ہیں جن کو مردِ آدمی باور نہیں کر سکتا۔'' (ص ۹۷)

حالیؔ زبان اور لغت کے مسائل سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے زمانے تک ان موضوعات پر جتنا کچھ کام ہوا تھا، وہ ان کے نزدیک ناکافی اور غیر اطمینان بخش تھا۔ چنانچہ ۶/ مارچ ۱۹۱۳ء کے خط میں انھوں نے مولوی عبدالحق کو انجمن ترقیِ اردو کے سکریٹری

کا عہدہ سنبھالنے کی مبارک باد دینے کے بعد بہ طورِ مشورہ یہ بھی لکھا تھا کہ:

''اصطلاحاتِ علمیہ کی ڈکشنری ضرور مرتب کیجیے اور اس کے بعد معمولی اردو زبان کی ڈکشنری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اگر آپ کی کوشش سے یہ دونوں لغات تیار ہو جائیں تو آپ قوم کی ایسی خدمت سے عہدہ برآ ہوں گے جو قومی ترقی کی جڑ ہے۔'' (ص ۴۸)

۱۵/اگست ۱۹۱۰ء کے خط میں مولانا ظفر علی خاں کو لکھتے ہیں:

''اردو زبان کی تذکیر و تانیث پر میں اپنے خیالات..... ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر طبیعت کی نادرستگی، کمزوری اور سب سے زیادہ مکروہاتِ دنیوی نے اس ارادے کو اب تک پورا نہیں ہونے دیا۔'' (ص ۱۳)

ان کے معاصرین اس قسم کے مسائل میں برابر ان سے استفادہ کرتے رہتے اور وہ بڑے شوق سے ان کے سوالوں کے جواب دیتے تھے۔ مولوی امام الدین کو ان کے ایک ایسے ہی استفسار کے جواب میں ۲/فروری ۱۹۰۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''تابعدار غلط ہے، صرف تابع یا فرماں بردار کہنا چاہیے، کیونکہ تابعدار کے معنی تابع رکھنے والے کے ہیں گویا مخدوم ہو گیا، نہ کہ خادم۔ فصحا کے کلام میں کہیں نہیں آیا ہے، عوام اور جہلا کی زبان پر اکثر جاری ہے۔ ''غلط العام صحیح'' کا قاعدہ فصحا جائز نہیں سمجھتے۔'' (ص ۷۶)

مولانا کے ایک ہم وطن مصنف بابو رگھوناتھ سہائے بی.اے. نے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی تصنیف 'گلدستۂ اخلاق' کو بہ نظرِ اصلاح ملاحظہ فرما کر انھیں اس کی لسانی و بیانی خامیوں سے مطلع فرمائیں۔ اس کے جواب میں مکتوب الیہ موصوف کو ''کئی'' یا ''کئی ایک'' کے استعمال کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کئی کا لفظ غلط نہیں ہے مگر اس کا استعمال ٹھیک نہیں ہوا۔ کئی مثلاً ایسی جگہ بولتے ہیں جیسے کئی لڑکے بازار میں جاتے تھے، کئی لڑکوں نے

مدرسے میں شرارت کی، لڑائی میں کئی آدمی مارے گئے، اس گاؤں میں کئی بدمعاش رہتے ہیں، استاد نے کئی تھپڑ مارے یعنی جہاں تعداد معلوم ہوتی ہے، وہاں کئی یا کئی ایک بولتے ہیں، مگر جہاں تعداد نہیں معلوم ہوتی وہاں اکثر، بعض یا بعضے بولا جاتا ہے جیسے اکثر لڑکے شریر ہوتے ہیں، بعض آدمی ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں، بعضے استاد بے قصور لڑکوں کو مارا کرتے ہیں۔ آخر کی تینوں مثالوں میں ''کئی'' یا ''کئی ایک'' کا لفظ فصیح اردو کے خلاف ہے۔'' (ص ۹۱، ۹۲)

تین چار برس قبل 'ہماری زبان' کے صفحات پر علمائے ادب کے درمیان کافی دنوں تک یہ بحث چلتی رہی تھی کہ از روے لغت صرف ''استفادہ کرنا'' درست ہے یا ''استفادہ حاصل کرنا'' بھی لکھا جا سکتا ہے۔ حالؔی نے ان خطوط میں اس موضوع پر وضاحتاً تو کچھ نہیں لکھا ہے لیکن ان کے ایک خط کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ''استفادہ حاصل کرنا'' کے استعمال کو جائز سمجھتے تھے۔ علامہ شبلی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چونکہ میں (ضعفِ بصارت کی بنا پر) خود کتابوں سے استفادہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے اپنی ہوس کو اس طرح پورا کرتا ہوں کہ اور لوگوں کے لیے لائبریری میں کتابیں منگواتا ہوں۔'' (ص ص ۳۸، ۳۹)

اسے محض اتفاق یا سہوِ قلم کہنا درست نہ ہوگا کیوں کہ حالؔی اس سے پہلے بھی دو ایک جگہ لفظ ''استفادہ'' کا اسی طرح استعمال کر چکے تھے۔ 'یادگار غالب' میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''یورپ کے بعض نامور شعرا مشرقی شاعروں کے کلام سے اب تک استفادہ حاصل کرتے اور اس سے صدہا اسلوبِ بیان اخذ کرتے ہیں۔''[۳]

'مکاتیبِ حالی' کے حصۂ اوّل کے اس مختصر جائزے سے بہ خوبی ظاہر ہے کہ اس

میں شامل خطوط نہایت مفید و کارآمد اور دلچسپ و بصیرت افروز معلومات کا گنجینہ ہیں، جن کا مطالعہ حالؔی کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات سے کما حقہ، واقفیت کے لیے از بس ضروری ہے۔ یوں بھی ایک عام تجربہ ہے کہ خطوط کسی بھی مصنف کے ذہنی دریچے کھولنے میں اس کی دوسری تحریروں کی بہ نسبت زیادہ ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور اس کے سوانح اور نفسیات سے متعلق بہت سے مسائل ان کی مدد سے زیادہ بہتر طور پر حل کیے جا سکتے ہیں۔ ادب میں ان کی اہمیت و افادیت کا یہ وہ روشن پہلو ہے جسے کسی بھی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی:

۱ حالؔی کی یہ اطلاع صحیح نہیں۔ لکھنؤ میں غالبؔ کا قیام ''چند روز'' نہیں، تقریباً آٹھ مہینے رہا تھا۔ وہ وہاں سے ۲۲/جون ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوئے تھے۔ یہ غازی الدین حیدر (متوفّٰی ۱۹/اکتوبر ۱۸۲۷ء) کی حکم رانی کا آخری زمانہ تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم السطور کا مقالہ: غالبؔ کا سفرِ کلکتہ، مشمولہ 'غالب-احوال و آثار'، شائع کردہ نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

۲ دستیاب شواہد کے مطابق لکھنؤ میں انیسؔ کی مستقل سکونت یقیناً امجد علی شاہ کے عہد کا واقعہ ہے، لیکن وہ اس سے پہلے بھی بہ غرضِ مرثیہ خوانی برابر وہاں آتے رہتے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ میں سب سے پہلا مرثیہ حسینیہ اکرام اللہ خاں میں ۱۸/ربیع الثانی ۱۲۴۲ھ (۱۸/نومبر ۱۸۲۶ء) کو پڑھا تھا۔ (انیسؔ سوانح، از پروفیسر نیر مسعود رضوی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۶۷، ۶۸) غالبؔ اس زمانے میں لکھنؤ میں موجود تھے لیکن وہ سخت بیمار تھے۔ علاوہ بریں ان کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں اس طویل قیام کے دوران خواجہ آتشؔ اور میر محمد تقی ہوسؔ جیسے بزرگ اور مشہور و ممتاز اساتذہ سے بھی ان کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ انیسؔ بہر حال عمر میں ان سے چھوٹے اور نسبتاً کم معروف تھے۔

۳ یادگارِ غالب (عکسی ایڈیشن)، یو. پی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۸۳ (الطاف حسین حالی-تحقیقی و تنقیدی جائزے، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء)

منشی بنواری لال شعلہؔ

منشی بنواری لال شعلہؔ سلسلۂ غالبؔ کے ایک معروف شاعر ہیں۔ مالک رامؔ نے 'تلامذۂ غالب' میں انھیں منشی بال مکن بے صبرؔ کا مشہور ترین شاگرد قرار دیا ہے، جب کہ کلب علی خاں فائقؔ رام پوری انھیں بے صبرؔ اور غالبؔ دونوں کا شاگرد بتاتے ہیں۔ موصوف کے نزدیک مالک رام کا یہ فیصلہ کہ انھوں نے شعلہؔ کا ذکر صرف بال مکند بے صبرؔ کے شاگرد کی حیثیت سے کیا ہے اور انھیں تلامذۂ غالبؔ میں داخل نہیں کیا، درست نہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ:

> ''مولّفِ 'یادگارِ ضیغم' نے شعلہؔ کو بال مکند بے صبرؔ اور غالبؔ کا شاگرد ظاہر کیا ہے۔ مالک رام کے پیشِ نظر تذکرۂ 'یادگارِ ضیغم' ہے، انھوں نے ضیغمؔ کے بیان کی نہ تائید کی ہے نہ تردید۔ غالباً سہواً ضیغمؔ کا بیان وہ نہیں دیکھ سکے۔ ان کی نظر میں برقؔ سیتاپوری مولّفِ تذکرۂ 'بہارِ سخن' کا بیان رہا۔ برقؔ نے غالبؔ کی شاگردی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ بشاشؔ مولّفِ تذکرۂ شعرائے ہنود نے بھی غالبؔ کی شاگردی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں مولّفِ تذکرۂ ضیغم کا بیان زیادہ معتبر ہے۔ وہ تحریر کرتا ہے:

''شعلہؔ تخلص، بنواری لال نام، ابنِ منشی موتی لال مرحوم۔ وطن اصلی فیروز حصار (کذا)، ملک پنجاب ہے۔ ولادت ان کی مقام سہارن پور میں ہوئی۔ اب چودہ برس سے علی گڑھ میں وکالت کرتے ہیں۔عمر قریب اڑتیس برس کے ہے۔ ابتدائے عمر سے شاعری کا شوق ہے۔ پہلے منشی بالمکن (کذا) سے تلمذ تھا۔ بعدہٗ اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی مغفور کے شاگرد ہوئے۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی، ایک رسالۂ شطرنج ان کی تصنیف سے ہے۔''

ضیغمؔ نے معاصرین کے حالات بہت کاوش سے جمع کیے تھے۔ تصانیف کے حوالے اور شاگردی کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ شعلہؔ کے تحریر کردہ حالات بجنسہٖ داخلِ تذکرہ کر لیے گئے ہیں۔اس طرح یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ شعلہؔ نے آغازِ شاعری میں منشی بال مکند بے صبرؔ سے مشورہ کیا اور اس کے بعد غالبؔ کے تلامذہ میں داخل ہو گیا۔'بہارِ سخن' کے مولّف نے شعلہؔ کا سالِ ولادت ۱۸۴۵ء اور سالِ وفات ۱۹۰۳ء (رام نومی کے دن) لکھا ہے۔اس طرح غالبؔ سے مشقِ سخن اگر سولہ سال کی عمر میں بھی کی ہو تو سالِ اصلاح ۱۸۶۰ء متعین ہوتا ہے۔''[۲]

صاحبِ 'یادگارِ ضیغم' کے بعد لیکن فائقؔ رام پوری سے تقریباً ستاون سال قبل مولانا حسرتؔ موہانی بھی شعلہؔ کو تلامذۂ غالبؔ میں شامل کر چکے ہیں۔ان کا یہ مضمون 'اردوے معلّٰی' کے ستمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔انھوں نے شعلہؔ کی مثنوی 'برج چھپ معروف بہ بزمِ برندابن' کا انتخاب بھی ان کے ایک عزیز منشی کرشن گوپال کی اجازت سے اس مضمون

کے ساتھ بہ طورِ ضمیمہ شائع کیا تھا۔ مولانا حسرتؔ کا یہ مضمون اگر فائقؔ صاحب کے علم میں ہوتا تو ایک معتبر راوی سے مضمون نگار کے استفادے کی بنا پر وہ اسے اپنے دعوے کی تائید میں ضرور پیش فرماتے۔ بہ ہر صورت مولانا حسرتؔ موہانی کا ارشاد ہے کہ:

''چودہ سال کی عمر تک آپ (شعلہؔ) فارسی زبان کی تحصیل میں مصروف رہے اور انیسویں سال شاعری کی ابتدا ہوئی۔ منشی بال مکند بے صبرؔ سکندر آبادی سے اصلاح لیتے تھے نیز منشی ہرگوپال تفتہؔ کی ہم صحبتی سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملتا تھا۔

بے صبرؔ اور تفتہؔ دونوں مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے۔ زمانۂ نومشقی میں دو چار غزلیں خود مرزا ے مرحوم کی نظر سے بھی گزریں اور مشرف بہ اصلاح ہوئیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں بے صبرؔ اور تفتہؔ دونوں کا انتقال ہو گیا اور ۱۸۷۳ء میں آپ محکمۂ بندوبست میں ملازم ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔''[۳]

حسرتؔ کا یہ بیان شعلہؔ کے اساتذہ کی فہرست میں مرزا غالبؔ اور بے صبرؔ کے علاوہ ایک تیسرے شخص منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام کا اضافہ کرتا ہے۔ تفتہؔ سے استفادے کا ذکر مالک رام نے بھی کیا ہے لیکن غالبؔ سے مشورۂ سخن کے بارے میں صاحبِ 'یادگارِ ضیغم' اور مولانا حسرتؔ کے بیانات ان کے نزدیک درست نہیں، چنانچہ 'تلامذۂ غالب' کے دیباچے میں ان حضرات کی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ضیغمؔ حیدر آبادی اور حسرتؔ موہانی نے منشی بنواری لال شعلہؔ کو تلامذۂ غالبؔ میں شامل کر لیا ہے، وہ تفتہؔ اور بے صبرؔ کے شاگرد تھے۔''[۴]

مالک رام صاحب کی یہ وضاحت فائقؔ صاحب کی نظر میں نہیں تھی، ورنہ موصوف یہ نہ فرماتے کہ انھوں (مالک رام) نے ضیغمؔ کے بیان کی نہ تائید کی ہے نہ تردید۔ سہواً وہ اس بیان کو دیکھ نہیں پائے۔

تفتہ کی شاگردی کا ذکر برق سیتاپوری کے تذکرے میں بھی موجود ہے۔ جناب فائق رام پوری نے اس تذکرے سے استفادہ فرمایا ہے، لیکن تلمذ کے سلسلے میں اُس کے اس اندراج کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ چونکہ برق کا بیان اختصار کے باوجود شعلہ کے سوانح اور شخصیت کے کئی اہم پہلوؤں کو محیط ہے، اس لیے من وعن سطورِ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

''منشی بنواری لال ولد منشی موتی لال قوم کایستھ بھٹناگر متوطن حصار، شاگردِ جناب منشی بال مکند بے صبر و جناب منشی ہرگوپال تفتہ۔ سالِ ولادت ۱۸۴۵ء۔ آپ ضلع علی گڑھ میں نامی وکیل تھے۔ فنِ شاعری میں ملکۂ تامّہ حاصل تھا۔ کہنہ مشق استاد تھے۔ ارمغانِ شعلہ (دیوان) وکلیاتِ شعلہ آپ سے یادگار ہیں۔ صاحبِ تلامذہ تھے۔ ۱۹۰۳ء میں رام نومی کے دن انتقال فرمایا۔''[۵]

اس سلسلے میں صاحبِ خم خانۂ جاوید لالہ سری رام کا بیان بھی اہم ہے۔ ان کے مطابق شعلہ کو ''فن شعر میں مرزا تفتہ تلمیذِ مرزا غالب سے تلمذ تھا۔''[۶] بے صبر اور غالب سے استفادے کا اس تذکرے میں کوئی حوالہ موجود نہیں۔ ان تمام بیانات کا ماحصل یہ ہے کہ:

(۱) حسرت موہانی کے نزدیک شعلہ نے غالب، بے صبر اور تفتہ تینوں سے استفادہ کیا تھا۔

(۲) عبداللہ خاں ضیغم اور کلب علی خاں فائق کے مطابق انھوں نے صرف غالب اور بے صبر سے اصلاح لی تھی۔

(۳) برق سیتاپوری اور مالک رام کے بقول وہ منشی بال مکند بے صبر اور منشی ہرگوپال تفتہ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

(۴) دیبی پرشاد بشاش (مولّفِ تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود) کے بہ موجب وہ صرف منشی بال مکند بے صبر کے شاگرد تھے۔

(۵) لالہ سری رام کے بقول انھیں صرف مرزا تفتہ سے تلمذ تھا۔

ان مختلف فیہ بیانات کی تطبیق اور تجزیے کے نتیجے میں جو صورتِ حال سامنے آتی

ہے، اس میں بہ ظاہر مولانا حسرتؔ موہانی کا بیان زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے لیکن حسنِ اتفاق سے ہمارے سامنے ایک ایسا ذریعۂ معلومات موجود ہے جو دوسرے تمام ذرائع سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے اور جس کی روشنی میں برقؔ سیتاپوری اور مالک رام کے علاوہ باقی تمام حضرات کے بیانات کی عدمِ صحت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ اہم ترین ذریعۂ معلومات خود شعلہؔ کی زندگی میں شائع شدہ ان کے کلیات کی ایک تقریظ ہے جو ان کے حقیقی بھتیجے منشی گھمنڈی لال متخلص بہ عاشقؔ، نائب فوج دار، راج سوائی جے پور و رئیسِ فیروزہ حصار نے لکھی ہے۔ عاشقؔ نے اس تقریظ میں شعلہؔ اور ان کے خاندان کے حالات کافی تفصیل کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔ چونکہ یہ تفصیلات کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں، اس لیے اس تقریظ کے خاص خاص حصوں کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر کے اسے سطورِ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

منشی گھمنڈی لال کے مطابق منشی بنواری لال شعلہؔ نسلاً چتر گپت ونشی کائستھوں کی بھٹناگر شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ بیکانیر کے مضافات میں قصبہ بھٹنیر ان کے بزرگوں کا آبائی وطن تھا۔ ۳۹۴ھ (۴-۱۰۰۳ء) میں جب سلطان محمود غزنوی نے دوسری بار حملے کے ارادے سے ہندوستان کا رخ کیا اور اس کا لشکر ملتان کے راستے سے بھٹنیر میں داخل ہوا تو اس کی تباہ کاری کے نتیجے میں بیش تر مقامی باشندوں نے راہِ فرار اختیار کی اور جہاں سر چھپانے کی جگہ مل گئی وہاں پڑاؤ ڈال کر آباد ہو گئے، لیکن شعلہؔ کے بزرگوں نے تمام صعوبتیں برداشت کرنے کے باوجود ترکِ وطن گوارا نہیں کیا۔ اس کے بعد ۷۸۷ھ میں جب امیر تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور اس کا لشکر پاک پٹن اور ملتان سے ہوتا ہوا بھٹنیر پہنچا تو یہاں راے دولچی والیِ بھٹنیر سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اس خوں ریز تصادم کے نتیجے میں باشندگانِ شہر دوبارہ نقلِ وطن پر مجبور ہوئے، چنانچہ شعلہؔ کے ایک بزرگ راے جگت سنگھ نے بھی بھٹنیر کو خیر باد کہہ کر فیروزہ حصار میں جسے اس ''گردشِ واژوں'' سے ایک سو چودہ سال قبل ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) میں ملک فیروز باربک الخاطب بہ سلطان فیروز شاہ نے اپنے نام سے آباد کیا تھا، سکونت اختیار کر لی۔ حصارؔ میں مستقل بود و باش کے بعد شیر خاں (معروف بہ شیر شاہ سوری) کے بیٹے سلیم شاہ (ملقّب بہ اسلام شاہ، سالِ جلوس: مئی ۱۵۴۵ء) کے عہدِ سلطنت سے اس خاندان کے

افراد نسلاً بعد نسلٍ اقصاے ہریانہ وبھٹیانہ و ناگور میں قانون گوئی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہ سلسلہ شعلہؔ کے جدِّ امجد رائے نرمل داس تک جو رائے جگت سنگھ کی گیارھویں پشت میں تھے، بہ دستور قائم رہا۔ چنانچہ ان کے زمانے میں بھی ان کے متعدد رشتے دار حصار، سہرسا، فتح آباد اور ان کے مضافات میں قانون گوئی کی خدمت پر مامور تھے۔ رائے نرمل داس کے بعد جب ہندوستان انگریزوں کے زیرِ نگیں آیا اور برطانوی مقبوضات میں انگریزی قوانین کا نفاذ شروع ہوا تو 'ارثِ خدمت' کی یہ روایت ختم ہوگئی۔

رائے نرمل داس نے اپنے پیچھے سات بیٹے چھوڑ کر انتقال کیا۔ ان میں سے تیسرے بیٹے رائے موتی لال نے جو شعلہؔ کے والد تھے، شروع میں ضلع حصار میں نظارتِ فوجداری کی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں ۱۸۴۷ء میں مسٹر گریہم صاحب بہادر جج عدالت ضلع سہارن پور نے انھیں اپنے یہاں طلب کر کے عدالت دیوانی میں ناظر مقرر کر دیا۔ تیس سال تک نہایت ''والا خردی و ہوش مندی'' کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے بعد انھوں نے اس ملازمت سے پنشن پر سبک دوشی حاصل کی اور سہارن پور ہی میں مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے۔ ۱۸۶۵ء میں وہیں ان کا انتقال ہوا۔

رائے موتی لال نے چار بیٹے چھوڑے، جنھوں نے ان کا اور ان کے خاندان کا نام روشن کیا۔ منشی بنوارہی لال شعلہؔ ان چاروں بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی ولادت ماہِ اساڑھ متی (کذا = بدی) دوادسی سمبت ۱۸۰۴ء بکرمی (کذا) مطابق ۲۵ر جولائی ۱۸۴۷ء کو جمعے کے دن سہارن پور میں ہوئی تھی۔ ۸ چودہ سال کی عمر تک وہ فارسی زبان کی تحصیل میں مصروف رہے۔ انیسویں سال میں ''لطافتِ نہاد و موزونیِ طبعِ خداداد'' کے تحت ''سخن سنجی و سخن گوئی'' کے میدان میں قدم رکھا۔ مشقِ سخن کے ابتدائی زمانے میں کچھ دنوں تک اپنی شعر گوئی کو صیغۂ راز میں رکھا لیکن ''لیلاے معنی و سلماے سخن'' کا جمال ''حجلۂ دل'' میں زیادہ دنوں مستور نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ''پردگیانِ معنی'' کا جلوۂ حسن جب برملا ظاہر ہوا تو ہر طرف سے غلغلۂ تحسین و آفریں بلند ہونے لگا۔ ابتدا میں انھوں نے ''جولانیِ طبع'' کے علاوہ کسی ''آموزگار'' سے رہنمائی حاصل نہیں کی لیکن دو تین سال کے بعد منشی بال مکند

بے صبرؔ سکندر آبادی کو جنھوں نے فخرِ دہلی مرزا نوشہ غالبؔ سے استفادۂ سخن کیا تھا، اپنا کلام دکھانے لگے۔ دو یا ڈھائی سال جب تک سہارن پور میں قیام رہا، شعلہؔ برابر ان سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد ازاں مرزا ہرگوپال تفتہؔ سکندر آبادی کی صحبت سے استفادہ کیا اور مشقِ سخن کو جلا بخشی۔ افسوس کہ ابتدائی زمانے کا یہ سارا کلام ضائع ہو گیا۔

۱۸۷۳ء میں شعلہؔ (سہارن پور سے ترکِ سکونت کر کے) علی گڑھ میں وارد ہوئے۔ یہاں ابتدا میں کچھ دنوں تک محکمۂ بندوبست سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کر کے عدالت دیوانی میں پریکٹس شروع کی اور ہمیشہ کے لیے اسی پیشے سے منسلک ہو گئے۔ وکالت کے ساتھ انھوں نے علی گڑھ میں ''قومی خدمات'' میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، چنانچہ جب کائستھ سبھا کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے کاموں کے نگراں اور نائب صدر مقرر ہوئے۔ ان کا مطبوعہ دیوان جس پر یہ تقریظ لکھی گئی ہے، علی گڑھ کے زمانۂ قیام ہی کے کلام پر مشتمل ہے۔ چونکہ مشقِ سخن کو پچیسواں سال ہے، اس لیے پختگی کلام درجۂ کمال کو پہنچ چکی ہے۔ مختلف اصنافِ شاعری و انواعِ سخن میں ملکۂ راسخہ رکھتے ہیں۔ شعرائے دہلی و لکھنؤ کے طرزوں کے امتزاج سے انھوں نے اپنا ایک مخصوص رنگِ سخن ترتیب دیا ہے، جس نے ان کے کلام کو ''سوداز دگانِ بہارِ سخن'' کے لیے ''معجونِ مفرح'' اور ''داروے جاں نواز'' بنا دیا ہے۔

آج کل موصوف سری مت بھاگوت گیتا کے دسویں اسکندھ کا اردو نظم میں ترجمہ کر رہے ہیں جس کی رنگینی و سحر آفرینی کی ہر طرف شہرت ہے۔ جب یہ ترجمہ مکمل ہو کر منظرِ عام پر آئے گا تو دل دادگانِ سخن اس کی اثر آفرینی کی برقِ بلا سے محفوظ نہ رہ پائیں گے۔

اس تقریظ کے مطابق شعلہؔ ۲۵/جولائی ۱۸۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۶ء میں انیس سال کی عمر میں انھوں نے شاعری کی ابتدا کی۔ شروع میں کچھ دنوں تک انھوں نے اپنے حسنِ طبیعت کی رہنمائی میں مشقِ سخن جاری رکھی، بعد ازاں منشی بال مکند بے صبرؔ سے اصلاحِ سخن کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس استفادے کو دو ڈھائی سال سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ ۱۸۷۳ء میں وہ بہ سلسلۂ ملازمت علی گڑھ چلے آئے اور استاد و شاگرد کا براہِ راست رابطہ

منقطع ہوگیا۔ان تفصیلات کی روشنی میں باوثوق طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بے صبرؔ سے اصلاح لینے کا سلسلہ ۱۸۷۱ء کے اوائل یا زیادہ سے زیادہ ۱۸۷۰ء کے اواخر میں شروع ہوا ہوگا۔ چونکہ اس سے قبل کسی اور سے اصلاح لینا ثابت نہیں، اس لیے مرزا غالبؔ سے جن کی تاریخِ وفات ۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء ہے، مشورۂ سخن کرنے یا دو چار غزلیں دکھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس سلسلے میں مولانا حسرتؔ موہانی کا یہ ارشاد بھی محلِّ نظر ہے کہ شعلہؔ بے صبرؔ اور تفتہؔ دونوں کے انتقال کے بعد ۱۸۷۳ء میں محکمۂ بندوبست میں ملازم ہوکر علی گڑھ آئے تھے۔صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ بے صبرؔ کا انتقال شعلہؔ کے علی گڑھ آنے کے تقریباً بارہ سال بعد فروری ۱۸۸۵ء میں ہوا۔۹ شعلہؔ نے جب ان سے اصلاح لینا شروع کی ہے تو استاد اور شاگرد دونوں سہارن پور میں مقیم تھے۔ جب شعلہؔ سہارن پور سے علی گڑھ چلے آئے تو سلسلۂ اصلاح ٹوٹ گیا۔علی گڑھ آنے کے بعد انھوں نے منشی ہرگوپال تفتہؔ سے رجوع کیا جن سے خود بے صبرؔ بھی اصلاح لیتے تھے۔ یہ سلسلہ بہ گمانِ غالب ستمبر ۱۸۷۹ء میں تفتہؔ کی وفات تک بہ دستور جاری رہا۔دوسرے ذرائع کے علاوہ خود شعلہؔ کے مندرجۂ ذیل شعر سے جو تفتہؔ کی وفات پر ان کے احساسِ غم کی ترجمانی کرتا ہے، استادی وشاگردی کے اس باہمی تعلق کی توثیق ہوتی ہے:

اٹھ گیا تفتہؔ سا استاد جہاں سے شعلہؔ
کر گیا بلبلِ خوش لہجہ گلستاں خالی

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے، دیوانِ شعلہؔ کی محولۂ بالا تقریظ ۱۸۸۶ء کی تحریر ہے۔ چونکہ خود تقریظ نگار کے بقول شعلہؔ نے سخن گوئی کا آغاز ۱۸۶۶ء میں کیا تھا، اس لیے تقریظ کے آخر میں ان کا یہ کہنا کہ اب مشقِ سخن کو پچیسواں سال ہے، درست نہیں۔ان کا یہ بیان آغازِ شعر گوئی کے علاوہ بے صبرؔ سے اصلاح کے زمانے اور مدت کے تعین میں بھی شبہات پیدا کرسکتا ہے۔لیکن تقریظ نگار سے سہواسی مقام پر ہوا ہے، اس کا اندازہ خود شعلہؔ کی ایک تحریر سے ہوجاتا ہے۔ انھوں نے 'بزمِ برندابن' میں جس کا سالِ اشاعت ۱۸۹۰ء ہے، اپنی مدتِ مشق پچیس سال بتائی ہے۔

برقؔ سیتاپوری نے شعلہؔ کے کلام کے دو مجموعوں 'ارمغانِ شعلہؔ' اور 'کلیاتِ شعلہؔ' کا ذکر کیا ہے۔ حقیقتاً یہ ایک ہی مجموعے کے دو نام ہیں اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کم از کم ۱۹۱۲ء تک اس ایک مجموعے کے علاوہ کلامِ شعلہؔ کا کوئی اور مجموعہ جسے دیوان یا کلیات کہا جا سکے، شائع نہیں ہوا تھا۔ 'کلیاتِ شعلہ' کا جو مطبوعہ نسخہ ہمارے پیشِ نظر ہے، اس کے سرورق کے اندراجات حسب ذیل ہیں:

''بعونِ صنّاعِ مکین ومکاں وفضلِ خلّاقِ زمین وزماں
دریں زمانِ بہارافزائے رنگِ سخن وتازہ فرمائے مضامینِ
نو وکہن
کلیاتِ
بنواری لال شعلہؔ
۱۸۸۶ء
نتائجِ افکارِ سخن سنجِ نازک خیال، منشی بنواری لال حصاری متخلص بہ
شعلہؔ
در مطبعِ کائستھ پرکاش علی گڑھ طبع گردید''

کلیات کا یہ نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ لالہ سری رام میں محفوظ ہے۔ اس کلیات کا ایک اور سرورق جو شعلہؔ کی ایک دوسری تصنیف 'بزمِ برندابن' کے ساتھ مجلّد ہے، ان اندراجات پر مشتمل ہے:

''بہ عونِ صنّاعِ مکین ومکاں وفضلِ خلّاقِ زمین وزماں نسخۂ
کلیاتِ منشی بنواری لال موسوم بہ
ارمغانِ شعلہؔ
نغمۂ طوطیِ شیوابیاں، ترانۂ بلبلِ خوش زباں، نتیجۂ افکارِ طبعِ بلند نازک
خیال، شاعرِ سخن سنجِ جادونگار، دقیقہ رس، نکتہ فہم، مسیح نفس، فصیحِ زمن،
شیریں مقال جناب منشی بنواری لال صاحب حصاری متخلص بہ شعلہؔ

وکیل عدالت ضلع علی گڑھ ۱۸۸۶ء

مطبعِ کایستھ پرکاش علی گڑھ بہ اہتمام لالہ سکھن لال ورماں طبع شد''

ان دوسرورقوں کے بعض مختلف فیہ اندراجات کے باوجود کلیاتِ بنواری لال شعلہؔ اور ارمغانِ شعلہؔ دو علیحدہ علیحدہ مجموعے نہیں، اس امر کی تصدیق پیشِ نظر کلیات کے مندرجۂ ذیل خاتمۃ الطبع سے بھی ہوتی ہے:

''ہزاراں ہزار سپاس بہ درگاہِ ناظمِ عالمِ موجودات.....

کہ.....کلیاتِ سحر بیاں موسوم بہ ''ارمغان شعلہ'' از تصنیفاتِ شاعرِ سخن سنجِ نازک خیال عزتِ سوداؔ وفخرِ طالبؔ، رشکِ آتشؔ ویادگارِ غالبؔ.....ناظمِ باکمال وناثرِ عدیم المثال جناب منشی بنواری لال صاحب متخلص بہ شعلہؔ رئیسِ فیروزہ حصار وکیل عدالت دیوانی ضلع علی گڑھ حسب اجازتِ جنابِ مصنفِ موصوف بہ مطبعِ کایستھ پرکاش علی گڑھ بہ اہتمام منشی سکھن لال ورماں مہتممِ مطبع بہ تاریخ ۲۰ ستمبر ۱۸۸۶ء حلیۂ انطباع دربرکشیدہ مطبوعِ طبائعِ خاص وعام گردید۔''[۱۰]

منشی گھمنڈی لال عاشقؔ کے مندرجۂ ذیل دو قطعاتِ تاریخ بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ 'کلیاتِ شعلہؔ' اور 'ارمغانِ شعلہؔ' ایک ہی مجموعے کے دو نام ہیں:

حبّذا ترتیبِ ایں دیوانِ نغز — کانتسابِ او بہ ذاتِ شعلہؔ شد
از رگِ اندیشہ خونِ دل چکید — منبعِ جوشِ صفاتِ شعلہؔ شد
اہلِ معنی را فراہم سازِ عیش — از وفورِ التفاتِ شعلہؔ شد
خوبیِ معنی کہ در الفاظِ اوست — ہم ز طبعِ پر نکاتِ شعلہؔ شد

گفت عاشقؔ ازپےِ تاریخِ طبع
انطباعِ کلیاتِ شعلہؔ شد

۱۸۸۶ء

دیگر

گر ببینی گوہریں نظمِ خوش آب　　　ایں زبانِ خوش بیانِ شعلؔہ ہیں
دل برد از دست، دست از کارِ دل　　　جادوئی ہائے زبانِ شعلؔہ ہیں
بشگفاند دل چو گلزارِ خلیل　　　سحر کاریِ عیانِ شعلؔہ ہیں
دل چہ بندی باکہن باغِ بہشت　　　نو بہارِ گلستانِ شعلؔہ ہیں

سالِ طبعش عاشقؔ دل دادہ گفت
ایں نویِ ارمغانِ شعلؔہ ہیں

۱۸۸۶ء

اس سلسلے کی آخری شہادت خود منشی بنواری لال شعلؔہ کا مندرجہ ذیل بیان ہے جو 'بزمِ برندابن' (مطبوعہ ۱۸۹۰ء) کے دیباچے سے ماخوذ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے مشغلۂ شعر گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پچیس برس سے سخن سازی کے دریاے ناپیدا کنار میں ہاتھ پیر مارتا رہا۔ دیوان، قصائد، مسدس، مثنوی سب کچھ تصنیف کیے اور اس کی قدر افزائیوں کا زمانے کی رنگتوں کے موافق فخر بھی حاصل ہوتا رہا، چنانچہ اس ہرزہ سرائی سے ایک جلد دیوان موسوم بہ 'ارمغانِ شعلؔہ' ولایت میں بھی مانگا گیا جو اس وقت برٹش میوزیم یعنی عجائب خانۂ لندن کی کسی میز پر رکھا ہوگا۔"[۱۱]

شعلؔہ کے اس بیان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۹۰ء سے قبل ان کا صرف ایک دیوان موسوم بہ 'ارمغانِ شعلؔہ' چھپا تھا۔ اگر 'کلیاتِ شعلؔہ' اس سے مختلف کوئی مجموعہ ہوتا تو وہ یقیناً اس کا بھی تذکرہ کرتے۔ اس کے علاوہ منشی گھمنڈی لال کے مطابق علی گڑھ آنے سے پہلے کا تمام کلام ضائع ہو چکا تھا اور علی گڑھ میں ورود کے بعد کا بیش تر کلام اس مجموعے میں شامل ہے جو 'کلیاتِ بنواری لال شعلؔہ' کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ مزید برآں سابق الذکر دو سرورقوں کے مطابق 'کلیاتِ بنواری لال شعلؔہ' اور 'کلیاتِ منشی بنواری لال موسوم بہ

ارمغانِ شعلہؔ دونوں کا سالِ طباعت ۱۸۸۶ء ہے، اس لیے ان دونوں کے باہم مختلف ہونے کا بہ ظاہر کوئی امکان نہیں۔ البتہ اس سلسلے میں مولانا حسرتؔ موہانی کا یہ بیان غور طلب ہے۔

> ''کلیاتِ شعلہؔ جس میں جملہ اصنافِ سخن کے پسندیدہ نمونے موجود ہیں، ۱۸۸۶ء میں طبع ہوا تھا، اب کم یاب ہو گیا ہے۔ یہی حال آپ کی مثنوی برج چھب معروف بہ بزمِ برندابن کا ہے..... (یہ) مثنوی مع دیوان و مجموعۂ مخمسات و مسدساتِ جدید بہت جلد کلیات کی صورت میں منشی صاحب (منشی کرشن گوپال صاحب) کی سعی سے دوبارہ چھپنے والا ہے۔''[۱۲]

۱۹۱۲ء کے بعد کلیات کے اس متوقع جدید ایڈیشن کی اشاعت بعید از امکان نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہی دوسرا ایڈیشن برقؔ سیتاپوری کے پیشِ نظر رہا ہو، اور اس میں پہلے ایڈیشن کی بہ نسبت کچھ زیادہ کلام بھی موجود ہو۔

کلیاتِ شعلہ پندرہ سطری مسطر کے ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ردیف وار غزلیات (ص ۲ تا ص ۱۴۷) کے علاوہ بائیس رباعیاں، مومنؔ اور رندؔ لکھنوی کی غزلوں پر دو مخمس، دو دو اشعار کے دو قطعے، مسدّس کی شکل میں انتیس بندوں کا 'مرقعِ سراپائے شوخِ طناز'، سترہ بندوں کا ایک اور مسدّس بہ عنوان 'نوحۂ جاں گدازِ حور شیم'، ماہ طلعت، دل نواز' اور تین قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔ صفحہ ۱۶۹ سے طبعِ دیوان سے متعلق تقریظوں اور تاریخی قطعوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پہلی تقریظ منشی گھمنڈی لال عاشقؔ کی ہے جس کے آخر میں ان کے دو قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔ اس کے بعد منشی رام سہائے تسلیمؔ، ڈپٹی کلکٹر ضلع بدایوں، منشی جمنا پرشاد عیشؔ، شاگردِ شعلہؔ، منشی نند لال حضورؔ، تحصیل دار ضلع سہارن پور، شاگردِ شعلہؔ، لالہ سادھو رام متخلص بہ فتنہؔ، منصرم بندوبست ضلع بستی، شاگردِ شعلہؔ، منشی رام نرائن شفیقؔ، منشی عبدالمجید مجیدؔ، اہلمد کلکٹری ضلع علی گڑھ، منشی اجودھیا پرشاد، مختار کلکٹری علی گڑھ اور لالہ گنیش لال مفتوںؔ کے قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔ ان قطعات کے بعد

مسٹر جارج پیش شور ''صاحبِ دیوان، رئیس علی گڑھ، مقیم کیمپ میرٹھ'' کی تقریظ اور ایک قطعۂ تاریخ اور بخشی سکھ لال مجنوںؔ کا ایک تاریخی قطعہ منقول ہے۔ آخر میں 'خاتمۃ الطبع' ہے، جس کے ساتھ یہ دیوان مکمل ہو جاتا ہے۔

'کلیاتِ شعلہ' کے علاوہ شعلہؔ کی ایک مثنوی 'برج چھب' موسوم بہ 'بزمِ برندابن' اور ایک مجموعۂ متفرقات موسوم بہ 'نظم شعلہؔ' بھی شائع ہو چکا ہے۔ مثنوی 'برج چھب' کو اس کے سرورق کے اندراجات میں ''آئینۂ حقیقت نما، سرمایۂ دولتِ لایزال، سریمت بھاگوت گیتا کا پرم پونیت لبِ لباب، راس پنچ ادھیائے کی دل گذار نظم'' قرار دیا گیا ہے۔ کرشن جی کے نام اس کا انتساب کرتے ہوئے شعلہؔ نے لکھا ہے:

> ''سری کرشن چندر مہاراج کے چرن کملوں کو کوٹان کوٹ ڈنڈوت ہیں، جن کے چرن امرت کی اپار مہما کو شیش، ساردا، برہما، بشن بھی بیان نہیں کر سکتے۔ انھیں چرنوں کی کرپا اور دیالتا سے بھگوت بھگتوں کو پریم آنندرس کی دینے والی یہ پریم پونیت پوتھی اردو زبان میں نظم کی گئی ہے۔ اے ناظرین سنسار میں کون ایسا منش ہے جو اس پرم پوتر پستک کو جس میں سچدانند، گہن پورم برہمہ، برج چندر کے گنانباد اور ادھبت چرتر برنن ہوئے ہیں، اپنے نام پر معنون کرانے کا ادھیکاری ہو، اس لیے جن کومل چرنوں کے دھیان سے یہ نعمتِ لایزال مجھ کو عطا ہوئی ہے، اونھیں چرنوں میں بھینٹ کرتا ہوں۔''[۱۳]

یہ مثنوی سولہ سطری مسطر کے نوے صفحات کو محیط ہے اور 'کلیاتِ شعلہؔ' کی طرح مطبعِ کایستھ پرکاش علی گڑھ ہی میں طبع ہوئی ہے۔ سرورق پر یا کسی دوسری جگہ اس کا سنہ طباعت درج نہیں، البتہ خود شعلہؔ کے کہے ہوئے مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ سے اس کا سالِ تصنیف ۱۸۹۰ء برآمد ہوتا ہے:

چو شد آراستہ ایں گلشنِ راز　　بہارِ برج چھب، نیرنگِ قدرت
برہما سربروں آوردہ از جیب　　بہ جوشِ خرمی داد ایں بشارت
کہ اے شعلہ پیِ تاریخِ تصنیف
بگو 'نظارۂ حسنِ حقیقت'

۱۸۹۰=۲-۱۸۹۲ء

'نظم شعلہ' کے آخر میں ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس میں اس مثنوی کی عام مقبولیت وپسندیدگی کے بارے میں مندرجۂ ذیل معلومات فراہم کی گئی ہے:

''اس مبارک تصنیف کی نسبت اکثر اخبارات نے بڑے بیش بہاالفاظ میں ریویوشائع کیے ہیں.....دوردور تک یہ پرم پونیت کتاب نہایت شوق سے منگائی گئی ہے۔بھگت سجّنوں نے اس کواپنے پاس رکھنا ایک برکت سمجھا ہے.....یہ وہ کتاب ہے.....جس کی قدردانی پر مصنف کو.....ہز ہائنس مہاراجہ جگت جیت سنگھ بہادر اہلو والیہ چندربنس،کل بھوشن والیِ کپورتھلہ دام ملکہٗ کے دربار سے ہر سال ایک بیش بہا خلعتِ فاخرہ تین سوروپیہ سال کا عطا ہوتا ہے.....۔''

'بزمِ برندابن' سے شعلہ کی قادرالکلامی اورخوش گوئی دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔اس مثنوی میں جابہ جا منظرکشی اورحسنِ بیان کے بڑے دل کش اور پرتا ثیرنمونے موجود ہیں۔ مثال کےطور پر چاندنی رات میں برندابن میں کرشن جی کی نےنوازی اورگوپیوں کے بے تابانہ ورودکا یہ منظر پیش کیا جاسکتا ہے:

دھری مرلی ادھرگردھرنے چھب سے　　بھرے سُر شام نے اعجازِ لب سے
صدائے نغمۂ نے غارتِ ہوش　　دو عالم بیخودی سے خود فراموش
قیامت زا عجب اندازِ نے تھا　　عجب جاں آفریں دم سازِ نے تھا
تھمی رک رک کے لہروں کی روانی　　جما چلتا ہوا جمنا کا پانی

سمٹ کر رات سانچے میں ڈھلی تھی — شبِ مہتاب چاندی کی ڈلی تھی
تلاشِ دل میں ہر نغمہ رواں تھا — بندھا مرلی کی دھن کا اک سماں تھا
ہر اک آواز پیغامِ بشارت — ہراک انگلی میں تھی رمزِ اشارت
کیا بے چین ساری گوپیوں کو — پکارا پریم پیاری گوپیوں کو
یہ کہہ کر سب نے تن من دھن بسارا — چلو سکھیو کہ ٹیرے کانہہ پیارا
وفورِ شوق سے رعشہ بدن میں — نہ جاں تن میں، نہ تن تھا پیرہن میں
روانہ سوے بن از خود فراموش — پری رویانِ متھرا دوش بر دوش
بھرا جادو تھا بنسی کی صدا میں — ہزاروں کر گئی رخنے حیا میں
نہ سدھ گھر کی، نہ سدھ تن کی، نہ من کی — ہوا سر میں بھری تھی برج بن کی

اس مثنوی میں شعلہؔ نے موقع بہ موقع غزلیں بھی کہہ کر شامل کی ہیں۔ یہ غزلیں کرشن بھگتی اور معرفت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ایک غزل کے چند شعر بہ طورِ نمونہ سطورِ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

آ ملی صبحِ ازل چاک گریبانوں میں — ورنہ پہلے تو ہمیں تھے ترے دیوانوں میں
برج بن ہی نہیں اک دامنِ صحرائے جنوں — وحشیوں کا ہے ترے شور بیابانوں میں
جس نے شیرازۂ اجزائے دوعالم باندھا — ہم ہیں اس گیسوؤں والے کے پریشانوں میں
نغمۂ نے کا ہے اعجاز کہ لب کا اعجاز — جاں نکلتی ہوئی آجاتی ہے بے جانوں میں

اے شہِ حسن خدارا نگہِ لطف ادھر
شعلہؔ خاک نشیں بھی ہے ثنا خوانوں میں

غزلوں کے علاوہ اس مثنوی میں تینتالیس بندوں پر مشتمل ایک مسدّس اور بیس رباعیاں بھی شامل ہیں۔ ہماری معلومات کی حد تک میرؔ کے شکارناموں کے بعد کسی مسلسل نظم میں مختلف بحروں اور ہیئتوں کے اجماع کا یہ دوسرا تجربہ ہے۔

'نظمِ شعلہؔ' ان منظومات کا مجموعہ ہے جو کایستھ سبھا کی سالانہ کانفرنسوں اور سبھا کی طرف سے وقتاً فوقتاً منعقد کیے جانے والے جلسوں میں پڑھی گئی تھیں۔ یہ مجموعہ بیس سطری

مسطر کے چھتیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف موضوعات سے متعلق چھے مسدّس جن کے بندوں کی مجموعی تعداد چھیانوے ہے، دو قصیدے جن کے اشعار کی تعداد بالترتیب اناسی اور اکیاون ہے، دو قطعات جن میں سے پہلے میں چار اور دوسرے میں ستّر اشعار ہیں اور تیرہ رباعیاں شامل ہیں۔

'کلیاتِ شعلہ' اور 'بزمِ برندابن' کی طرح 'نظمِ شعلہ' کی طباعت واشاعت بھی مطبعِ کایستھ پرکاش، علی گڑھ سے عمل میں آئی ہے، لیکن اس مجموعے کے سرورق پر یا کسی دوسری جگہ سالِ اشاعت درج نہیں، البتہ اس کی آخری نظم ۱۸۹۳ء میں کایستھ کانفرنس منعقدۂ متھرا میں پڑھی گئی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۹۳ء کے بعد کے قریبی زمانے ہی میں چھپا ہوگا۔ اگرچہ اس مجموعے کی نظمیں بھی شعلہ کی قدرتِ کلام اور مہارتِ فن پر شاہد ہیں، تاہم ان میں تاثیر کی وہ کیفیت مفقود ہے جو ان کے باقی کلام میں جاری وساری نظر آتی ہے۔

شعلہ کی غزلیں شستگی وپختگی اور برجستگیِ کلام کے بڑے اچھے نمونے پیش کرتی ہیں۔ اس وصفِ خاص میں غالب کے شاگردوں میں حالی اور شیفتہ جیسے دو چار شاعروں کے علاوہ کوئی ان کا ہم سر نہیں اور شاگردوں کے شاگردوں میں تو بہ مشکل ہی کوئی ان کا مدمقابل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے بھتیجے منشی گھمنڈی لال عاشق کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ انھوں نے دہلی اور لکھنؤ کے رنگوں کے امتزاج سے اپنا ایک علیحدہ رنگ ایجاد کیا ہے۔ لالہ سری رام ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شعلہ نازک خیال سخنور اور نکتہ سنج شاعر تھے۔ شعرائے علی گڑھ ہی میں نہیں بلکہ دور دور ان کی شاعری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی.....طبیعت میں جدّت، کلام میں تہذیب ومتانت تھی۔ مکروہ الفاظ اور عامیانہ خیالات سے پرہیز کرتے تھے۔ عالمِ باطن کے مناظر کو عجیب اور نئے اسلوب سے بیان کرنے میں خداداد ملکہ تھا۔ باریک بینی اور نزاکت خیال ان کا حصّہ تھی۔ شعر کو تشبیہات کے

زیور سے بھی سجاتے تھے۔ کلام میں استعارات کی مرصّع کاری بھی ہے، مگر کہیں مضمون کی اصلیت اور حقیقت کو اس نمائش کے پردے میں نہیں چھپایا ہے۔ کلام میں پختگی بھی ہے اور سوز و گداز بھی اور درد بھی.....۔''[۱۴]

مولانا حسرتؔ موہانی نے ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ان الفاظ میں بیان فرمائی ہیں:

''مضمون کی تازگی اور طرزِ بیان کی جدت آپ کی شاعری کے خاص جوہر ہیں۔ کہیں کہیں کم تر غالبؔ اور زیادہ تر مومنؔ کا اندازِ کلام بھی اپنی تمام خوبیوں اور خصوصیتوں کے ساتھ آپ کی شاعری میں موجود نظر آتا ہے۔ اگر ان چند لفظی غلطیوں اور عروضی کمزوریوں کا لحاظ نہ کیا جائے جن کا پایا جانا ان کی فارسی دانی کے اعتبار سے اکثر موقعوں پر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے تو ہم کافی وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ شعرائے ہنود کے گروہِ متاخرین میں قدیم رنگِ قصیدہ وغزل کی پیروی شعلہؔ سے بہتر بلکہ ان کے برابر بھی کسی اور سے نہیں ہوسکی ہے.....۔''[۱۵]

سطورِ ذیل میں شعلہؔ کی غزلوں کا ایک مختصر انتخاب بہ طورِ نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

میں جبہہ سا ہوں اس درِ عالی مقام کا　　کعبہ جہاں جواب نہ پائے سلام کا
یاں اور آرزو ہے، وہاں اور آرزو　　دل میرے کام کا ہے، نہ میں دل کے کام کا

☆☆☆☆☆

نکلے گی روح توڑ کے ایک ایک بند کو　　ثابت کہیں اترتا ہے جامہ حیات کا
فرصت شگفتگی کی نہ پائی کہ مٹ گیا　　غنچہ تھا میں بھی کس چمنِ بے ثبات کا

☆☆☆☆☆

میں وہ گناہگار ہوں پہنچا جو دیر میں رحمت لپٹ کے کہنے لگی، تو کہاں رہا
محشر بھی کوئی درد ہے جو اٹھ کے رہ گیا شکوہ بھی کوئی غم ہے جو دل میں نہاں رہا

☆☆☆☆☆

ہر برگِ خزاں دیدہ بنا ہے کفِ حسرت گلشن میں نئے رنگ سے شیون ہے ہمارا

☆☆☆☆☆

وہ چھپتے پھرتے ہیں گھبرائے، کیا قیامت ہے یہ کون عرصۂ محشر میں بے قرار آیا

☆☆☆☆☆

ہجر میں اور بھی مشکل ہے نکلنا دم کا میں اسی بات پہ مرتا تھا کہ آساں ہوگا
دو قدم چل کے دو عالم کو کروگے پامال پانو رکھوگے جہاں، گنجِ شہیداں ہوگا
مرگِ غربت میں نہیں میرے ہی رونے والے بے کسی کون ترے حال کا پرساں ہوگا

☆☆☆☆☆

مر گئے ابتدائے عشق میں ہم آسماں کا نہ حوصلہ نکلا

☆☆☆☆☆

چار عنصر سے مرکّب ہے جہاں کا غم کدہ کتنے موزوں پائے ہیں اس مرثیے نے چار بند

☆☆☆☆☆

بے کس ہے ایسی جسم میں آ کر عدم سے روح بے چارہ جیسے کوئی مسافر وطن سے دور

☆☆☆☆☆

باغ میں بندِ قبا آپ سمجھ کر کھولیں دمِ بلبل نہ نکل جائے کہیں بو ہو کر

☆☆☆☆☆

مہ وشوں کو ہے مرے گھر سے کچھ ایسی نفرت چاندنی تک نہیں پڑتی مری دیواروں پر

☆☆☆☆☆

مانا کہ سن لیا ہے مگر اس کا کیا علاج کہتا ہوں حالِ دل تو وہ کہتے ہیں، سب غلط

☆☆☆☆☆

دل خراشی سے ہے کیا کوہ کنی کو نسبت ناخنِ غم سے فزوں تیشۂ فرہاد نہیں

☆☆☆☆☆

چلتی ہے تیرے ساتھ قیامت قدم قدم اعجازِ عیسوی ہے تری بات بات میں

☆☆☆☆☆

امیدِ جلوۂ دیدار بعدِ مرگ کہاں بھری ہے یاس نے خاکِ مزار آنکھوں میں

☆☆☆☆☆

ابھی سے بیٹھ گئے تھک کے قافلے والو! ابھی تو دور ہے منزل، چلو بڑھو بھی کہیں

☆☆☆☆☆

یارانِ رفتگاں سے وہ کیا روشناس ہو جو آنکھ نقشِ پائے سرِ رہ گذر نہیں

☆☆☆☆☆

جو کہوں گا سرِ محشر، اس کو پہلے تم بیٹھ کے تنہا سن لو

☆☆☆☆☆

بات سچی ہو تو محشر ہی کی امید کریں جھوٹے وعدے ہوں تو مرنے کی تمنا کیا ہو

☆☆☆☆☆

ہو کے پابندِ قفس، طاقتِ پرواز بڑھی پر جو توڑے مرے صیاد نے، شہپر نکلے

☆☆☆☆☆

دل ایک اور خون کے پیاسے ہزار ہا سورندِ بادہ نوش ہیں، پیمانہ ایک ہے

☆☆☆☆☆

دل پھینک دوں نکال کے سینے سے جب کہو حسرت مگر نہیں ہے مرے اختیار کی

☆☆☆☆☆

آئنہ خانہ ہوئی عشق میں حیرت میری تیری صورت میں نظر آتی ہے صورت میری

☆☆☆☆☆

گوشۂ دل میں خیالِ بے نقاب آنے کو ہے ذرّے کی خلوت سرا میں آفتاب آنے کو ہے

☆☆☆☆☆

جنوں کا سلسلہ در پردہ نکلا حسنِ پنہاں سے　　حجابِ یار رسوا ہے مرے چاکِ گریباں سے

☆☆☆☆☆

چھپا ہوا سا ہے طرزِ حجاب شوخی میں　　کھلی کھلی ہوئی شوخی ترے حجاب میں ہے

☆☆☆☆☆

ہماری خاک امانت ہے ان کی ٹھوکر کی　　صبا سے کہہ دو کہ تربت ذرا بچا کے چلے

☆☆☆☆☆

لذتِ زخم سے تھا شوقِ تپیدن کیا کیا　　کر دیے میں نے قیامت کے نمک داں خالی

شعلہؔ کی غزلوں کے متعدد مقطعے ان کی شاعری یا شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس حیثیت سے ان کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہاں ان میں سے چند بہ طورِ نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

ہے سرورِ بادۂ رنگیں، سخن سازی مری　　موجِ بحرِ مے ہے شعلہؔ، شعرِ مستانہ مرا

☆☆☆☆☆

غربت حصار کھینچے ہوئے ابتدا سے تھی　　شعلہؔ تمام عمر رہے ہم وطن سے دور

☆☆☆☆☆

شعلہؔ کے بعد ختم ہے ایجادِ طرزِ نو　　کچھ لطف تھا سخن کا اسی خوش بیاں تلک

☆☆☆☆☆

شعلہؔ بہ فیضِ طبع وہ اہلِ کمال ہیں　　ظاہر ہوا ہے ہم سے ہنر اور ہنر سے ہم

☆☆☆☆☆

شعلہؔ سخن کی جنس کا بازار بند ہے　　دنیا میں قدردانیِ اہلِ ہنر نہیں

☆☆☆☆☆

دور سے آتی ہیں فرمائشیں کیوں بہرِ سخن　　شعلہؔ غالبؔ نہیں کچھ، ذوقؔ سا استاد نہیں

☆☆☆☆☆

غربت میں رہتے رہتے زمانہ گزر گیا　　شعلہؔ اگر گئے بھی، ملے گا وطن میں کون

☆☆☆☆☆

نہ طبیعت میں مزہ ہے، نہ زباں میں کچھ لطف　　شعلہؔ مدت ہوئی ہم طرزِ سخن بھول گئے

☆☆☆☆☆

ہمارا عجز ہے اے شعلہؔ نقش بندِ خیال　　قلم کی چال سے چلتے ہیں سر جھکائے ہوئے

لالہ سری رام کے بقول ''شعلہؔ کے شاگردوں کی کافی تعداد تھی مگر منشی کندن لال شررؔ سہارن پوری سب میں بہتر تھے۔''[۱۶] حسرتؔ موہانی نے شررؔ کے ساتھ منشی اٹل بہاری دلریشؔ، مختارِ علی گڑھ کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱۷] ان دو شاگردوں کے علاوہ ان کے تلامذہ میں سے مزید تین افراد منشی نندلال حضورؔ، منشی جمنا پرشاد عیشؔ اور لالہ سادھو رام فتنہؔ کے نام 'کلیاتِ شعلہؔ' کے قطعاتِ تاریخ سے معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا حسرتؔ موہانی اور منشی شیام سندر لال برقؔ سیتاپوری دونوں نے شعلہؔ کا سالِ وفات ۱۹۰۳ء بتایا ہے۔ برقؔ کے بہ قول یہ سانحہ اس سال رام نومی کے دن (جو رشی کیش پنچانگ، بنارس بابت سنبت ۱۹۶۰ء بکرمی کی رو سے دوشنبہ، ۶ راپریل کو واقع ہوئی تھی) پیش آیا تھا۔ ان دو ذرائع کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اس اطلاع کی تائید نہیں ہوتی تاہم اس کے معتبر ہونے پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی:

۱ تلامذۂ غالب مرکز تصنیف وتالیف، نکودر (پنجاب)، ۱۹۵۸ء، ص ۵۵
۲ سہ ماہی 'اردو' کراچی، غالبؔ نمبر، ۱۹۶۹ء، جلدِ اول، ص ص ۴۸۷ و ۴۸۸
۳ ماہ نامہ 'اردوے معلّٰی' علی گڑھ، شمارہ ستمبر ۱۹۱۲ء، ص ص ۳ و ۴
۴ تلامذۂ غالب، ص ۷
۵ بہارِ سخن، مطبعِ ایل. بی سیتاپور، ۱۹۲۲ء، ص ۲۲۳
۶ خم خانۂ جاوید، جلدِ چہارم، ہمدرد پریس، دہلی، ۱۹۲۶ء، ص ۵۵۷
۷ یہاں تقریظ نگار سے سہو ہوا ہے کیونکہ ۷۶۸ھ-۱۳۶۶ء کے مطابق ہے جب کہ امیر تیمور کا حملہ ۱۳۹۸ء کا واقعہ ہے۔
۸ ۲۵/جولائی ۱۸۴۷ء کو جمعے کی بجائے اتوار کا دن تھا۔ البتہ ۱۸۴۵ء میں جو برقؔ سیتاپوری کا بیان کردہ سالِ ولادت ہے، یہ تاریخ جمعے کے دن پڑی تھی لیکن سمبت بکرمی سنہ (صحیح سنہ ۱۹۰۴ء) کے اعتبار سے ۱۸۴۷ء ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بہ ظاہر غلطی دن یا تاریخ کے تعین میں ہوئی ہے۔
۹ بہ حوالہ مضمون 'منشی بال مکند بے صبرؔ' از ہری کشن رازؔ، مشمولہ ماہ نامہ 'نیا دور'، لکھنؤ، شمارہ ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء
۱۰ کلیاتِ شعلہؔ، ص ۱۸۵
۱۱ بزمِ برندابن، ص ۳
۱۲ ماہ نامہ 'اردوے معلّٰی'، شمارہ مذکور الصدر، ص ۴
۱۳ بزمِ برندابن، ص ۸
۱۴ خم خانۂ جاوید، جلدِ چہارم، ص ۵۵۷
۱۵ ماہ نامہ 'اردوے معلّٰی'، شمارہ مذکور الصدر، ص ص ۴ و ۵
۱۶ خم خانۂ جاوید، جلدِ چہارم، ص ۵۵۷
۱۷ ماہ نامہ 'اردوے معلّٰی'، شمارہ مذکور الصدر، ص ۴
(شش ماہی 'غالب نامہ'، نئی دہلی، شمارہ جنوری ۱۹۸۳ء)

اودھ اخبار کی ادبی قدر و قیمت

ہر زندہ اور متحرک معاشرے میں ہمیشہ چند منتخب افراد اجتماعی یا انفرادی طور پر اس کی اصلاح اور تعمیر و ترقی کے عمل میں مصروف و سرگرداں رہتے ہیں۔ اس قسم کی کوششیں خواہ بلا واسطہ ہوں یا بالواسطہ اور چاہے ان کا محرک کارِ خیر کا جذبہ ہو یا حصولِ منفعت کی خواہش، ان کے اثرات بہر صورت دوررس اور دیرپا ہوتے ہیں۔ حصولِ مقاصد کی اس تگ و دو میں براہِ راست شرکت کرنے والوں کا شمار اگر مصلحین و قائدین میں ہوتا ہے تو ان کی راہوں میں چراغ روشن کرنے والے محسنین کی صف میں جگہ پاتے ہیں۔ انتزاعِ سلطنتِ اودھ اور اٹھارہ سو ستاون کے ہنگاموں کے بعد تباہ حال لکھنؤ میں ثقافتی سطح پر تعمیرِ نو کا کام کرنے والوں میں ایک اہم نام ہے منشی نول کشور کا، جنھوں نے بڑے پیمانے پر کتابوں کی اشاعت اور ایک اخبار کے اجرا کے ذریعے علم کی روشنی عام کی اور نہ صرف ملک کے دور دراز علاقوں تک، بلکہ وسطِ ایشیا اور یورپ تک اپنا، اپنے مطبعے کا اور اپنے شہر کا نام روشن کیا۔ وہ اصلاً علی گڑھ کے مضافات کے رہنے والے تھے، لیکن لکھنؤ کے ساتھ ان کا نام اس طرح وابستہ ہو گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی اس شہر کی علمی و تہذیبی سرگرمیوں کا کوئی تذکرہ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہوگا۔ انھوں نے ہزارہا کتابیں شائع کیں، جن میں ایسی کتابوں کی تعداد بھی

سیکڑوں سے متجاوز ہے، جوانھوں نے شائع نہ کی ہوتیں تو آج ان کے نام جاننے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ وہ بلا شبہ مشرقی علوم وادبیات کے محسنین میں سے تھے۔ ان کا فیض براہِ راست یا بالواسطہ ہر اس شخص تک پہنچا ہے جو اردو وفارسی زبان وادب یا عربی اور علومِ اسلامیہ کا طالب علم رہا ہے اور یہ سلسلہ ابدالآباد تک جاری رہے گا۔

منشی جی کا آبائی وطن ساسنی، ضلع علی گڑھ تھا، لیکن ان کی ولادت ۳؍جنوری ۱۸۳۶ء کو متھرا ضلع کے ایک گاؤں ریڑھا میں ان کی ننھیال میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے ساسنی میں حاصل کی، بعدازاں دس سال کی عمر میں انھیں مزید تعلیم کے لیے آگرہ بھیج دیا گیا، جہاں انھوں نے پانچ سال تک آگرہ کالج میں پڑھ کر انگریزی اور عصری علوم کی بہ قدرِ ضرورت استعداد بہم پہنچائی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آگرے ہی کے ایک اخبار ''سفیرِ آگرہ'' سے وابستہ ہو گئے۔ اس تعلق کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اخبار 'کوہِ نور' کے ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے کی دعوت پر ۱۸۵۳ء میں وہ لاہور چلے گئے اور ان کے اخبار میں کام کرنے لگے۔ لاہور میں ان کا قیام ۲۱؍ستمبر ۱۸۵۷ء یا اس کے کچھ بعد تک رہا۔[۱] کم وبیش چار سال کی اس مدت میں انھوں نے صحافت، طباعت اور انتظامی امور میں اپنی لیاقت کے ایسے شواہد پیش کیے کہ منشی ہرسکھ رائے نے انھیں اخبار اور پریس سے متعلق جملہ معاملات کا مختارِ کل بنا دیا۔ ۱۸۵۷ء کے اواخر میں بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر وہ یہ ملازمت ترک کر کے آگرہ آ گئے اور کچھ دنوں وہاں قیام کرنے کے بعد لکھنؤ چلے آئے۔ لکھنؤ آنے کے بعد 'اخترِ شہنشاہی' کے مطابق انھوں نے ۲۳؍نومبر ۱۸۵۸ء کو ایک چھوٹے سے ہینڈ پریس سے طباعتی کام آغاز کیا اور اپنی بیدار مغزی، تجربہ کاری اور تن دہی کی بدولت نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرنا شروع کر دیں۔ اس سمت میں ان کا اگلا قدم 'اودھ اخبار' کے نام سے ایک ہفت روزہ جریدے کا اجرا تھا۔ یہ اخبار کس تاریخ سے جاری ہوا، اس سلسلے میں باوثوق طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ ۳۰؍جنوری ۱۸۶۶ء کے شمارے سے مجملاً صرف اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ ۱۸۵۹ء میں اس کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ ۱۸۶۲ء اور اس کے بعد کے دستیاب شماروں کی بنیاد پر قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا پہلا شمارہ ۵؍جنوری ۱۸۵۹ء کو منظرِ عام پر آیا

ہوگا۔'اودھ اخبار' کی کامیابی کے بعد منشی جی نے 'اودھ ٹائمز' کے نام سے ایک ہفت روزہ انگریزی اخبار بھی نکالا اور اپنی وفات سے سے صرف ایک ماہ قبل جنوری ۱۸۹۵ء میں ایک اردو ماہ نامہ 'اودھ ریویو' بھی جاری کیا، لیکن صحافت کی دنیا میں ان جرائد کو وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جو 'اودھ اخبار' کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔

'اودھ اخبار' شروع میں ہفتے میں صرف ایک بار ہر چہار شنبے کو شائع ہوتا تھا۔ اشاعت کے چھٹے سال میں قدم رکھنے کے بعد ۲؍فروری ۱۸۶۴ء سے یہ چہار شنبے کی بجائے سہ شنبے کے دن شائع ہونے لگا۔ بعد ازاں ۱۸۷۱ء میں ''اکثر ناظرینِ جدت پسند شائقینِ دانشمند کی قدر دانی'' کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مالکِ مطبع نے یہ فیصلہ فرمایا کہ ''یکم اگست سے یہ اخبار ہفتے میں دو بار چھپ کر اجرا پذیر ہو''۔ چنانچہ اس تاریخ سے سہ شنبے کے علاوہ جمعے کے دن بھی اس کی اشاعت ہونے لگی۔ ۱۸۷۵ء میں ہر ہفتے میں اشاعت پذیر شماروں کی تعداد دو سے بڑھ کر تین ہوگئی۔[۲] اس کے باوجود قارئین کا یہ اصرار جاری رہا کہ ''اخبار روزانہ نکلا کرے تاکہ انھیں خبریں اور رپورٹیں پابندی اور باقاعدگی سے ملتی رہیں''۔ چنانچہ ۲۳؍مئی ۱۸۷۷ء کے شمارے میں یہ اعلان کیا گیا کہ اخبار یکم جون سے روز نکلا کرے گا۔[۳] اس طرح یہ اخبار جو ۱۸۵۹ء میں ایک ہفت روزہ کے طور پر جاری ہوا تھا، پے بہ پے ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنے اجرا کے انیسویں سال میں روزنامہ ہوگیا۔

جہاں تک اس اخبار کے حجم یا تعدادِ صفحات کا تعلق ہے، مختلف شماروں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں حسبِ موقع یا حسبِ ضرورت تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ۳۰؍جنوری ۱۸۶۶ء کے پرچے میں اس سلسلے میں یہ معلومات فراہم کی گئی ہے:

> ''یہ اخبار فضل الٰہی سے ۱۸۵۹ء سے جاری ہے۔ آگے کاغذ فرنچ کے آٹھ ورق پر طبع ہوتا تھا۔ اکتوبر ۱۸۶۵ء سے ولایتی تقطیع کلاں کے چودہ ورق یعنی اٹھائیس صفحات پر طبع ہوتا ہے۔''

۱۸۷۰ء کے جو شمارے ہماری نظر سے گزرے ہیں، ان کے صفحۂ اول کے اندراج کے مطابق اس وقت تعدادِ صفحات گھٹ کر اٹھائیس سے چوبیس رہ گئی تھی۔ ''اشتہار''

کے زیرِعنوان اس عبارت میں بتایا گیا ہے کہ:

''حجم کے معمولی چوبیس صفحے ہیں، ہفتہ وار منگل کے دن چھپ جاتا ہے، چہارشنبہ کو ملاحظۂ ناظرین میں آتا ہے۔''

معلوم یہ ہوتا ہے کہ وقفۂ اشاعت میں تخفیف کے ساتھ ساتھ اخبار کے صفحات میں بھی برابر کمی ہوتی رہی چنانچہ یکم جون ۱۸۷۷ء کو روزنامہ ہو جانے کے بعد اس کے صفحات کی تعداد صرف بارہ رہ گئی تھی۔ اس تبدیلی کے بعد اخبار کی ہیئتِ ظاہری کے بارے میں ڈاکٹر طاہر مسعود نے یہ اطّلاع فراہم کی ہے:

''یہ اردو کا پہلا روز نامہ تھا جو 33×36 سینٹی میٹر سائز کے بارہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اخبار تین کالمی تھا۔ روزنامے کے ساتھ ایک ہفتہ وار خاص ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا۔''[۴]

'اودھ اخبار' اپنے زمانے کے اردو اخبارات میں سب سے زیادہ مقبول تھا، اس کا اندازہ 'اودھ ریویو' کے مدیر منشی رام جی داس کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے:

''اس اخبار کو جاری ہونے پر پینتیس برس ہوئے اور جو ناموری اور شہرت اس نے حاصل کی یا جس عزت اور وقار کی نظر سے یہ دیکھا جاتا ہے، ویسا آج ہندوستان میں کوئی اور اخبار نہیں ہے۔ صوبۂ مغربی وشمالی اودھ میں صرف 'اودھ اخبار' ہی پہلا روزنامہ ہے اور اس کے خریدار اور سرپرست بڑے عالی وقار اور معزّز اشخاص ہیں۔''[۵]

اخبار کی یہ غیر معمولی مقبولیت بڑی حد تک منشی جی کی ذاتی دلچسپی، سوجھ بوجھ اور حسنِ انتظام کی رہینِ منت تھی۔ انھوں نے نہ صرف اندرونِ ملک، بلکہ باہر بھی تمام بڑے بڑے شہروں میں باقاعدہ نامہ نگار مقرر کر رکھے تھے، جو انھیں تازہ خبروں کے علاوہ تہذیبی اجتماعات کے کوائف اور ادبی جلسوں کی روداد سے بھی برابر مطلع کرتے رہتے تھے۔ اس اخبار کی ایک اور خوبی جو اسے دوسرے تمام اردو اخبارات سے ممتاز کرتی تھی، یہ تھی کہ یہ اپنے نامہ نگاروں اور قلمی معاونین کو معقول معاوضہ بھی ادا کرتا تھا۔

اخبار کا بنیادی مقصد خبر رسانی ہوتا ہے اور خبروں کو کسی خاص دائرے تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ حالاتِ حاضرہ سے متعلق اطلاعات اور تبصرے صحافت اور سیاست کے باہمی ربط کو ظاہر کرتے ہیں، اہم حادثات وواقعات کی تفصیلات اسے تاریخ کے ایک اہم ماخذ کا درجہ عطا کرتی ہیں اور لسانی وادبی معاملات ومسائل پر اظہارِ خیال ادب سے اس کا رشتہ استوار کرتا ہے۔ 'اودھ اخبار' نے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کر کے بلا شبہ ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے۔ چونکہ فی الوقت ہمیں اس کے ادبی پہلو سے سروکار ہے، اس لیے سطورِ ذیل میں صرف اسی حوالے سے گفتگو کر کے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اس اخبار کے صفحات میں ایسا مفید وکارآمد مواد خاصی مقدار میں محفوظ ہے، جس سے بعض لسانی مباحث کی تفہیم اور ادبی مسائل کے حل میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

لسانی مسائل کے ضمن میں ہندی واردو کا تنازعہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۸۳۵ء میں فارسی کی جگہ اردو کو دفتری زبان کا درجہ حاصل ہو جانے کے بعد بعض اردو مخالف تنظیمیں اس کی بیخ کنی اور اس منصب پر اس کی بجائے ہندی کے استحقاق کی حمایت میں پوری شدت کے ساتھ سرگرم ہوگئی تھیں۔ اس نزاع نے اپنے سیاسی پس منظر اور ایک خاص طبقے کے مفاداتِ مضمرہ کے باعث ایک ناخوش گوار اختلافی مسئلے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ 'اودھ اخبار' اس معاملے میں بڑی حد تک اعتدال کی راہ پر گامزن رہا، یعنی اس نے شعوری یا ارادی طور پر اپنی طرف سے اس بحث کو تازہ رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی، لیکن اگر اردو یا اس کے رسم الخط پر کوئی حملہ ہوا تو اس کی مدافعت میں کسی قسم کی کوتاہی بھی نہیں برتی۔ ۲؍فروری ۱۸۶۸ء کے پرچے میں کسی شخص کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں بہ غرضِ سہولت فارسی رسم الخط کی بجائے دیوناگری رسم الخط کی ترویج اور عربی الفاظ کی بجائے زیادہ سے زیادہ ہندی الفاظ کے استعمال کی وکالت کی گئی تھی۔ آزادیِ رائے کے بنیادی حق کا احترام کرتے ہوئے مضمون نگار کے حسبِ خواہش یہ مضمون تو اخبار میں چھاپ دیا گیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی مدیر نے اپنی رائے بھی واضح کر دی تھی، جو گارسین دی تاسی کی روایت کے مطابق حسب ذیل ہے:

''ہندی اردو کے جھگڑے اسی طرح لایعنی ہیں، جس طرح یہ خیال کہ ایک دن آئے گا جب کہ ہندی اردو کے قضیے کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ انگریزی زبان ان دونوں پر حاوی ہو جائے گی۔ اس لیے کہ وہ حکام وقت کی زبان ہے اور قدرتی طور پر رعایا اسی زبان کو اختیار کرے گی..... اردو زبان جس کی..... لوگ اس وقت کی مخالفت کر رہے ہیں..... مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلط ملط سے بالکل اسی طرح وجود میں آئی، جیسے انگلستان میں سیکسن اور فرانسیسی کا امتزاج عمل میں آیا۔ اردو میں دوسری زبانوں کے وہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو کھپ جائیں۔ ان الفاظ کے انتخاب میں خاص سلیقہ برتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کو عدالتوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور سرکاری تحریرات میں یہ زبان استعمال کی گئی۔ ان تمام باتوں کی تائید میں خود ہزار ہا ہندوؤں کی آرا پیش کی جا سکتی ہیں۔ بھلا یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ اردو کے عوض جو ایک نہایت شیریں اور شستہ زبان ہے، ہندی کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے جو ایک نہایت بھدّی اور درشت زبان ہے اور جس کے حروف دیکھنے میں بھلے نہیں معلوم ہوتے''۔[۶]

اس لسانی تنازعے کے سلسلے میں جب بھی اظہارِ خیال کی ضرورت پیش آئی، 'اودھ اخبار' نے اپنے اس موقف کی وضاحت میں عموماً کسی تامل یا پس وپیش سے کام نہیں لیا کہ اردو نے ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے ماحول میں پرورش پائی ہے اور ملک کے عدالتی ودفتری نظام میں اسے جو مقام حاصل ہوا ہے، وہ بجا طور پر اس کی مستحق ہے۔ ہندوستان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اسے اس کے موجودہ رسم الخط کے ساتھ اس کے اس منصب پر برقرار رکھا جائے۔ اس ضمن میں بعض ایسے مضامین بھی اس اخبار میں شائع ہوئے جن میں سرکار کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو اس جھگڑے کی بنیاد قرار دیا گیا تھا۔ گویا

یہ حکومتِ وقت کی ایک باضابطہ اور منظّم سازش تھی اس اتحاد و یک جہتی کے خلاف جس کے ایک مہتم بالشان ذریعۂ اظہار کے طور پر اردو وجود میں آئی تھی، چنانچہ ۱۲؍جولائی ۱۸۶۹ء کے شمارے میں شائع شدہ ایک مضمون کے حوالے سے ڈاکٹر اکبر حیدری نے اس موضوع سے متعلق مضمون نگار کی رائے کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اردو کے خلاف جو تحریک اٹھی ہے، اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، حکومت چاہتی ہے کہ ہندوستان کی مشترک زبان کو فنا کردے، تاکہ اہلِ ہند پھر کبھی ۱۸۵۷ء کی شورش کی طرح یک جہتی کے ساتھ کوئی کام نہ کرسکیں۔''[۷]

یہ اردو مخالف تحریک کتنی منصوبہ بند اور کس قدر دوررس اثرات کی حامل تھی، اس کا اندازہ ''اردو اور ہندی زبانوں کے بارے میں رائے'' کے زیرعنوان ۱۴؍دسمبر ۱۸۶۹ء کے شمارے میں شائع شدہ ایک مضمون کے اس اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

''جب کہ سررشتۂ تعلیم نے ہندوؤں کی ایک علیحدہ زبان کی تعلیم تسلیم کرلی ہے، تو گورنمنٹ کو بھی چاہیے کہ جس زبان کو لوگ آج کل کثرت سے بولتے ہیں، اگر اس کو مسلمانوں کے قلیل گروہ کی زبان پر ترجیح نہ دی جائے تو بہرحال اس کے برابر تو تسلیم کرنی چاہیے۔''

اگر 'اودھ اخبار' کے اس زمانے کے سارے شمارے دستیاب ہو جائیں اور ان میں شائع شدہ اس قسم کے تمام مضامین اور مراسلے یکجا کر لیے جائیں تو اس لسانی تنازعے کے سیاسی پس منظر اور فرقہ وارانہ خطوط پر اس کی پیش رفت کے کچھ ایسے شواہد بھی سامنے آسکتے ہیں، جن سے اہلِ علم اب تک بے خبر ہیں۔

'فسانۂ آزاد' کا شمار اردو نثر کے شاہکاروں میں کیا جاتا ہے۔ اس کے مصنّف پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۷۸ء میں بہ حیثیت ایڈیٹر روزنامہ 'اودھ اخبار' سے وابستہ ہوئے۔ اس سے قبل وہ ایک مضمون نگار اور مترجم کے طور پر متعارف ہو چکے تھے۔ 'اودھ اخبار' کی ایڈیٹری کے زمانے میں انھوں نے ۱۳؍اگست ۱۸۷۸ء سے ''ظرافت'' کے مستقل عنوان

کے تحت اس افسانے کی تحریر کا آغاز کیا۔ تقریباً ایک سال تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ بعدازاں یہ اخبار کے ضمیمے کے طور پر علیحدہ چھپنے لگا۔ ۸ ۱۸۸۰ء میں یہ افسانہ پہلی بار کتابی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ اس افسانے نے جہاں ایک طرف بہ حیثیت ادیب سرشارؔ کی شہرت کو پر پرواز عطا کیے، وہیں اس کی وجہ سے 'اودھ اخبار' کی مقبولیت میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ 'فسانۂ آزاد' کی اگلی قسط سے لطف اندوز ہونے کے لیے شائقین بے چینی کے ساتھ 'اودھ اخبار' کی تازہ اشاعت کے منتظر رہتے تھے۔ اس پس منظر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو ادب کو یہ شاہکار 'اودھ اخبار' کی بدولت حاصل ہوا۔ سرشارؔ کے باقی ناول بھی اسی اخبار کی وساطت سے قارئین تک پہنچے۔ یہ بلاشبہہ اس کی ادبی اہمیت کی ایک بڑی دلیل ہے۔

اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں میر انیسؔ کو جو مقام حاصل ہے، وہ آج اختلاف سے بالاتر تصور کیا جاتا ہے۔ 'اودھ اخبار' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں صورتِ حال اس سے یکسر مختلف تھی۔ اس زمانے میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں میدانوں میں مرزا دبیرؔ کی فوقیت مسلّم اور ان کی بالادستی اظہر من الشّمس تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انیسؔ کی بہ نسبت ان کی شاعری اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے لکھنؤ کے عام مزاجِ شعری سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔ دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سادہ مزاجی اور اخلاقِ کریمانہ کی بنا پر عوام و خواص دونوں ہی طبقوں میں نسبتاً زیادہ مقبول تھے۔ غالباً ان کی اسی مقبولیت کی بنا پر ان کی مجلسوں کی رودادیں اور ان سے متعلق خبریں اس اخبار میں زیادہ تفصیل کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں۔ بادی النظر میں اسے ایک قسم کی گروہی عصبیت یا جانب داری سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصل معاملہ رنگِ سخن کی مقبولیت کا تھا۔ مرزا صاحب کی ایک مجلس کی اس روداد سے جو ۱۷/اپریل ۱۸۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، کسی حد تک اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

> ''۲۵/ذی قعدہ روزِ پنجشنبہ کو وقت ۱۲/بجے دن کے معمولی ماہانہ مجلسِ عزا امام باڑہ میر باقر سوداگر مرحوم میں ہوئی۔ کثرتِ سامعین سے

امام باڑے میں جگہ باقی نہ تھی۔ اول چند رباعی اور ایک سلام تحتِ لفظ صاحب زادۂ جناب مرزا دبیر صاحب اوج تخلص نے اپنا کہا ہوا پڑھا۔ ابھی نوجوان ہیں مگر ماشاءاللہ خوب پڑھتے ہیں، کلام بھی صلِّ علیٰ۔ بعدۂ جناب مرزا صاحب ممدوح نے کہ لکھنؤ کیا، بلکہ ہند کے حضرتِ موصوف اور جناب میر انیس صاحب یہی دومہر و ماہ ہیں، ایک تازہ ناتمام مرثیہ پڑھا۔ عجب حالِ رقّتِ سامعین تھا اور ہر سو شورِ تحسین۔ اگر چہ کلامِ معجز نظام آپ کا ایک سے ایک اعلیٰ ہے مگر اس تازہ مرثیے میں وہ وہ نئے مضامینِ عالی موزوں فرمائے ہیں کہ آج تک اردو کیا، کلامِ فارسی میں بھی کسی نے نہیں سنے۔ سننے سے علاقہ رکھتا ہے، اس کی وصّافی میں زبان لال ہے، اعجاز کا حال ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ مومنین سنیں گے تو عشق عش کریں گے۔ خبر ہے کہ جنابِ متّصف الیہ آخرِ ماہِ ذی حجہ تک عازمِ عظیم آباد ہیں۔ یہ عشرہ وہاں ہوگا۔ زہے طالع و ہمتِ حضراتِ عظیم آباد جہاں ایسے افتخارِ ہند کرم فرمائیں اور وائے برحالِ لکھنؤ کہ یہاں کے شیعہ عین عاشورہ میں ان کے فیضِ خاص سے محروم رہ جائیں گے۔''

اس بیان سے بہ خوبی ظاہر ہے کہ اہلِ لکھنؤ کی نگاہ میں مرزا صاحب کا کیا مقام تھا اور وہ ان کی زبانی ان کا کلام سننے کے کس درجہ مشتاق و منتظر رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس تحریر میں جہاں مرزا صاحب اور میر انیس صاحب دونوں کا ذکر آیا ہے، وہاں صنعتِ لف و نشر مرتّب کے حوالے سے وہ بات بھی کہہ دی گئی ہے، جو دلوں سے تعلق رکھتی تھی اور جس کا براہِ راست اظہار تہذیب و شائستگی کے منافی تھا۔

اصل صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے اسی سال کی مجالسِ عزا کے سلسلے میں ۱۹/ جون ۱۸۶۶ء کے شمارے کا یہ اندراج بھی توجہ طلب ہے:

''شنبے کی صبح کو احمد علی خاں صاحب کی مجلسِ بستم معمولی بڑی شان

وشوکت سے ہوئی۔ فدا علی خاں صاحب کے یہاں بھی اسی روز خبر تھی کہ میر انیسؔ صاحب پڑھیں گے۔ اسی لیے شائقین صبح سے جمع ہو کر چشم براہ تھے۔ دوپہر کو خبر آئی کہ میر صاحب موصوف نہ آویں گے، اس وقت جو کوفت اور ملال حضارِ مجلس کو ہوا، وہ ان کا دل جانتا ہے اور جو ندامت سب سے صاحبِ خانہ کو ہوئی، وہ ان کے دل سے پوچھنی چاہیے۔ میر خورشید علی صاحب نے مرثیہ پڑھا، مگر مجلس نہیں جمی۔''

۱۷/اپریل کے شمارے میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ مرزا صاحب آخرِ ماہِ ذی الحجہ تک عظیم آباد تشریف لے جائیں گے۔ ۸/مئی مطابق ۲۲/ذی الحجہ یومِ سہ شنبہ کے اخبار میں یہ بتایا گیا کہ ''شامِ پنجشنبہ (۳/مئی) کو جناب مرزا صاحب، حسب الطلب ومعمول بہ خیر وعافیت تشریف فرمائے عظیم آباد ہوئے۔'' تقریباً سات ہفتے کے بعد جب مرزا صاحب اس سفر سے لکھنؤ واپس تشریف لائے تو ۲۶/جون کے پرچے میں ناظرین کو ان الفاظ میں یہ مژدہ سنایا گیا:

''ذاکرِ بے نظیر جناب مرزا صاحب جن کا تقویٰ اور فیاضی اور مرثیہ گوئی اور خلقِ محمدی ضرب المثل ہے، بہ خیریتِ تمام عظیم آباد سے اسی ہفتے میں داخلِ لکھنؤ ہوئے، مشتاقوں کے نصیب پھرے۔''

بہ ظاہر یہ ایک معمولی سی خبر ہے، لیکن اگر اسے صرف ایک ہفتے قبل کی اس خبر کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے، جس میں فدا علی خاں صاحب کے عزا خانے کی مجلس میں میر صاحب کے تشریف نہ لانے اور اس کے نتیجے میں حاضرین کی مایوسی اور صاحبِ خانہ کی ندامت کا تذکرہ کیا گیا تھا تو بین السطور بہت کچھ پڑھا جا سکتا ہے۔ عوامی سطح پر شخصیات کی پسندیدگی و ناپسندیدگی اور ادبی رجحانات کے مطالعے میں اس قسم کی معمولی باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

ممتاز علمی و ادبی شخصیتوں کی وفات پر تعزیتی شذرے لکھنا اخبارات و رسائل کا معمول رہا ہے۔ 'اودھ اخبار' بھی اس روایت پر بڑی باقاعدگی کے ساتھ کاربند رہا۔ اس

اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اگر وفات پانے والی شخصیت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوتی تو قریب ترین شمارے میں اس کے مختصر سوانحی خاکے کے ساتھ رسمی تعزیت نامے کی اشاعت کے بعد بھی قطعاتِ تاریخ اور تعزیتی نظموں کا سلسلہ ہفتوں اور مہینوں تک چلتا رہتا۔ اس قسم کی جتنی تحریریں ہماری نظر سے گزری ہیں، وہ بالعموم اس قدر جامع اور پراز معلومات ہیں کہ مرورِ ایام کے باوجود ان کی افادیت آج بھی برقرار ہے۔ مثلاً ۱۳؍دسمبر ۱۸۷۹ء کے شمارے میں شائع شدہ دو قطعاتِ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ہرگوپال تفتہؔ کی وفات دہلی میں تپ وبائی سے ہوئی تھی۔ ان دونوں قطعات کے متعلقہ اشعار حسب ذیل ہیں:

انتقال از تپِ وبائی کرد　　تفتہؔ شاگردِ حضرتِ غالبؔ

☆☆☆☆☆

ہاں مگر تفتہؔ مرد در دہلی　　مرد و زن اشک ریز می آیند

'اودھ اخبار' کا وہ شمارہ جس میں تفتہؔ کی وفات کی خبر شائع ہوئی ہوگی، ہمیں دستیاب نہیں ہوا، لیکن اندازہ یہ ہے کہ محمد علی خاں انجم مونگیری کو جن کے قطعات سے یہ اشعار ماخوذ ہیں، اس حادثے کی اطلاع اسی اخبار سے ملی ہوگی۔ مالک رام صاحب نے 'تلامذۂ غالب' کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں انجم کی اس روایت کو تو تسلیم کرلیا ہے کہ تفتہؔ نے تپ وبائی میں وفات پائی، لیکن وہ ان کے اس بیان سے متفق نہیں کہ ان کا انتقال دہلی میں ہوا، چنانچہ اپنی اس کتاب میں صفحہ ۱۱۶ کے حاشیے میں اس کی تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''وفات سکندر آباد میں ہوئی، جیسا کہ 'تواریخِ بلند شہر' میں ہے۔ انجم کو وفات کی خبر کسی نے دلّی سے دی ہوگی اور انھوں نے خیال کرلیا کہ وفات بھی دلّی ہی میں ہوئی۔''

'تلامذۂ غالب' کے دونوں ایڈیشنوں میں شامل 'کتابیات' کے مطابق 'تواریخِ بلند شہر' ۱۸۶۲ء میں یعنی تفتہؔ کی وفات (۲؍ستمبر ۱۸۷۹ء) سے سترہ برس قبل شائع ہوچکی تھی، اس لیے اس میں تفتہؔ کی وفات کے ذکر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مالک رام صاحب کو یقیناً

کچھ تسامح ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک انجم کا بیان زیادہ قرینِ صحت ہے۔ تفتہ کی طرح انجم بھی غالب کے شاگرد تھے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مرض الموت اور وفات کے سلسلے میں مالک رام صاحب کا بیان حسبِ ذیل ہے:

''بہ عمر ۶۳ برس اواخرِ ستمبر یا اوائلِ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا۔ ذیابیطس کا عارضہ ایک زمانے سے سوہانِ روح تھا، آخری وقت ہاتھ پر ایک کالا دانہ نکلا جو موت کا بہانہ بن گیا۔''۹

ان اطلاعات کا ماخذ دہلی کا ہفت روزہ 'اکمل الاخبار' مورخہ ۶/اکتوبر ۱۸۶۹ء ہے۔ مالک رام صاحب نے اس کا یہ بیان مولانا امداد صابری کی 'تاریخِ صحافتِ اردو' جلد دوم کے حوالے سے نقل فرمایا ہے، اس لیے اس میں کئی ایسے نقائص موجود ہیں جو ثانوی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس خبر کے سلسلے میں 'اودھ اخبار' کا ماخذ بھی یہی 'اکمل الاخبار' ہے، تاہم اس کا یہ اندراج اپنی بعض جزئیات کی بنا پر تاریخی اعتبار سے زیادہ جامع اور مفیدِ مطلب معلوم ہوتا ہے۔ یہ اخبار اپنے ۱۲/اکتوبر کے شمارے میں لکھتا ہے:

''۲۲/جمادی الآخر شبِ چار شنبہ کو عشا کے وقت نوابِ مستطاب حاجی محمد مصطفیٰ خاں بہادر، تعلقہ دارِ جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر..... نے تنگنائے دنیا سے رحلت فرمائی۔ بیس برس سے نواب صاحب ذیابیطس میں مبتلا تھے۔ پانچ برس سے اس مرض کی بدولت خون میں کچھ فساد پیدا ہوا۔ اس مدت میں بڑے بڑے موذی دنبل اور پھنسیاں نکلیں۔ ہمیشہ انگریزی علاج ہوتے رہے اور شافیِ مطلق شفا دیتا رہا۔ اب کی بار ایک پھنسی دائیں ہاتھ میں نکلی، ڈاکٹروں نے ایک مہینے میں ساتھ آٹھ شگاف دیے، زخم روز بہ روز بگڑتا گیا، آخر اسی مرض میں جان دی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہ رَاجِعُون. علی الصباح

موافقِ وصیت سلطان المشائخ کی درگاہ میں غیاث پور کے اندر
مدفون ہوئے۔''

ان تفصیلات کی روشنی میں جہاں یہ بات حتمی طور پر طے ہو جاتی ہے کہ شیفتہؔ نے ۲۲ر جمادی الاخریٰ ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۸ر ستمبر ۱۸۶۹ء کو عشا کے وقت وفات پائی، وہیں طویل سلسلۂ علالت اور تدفین سے متعلق وصیت کا بھی علم ہوتا ہے جو مالک رام صاحب کی فراہم کردہ معلومات پر اہم اضافہ ہے۔

جگراؤں ضلع جالندھر کے رئیس مولوی رجب علی خاں ارسطو جاہ جنھیں سرکارِ انگریزی میں بڑا رسوخ حاصل تھا، مرزا غالبؔ کے نہایت مخلص دوستوں اور مربّیوں میں سے تھے۔ جناب عبدالرؤف عروجؔ نے 'بزمِ غالب' میں ان کے حالات کافی تفصیل کے ساتھ سپردِ قلم کیے ہیں۔ اس تحریر میں انھوں نے مولوی صاحب کا سالِ ولادت ۱۸۰۶ء بتایا ہے اور ان کی وفات کے بارے میں مجملاً صرف یہ لکھا ہے کہ ''مقاماتِ مقدسہ کی زیارت..... سے واپس آنے کے چند سال بعد ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔[۱۰] مالک رام صاحب نے 'تذکرۂ ماہ وسال' میں سالِ ولادت ۱۸۰۶ء، مقامِ وفات جگراؤں اور تاریخِ وفات ۹ر ستمبر ۱۸۶۹ء مطابق ۲ر جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ تحریر فرمائی ہے۔[۱۱] 'اودھ اخبار' کے ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کے شمارے میں ان کی وفات پر جو مفصّل تعزیتی نوٹ شائع ہوا ہے، اس کے مطابق ان میں سے کوئی اطلاع پوری طرح درست نہیں۔ اس تحریر کی وساطت سے جو اہم اطلاعات حاصل ہوتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مولوی صاحب موصوف نے ''بتاریخ ۲۰ر جمادی الثانی ۱۲۸۶ء روزِ دوشنبہ بعارضۂ بخار اس سرائے ناپائیدار سے بمقامِ شملہ سمتِ بہشتِ عنبر سرشت انتقال فرمایا۔''

(۲) ''بروزِ جمعہ (۲۴ر جمادی الثانی) نعش (شملے سے جگراؤں) آئی..... (اور)..... قریب پانچ بجے شام کے..... والد ماجد مرحوم ومغفور کے مقبرے میں..... ان کے پہلو میں..... دفن ہوئے۔''

(۳) ''ماہِ رجب ۱۲۲۳ھ میں ولادت ہوئی اور ۶۳ برس کا سن ہوا۔''

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ مولوی رجب علی ماہِ رجب ۱۲۲۳ھ مطابق اگست، ستمبر ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۲۰ر جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۷ر ستمبر ۱۸۶۹ء کو شملے میں ان کی وفات ہوئی اور اس کے پانچویں دن یعنی یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء کو جگراؤں میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

اصغر علی خاں نسیم دہلوی مومن کے شاگرد اور مولانا حسرت موہانی کے دادا استاد تھے۔ 'تذکرۂ ماہ وسال' کے مطابق ان کی وفات ۱۴ر رمضان ۱۲۸۲ھ مطابق ۳۱ر جنوری ۱۸۶۶ء کو ہوئی تھی۔[۱۲] 'اودھ اخبار' مورخہ ۱۳ر فروری ۱۸۶۶ء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حادثہ دراصل ''۱۲ر رمضان المبارک کو قریب پہر دن باقی رہے'' پیش آیا تھا۔ اخبار کے حساب سے اس دن جنوری ۱۸۶۶ء کی تیسویں تاریخ تھی۔

مرزا عباس بیگ اکسٹرا اسٹنٹ کمشنر، لکھنؤ مرزا غالب کے حقیقی بھانجے تھے۔ ان کا تذکرہ 'بزمِ غالب' مولفہ عبدالرؤف عروج میں بھی موجود ہے، لیکن مفصّل حالات پہلی بار جناب کالی داس گپتا رضا نے تحریر فرمائے جو اولاً سہ ماہی 'غالب نامہ' نئی دہلی کی جلد اول کے تیسرے اور چوتھے مشترک شمارے میں 'مرزا عباس بیگ (خواہرزادۂ غالب)' کے زیر عنوان شائع ہوئے۔ یہی مضمون بعد میں ان کے دو مجموعوں 'متعلقاتِ غالب' (مطبوعہ ۱۹۷۸ء) اور 'غالب درونِ خانہ' (مطبوعہ ۱۹۸۹ء) میں شامل ہوا۔ اس مضمون میں مرزا صاحب کی ملازمت کے آخری ایّام اور سبک دوشی کا ذکر کرتے ہوئے رضا صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''مرزا ۱۲۸۴ھ یعنی ۱۸۶۷ء میں لکھنؤ میں اکسٹرا اسٹنٹ کمشنر تھے، مگر یہی سال ان کی ملازمت کا بھی آخری سال معلوم ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۶۷ء کے آخر میں پنشن پر ریٹائر ہو گئے۔''[۱۳]

وفات کے سلسلے میں رضا صاحب کا بیان ہے:

> ''مرزا نے تقریباً ۶۷ سال کی عمر پاکر یکشنبہ، جمادی الاول ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔''[۱۴]

حاشیے میں ڈاکٹر صفدر آہ کے مضمون 'غالب اور سیتا پور' کے حوالے سے اس اطلاع پر یہ اضافہ کیا گیا ہے:

''انتقال کے بعد حسبِ وصیت اپنے ہی تعمیر کردہ امام باڑہ لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔''

مرزا صاحب کی پنشن سے متعلق ایک تفصیلی رپورٹ 'اودھ اخبار' کے ۱۸ر ستمبر ۱۸۶۶ء کے پرچے میں موجود ہے۔ اس رپورٹ کے خاص خاص نکات حسب ذیل ہیں:

(۱) جولائی ۱۸۶۶ء سے قبل کسی وقت مرزا صاحب نے پنشن کے لیے باقاعدہ درخواست گورنر جنرل بہادر کشورِ ہند کی خدمت میں ارسال فرمائی۔

(۲) گورنر جنرل بہ اجلاسِ کونسل نے بہ مقامِ شملہ ۲۰ر جولائی ۱۸۶۶ء کو اس درخواست پر یہ حکم صادر فرمایا:

''(حسبِ) منظوری چیف کمشنر اودھ واسطے عطا ہونے پنشن خدمات مرزا عباس بیگ، اکسٹرا اسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کے بہ اجلاسِ کونسل تجویز ہوا کہ ایک پنشن تین سو روپے ماہواری کی کہ ادا خزانۂ سیتا پور سے ہوتی رہے، واسطے مرزا عباس بیگ کے منظور ہوئی۔''

(۳) حسب الحکم اس تجویز کی نقلیں تمام متعلقہ افراد اور محکموں کو بھیج دی گئیں۔ ضابطے کے مطابق چیف کمشنر اودھ، کرنل بیرو صاحب نے اس کی ایک نقل اپنی چٹھی نمبری ۱۸۲۱، مورخہ ۱۰ر ستمبر ۱۸۶۶ء کے ساتھ مرزا عباس بیگ کی خدمت میں ارسال کی اور اپنے مراسلے میں ان کی خدمات اور حسنِ کارکردگی کا اعتراف فرمایا۔

قوی امکان یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ہی پنشن کے لیے درخواست دی ہوگی۔ بہ صورتِ دیگر یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ ستمبر ۱۸۶۶ء کے بعد اپنے عہدے پر برقرار نہ رہے ہوں گے۔ اس طرح رضؔا صاحب کے اس قیاس کی تردید ہو جاتی ہے کہ ''مرزا ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں لکھنؤ میں اکسٹرا اسٹنٹ کمشنر تھے اور یہی ان کی ملازمت کا آخری سال معلوم ہوتا ہے۔''

واقعۂ وفات کے بیان میں رضؔا صاحب سے یہ سہو ہوا ہے کہ انھوں نے دن اور مہینے کا تو حوالہ دیا ہے، لیکن تاریخ کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ قدؔر بلگرامی کے قطعۂ تاریخ میں جو اس سلسلے میں ان کا ماخذ ہے، پہلے ہی مصرعے (ماہ جمادی الاولیٰ یکشنبہ ودہم) میں مہینے، دن اور تاریخ تینوں کا ذکر موجود ہے۔ مالک رام صاحب نے 'تذکرۂ ماہ وسال' میں وقتِ وفات ''شبِ یکشنبہ'' اور تاریخِ وفات ''۱۰؍جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ'' بتائی ہے، لیکن اپنے معمول کے برخلاف مقامِ وفات کا تعین نہیں فرمایا اور ہجری تاریخ کی مطابقت ۲؍مئی ۱۸۷۹ء سے فرمائی ہے جو از روے واقعہ درست نہیں۔ 'اودھ اخبار' مورخہ ۵؍مئی ۱۸۷۹ء کے حوالے سے اس حادثے کی پوری تفصیل حسب ذیل ہے:

> ''نہایت افسوس سے لکھا جاتا ہے کہ مرزا عباس بیگ صاحب سابق اکسٹرا اسٹنٹ کمشنر اودھ وحال پنشن یافتہ نے سہ ماہ حال کو بہ وقتِ شب انتقال فرمایا۔ ۴؍ماہِ حال کو دفن ہوئے۔ جنازے کے ہمراہ روسائے شہر وغیرہ کا کثیر مجمع تھا، جو مرزا صاحب کے اخلاق اور نیکیوں کو یاد کر کے افسوس کرتے جاتے تھے۔ مرزا صاحب مغفور کی طبیعت کئی دنوں سے علیل تھی اور سنا گیا کہ سینے میں درد اٹھا۔ گو علاج کیا گیا، مگر صحت نہ ہوئی۔ مرزا صاحب بڑے مخیّر اور رحم دل تھے اور غریب وغربا کو آپ کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچتا تھا۔ خدا ان کے اعزّہ اور اقربا کو صبر عطا کرے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہ رَاجِعُون۔''

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جس وقت مرزا صاحب کا انتقال ہوا ہے، تقویمِ عیسوی کے مطابق مئی کی تیسری تاریخ اور سنیچر کا دن تھا، لیکن قمری حساب سے اتوار کی رات اور جمادی الاولیٰ کی دسویں تاریخ شروع ہوگئی تھی۔

'اودھ اخبار' میں ملکی وغیر ملکی خبروں، سرکاری وغیر سرکاری اعلانات اور اخباروں اور کتابوں کے اشتہارات کے علاوہ مشاہیر شعروادب کی تازہ تخلیقات بھی برابر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں غزلیں، قصیدے، قطعاتِ تاریخ، مضامین اور خطوط ہر قسم کی تحریریں

شامل ہوتی تھیں۔اس اہتمام کے نتیجے میں جہاں بعض ایسے شعرا کے نتائجِ افکار تک رسائی ممکن ہوگئی ہے جن کا کلام تقریباً نایاب ہے، وہیں بعض ایسی نثری تحریریں بھی دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچ گئی ہیں، جن کا ضیاع بہرحال ایک متاعِ عزیز کا ضیاع ہوتا۔مثلاً یہ سبھی جانتے ہیں کہ مرزا ہرگوپال تفتہ صرف فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔اردو میں شعر گوئی سے انھیں مطلق دلچسپی نہ تھی، چنانچہ اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو میں ان کا کل فکری سرمایہ دو اشعار کے ایک قطعۂ تاریخ پر مشتمل ہے، جو انھوں نے اپنے استاد مرزا غالبؔ کی وفات پر کہا تھا۔ یہ قطعہ ان کے سات فارسی قطعات کے ساتھ ۱۹/اکتوبر ۱۸۶۹ء کے 'اودھ اخبار' میں شائع ہوا تھا۔ مدیر اخبار کی تحریر کے مطابق ''قطعاتِ ہٰذا سابق ازیں اخباراتِ دیگر میں درج ہو چکے'' تھے اور ''بہ پاسِ ارشادِ جنابِ موصوف (تفتہ) بہ طرزِ قندِ مکرر'' اودھ اخبار میں چھاپے گئے تھے۔اس کے باوجود انھیں محفوظ رکھنے اور عصرِ حاضر کے اربابِ علم تک پہنچانے کے لحاظ سے اس اخبار کی اہمیت کا اعتراف ناگزیر ہے۔اردو قطعہ حسب ذیل ہے:

غالبؔ وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزاروں ہیچمداں نامور ہوئے
عقل و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ بھی غالبؔ کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا کلام تقریباً نایاب ہے۔'اودھ اخبار' کے ۱۲/فروری ۱۸۶۲ء کے شمارے میں ان کا ایک طویل اردو قطعہ شائع ہوا تھا، جس پر یہ عنوان قائم کیا گیا تھا:

''قطعہ ہیضے کے بیان میں طبع زادِ افصح الفصحا، سراج الشعرا مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ تلمیذِ پرتمیز نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالبؔ''

ٹھیک ڈیڑھ سال کے بعد ۱۲/اگست ۱۸۶۳ء کے پرچے میں ''قطعۂ وبائیہ'' کے

عنوان سے یہی قطعہ دوبارہ شائع ہوا۔اس بار اس کا ذیلی عنوان حسبِ ذیل تھا:

''طبع زادِ سراج الشعرا مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ تخلص، شاگردِ نجم الدولہ اسداللہ خاں غالبؔ دہلوی۔ بذریعہ نامۂ مشفقی مولوی محمد حسین خاں مہتمم مطبعِ مصطفائی واقع دہلی بہ غرضِ انطباع پہنچا۔ تفریحاً درج ہے۔''

آخری چار شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعہ انھی محمد حسین خاں مہتمم مطبعِ مصطفائی کی فرمائش پر کہا گیا تھا۔قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس اخبار کے علاوہ دہلی کے ایک دو اخبارات میں بھی شائع ہوا ہوگا،لیکن اتفاق یہ ہے کہ اسے محفوظ رکھنے کا سہرا بھی 'اودھ اخبار' ہی کے سر ہے، چنانچہ اسی اخبار کی اشاعت اول کے حوالے سے پہلے تو جناب خیر بہوروی نے اسے ماہ نامہ 'فروغِ اردو' لکھنؤ کے فروری ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع شدہ اپنے مضمون 'مرزا غالبؔ کا ایک محبوب شاگرد' میں نقل کر کے عام کیا۔ بعدازاں ڈاکٹر اکبر حیدری نے اشاعت ثانی سے استفادے کے بعد اسے اپنے مضمون 'مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ شاگردِ غالبؔ کا نایاب کلام' میں شامل فرما کر متاعِ گم گشتہ کے خریداروں تک پہنچایا۔ حیدری صاحب کا یہ مضمون ماہ نامہ 'شاعر' بمبئی کے فروری ۱۹۷۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس دوسری اشاعت میں اس قطعے کے اشعار کی مجموعی تعداد ۴۳ ہے، جب کہ پہلی اشاعت میں کل اکتالیس شعر شامل تھے۔معلوم ہوتا ہے کہ خیر صاحب کے مضمون میں دو شعر بر بنائے سہو یا کسی اور وجہ سے نقل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

غالبؔ کے مکتوب الیہم میں محمود مرزا (ڈپٹی مرزا محمود بیگ) کا نام بھی شامل ہے۔ یہ مرزا صاحب کے حقیقی بھانجے مرزا عاشور بیگ کے صاحبزادے تھے۔ان کے نام کے خط مورخہ ۱۲ر مئی ۱۸۶۳ء کے آخر میں غالبؔ نے ان سے خداداد اور رفیع الدین کی خیریت نہ لکھنے کا شکوہ کیا ہے۔ یہ دونوں محمود مرزا کے سگے بھائی تھے۔خداداد کا پورا نام مرزا خداداد بیگ اور رفیع الدین کا مرزا رفیع الدین بیگ تھا۔ یہ بات عام طور پر معلوم نہیں کہ خداداد بیگ شعر بھی کہتے تھے اور مرزا تخلص کرتے تھے۔ہمیں 'اودھ اخبار' کے ۲۹ر نومبر

۱۸۷۹ء اور ۱۳؍دسمبر ۱۸۷۹ء کے شماروں میں ان کی دو غزلیں دستیاب ہوئی ہیں، پہلی غزل کے سرعنوان یہ عبارت درج ہے:

''غزل چیکدۂ قلم معجز رقمِ سخنورِ نازک خیال وشیریں مقال، معدنِ طبعِ وقّاد، مرزا خداداد بیگ صاحب تحصیل دارِ امیٹھی ونبیرۂ حضرت مرزا نوشہ غالبؔ مرحوم۔''

دوسری غزل کا عنوان نسبتاً اختصار کے ساتھ حسبِ ذیل ہے:

''غزل ریختۂ خامۂ جادو نگارِ مرزا خداداد بیگ صاحب تحصیل دار۔''

یہ دونوں غزلیں تیرہ تیرہ اشعار پر مشتمل ہیں۔ بہ طورِ نمونہ ان کے مطلع اور مقطعے سطورِ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

دل دادۂ ہر چیز ہیں، عاشق ہیں وہ سب کے — خود رفتۂ نظارہ جو ہیں جلوۂ رب کے

کیوں کر نہ ہو اس آفتِ دوراں کو محبت — ہم عاشقِ جاں باز ہیں مرزاؔ نئے ڈھب کے

مشک ہے گیسو سے تیرے برسرِ بازار زار — تیری زلفِ عنبریں سے دامنِ تاتار تار

دل ہے خود آتش کا پرکالا اور اس پر سوزِ غم — خوب ہے تشبیہ کامل میرزاؔ فی النار نار

معروف وغیر معروف شعرا کے کلام کے ایسے ہی بے شمار نمونوں میں جو اودھ اخبارؔ کے اوراق میں محفوظ ہیں، وہ قطعاتِ تاریخ بھی شامل ہیں، جن سے ۱۸۵۷ء کے بعد کے متعدد اہم واقعات وحادثات کا زمانہ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی جن کا شمار فنِ تاریخ گوئی کے اساتذہ میں ہوتا ہے، برسوں مطبعِ اودھ اخبار سے وابستہ رہے۔ ۹؍جنوری ۱۸۷۲ء کے شمارے میں شائع شدہ ''اسمائے حضراتِ خیر خواہانِ مطبع'' کے ذیل میں انھیں ''شعر وسخن میں نازک خیال، صاحب تصنیفاتِ بسیط اور موجدِ اختراعاتِ عجیب وغریب'' قرار دیا گیا ہے۔ بعد ازاں ۲۰؍فروری ۱۸۷۲ء کے شمارے میں ''کمالِ فن'' کے زیرِ عنوان ان کے بارے میں یہ اطلاع فراہم کی گئی ہے:

''منشی محمد انوار حسین تسلیم نے ایک قطعہ ملکۂ معظّمہ کی مدح میں لکھا ہے کہ چار مصرعوں سے تین کروڑ نوے لاکھ، اکاسی ہزار، تین سو بارہ

تاریخیں نکلتی ہیں۔ صاحب مطبع یعنی جناب منشی نول کشور صاحب بہادر نے عمدہ شان پر مطلاّ کرا کر ولایت کو بھیجا۔ اپنے متوسل کا رتبہ بڑھایا۔ اللہ تعالیٰ ایسے فیاض وقدرداں کو تا قیامت سلامت رکھے۔ آمین۔''

'اودھ اخبار' میں تسلیم کی اس قسم کی صنّاعیوں کے متعدد نمونے موجود ہیں، چنانچہ اپنی ایک تحریر میں انھوں نے بجا طور پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ ''اس اخبار نے بندے کو مشہور نزدیک ودور کیا ہے۔ میرا بڑا محسن ہے۔''[۱۵] یہ معاملہ صرف تسلیم کی ذات تک محدود نہیں، اس زمانے کے بہت سے شاعر اور ادیب اس اخبار سے فیضیاب ہونے والوں میں شامل ہیں۔

مختلف النوع منظومات کے علاوہ اس اخبار میں عام دلچسپی کے مضامین، تذکرے، تبصرے اور خطوط بھی برابر شائع ہوتے رہتے تھے۔ اس قسم کی تحریروں کی بہ افراط اشاعت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف ۱۸۶۲ء میں اخبار کے مستقل مضمون نگاروں میں سے ایک مضمون نگار مردان علی خاں رعنا مرادآبادی، شاگردِ غالب کے ۴۷ مضامین اور مضمون نما مراسلے اس کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ جناب امیر حسن نورانی نے ان مضامین کے عنوانات اپنے ایک مقالے میں نقل فرما دیے ہیں۔[۱۶] ان میں سے ایک مضمون 'خیالِ خیر مآلِ رعنا بہ تبعیتِ مضمونِ مرشدنا غالب' جیسا کہ اس عنوان سے ظاہر ہے، مرزا غالب کی تائید میں لکھا گیا تھا۔ غالب کا یہ مضمون جس کا عنوان 'ہندوستان کی سمجھ' تھا، ۲۳/اپریل ۱۸۶۲ء کے پرچے میں 'آفتابِ عالم تاب' کے حوالے سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے ہندوستان پر حملے کے لیے ایرانی فوجوں کی تیاری سے متعلق افواہوں کی تردید اور انگریزوں کے حسنِ انتظام کی تعریف کی تھی۔ یہ غالب کی واحد دستیاب تحریر ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً سیاسی موضوعات اور حالاتِ حاضرہ پر بھی اخبارات کے ذریعے اظہارِ خیال کرتے رہتے تھے۔ ان کا ایک اور مضمون اسی سال کے ۲۴/ستمبر کے شمارے میں شامل تھا۔ اس میں ایک شیر کے زندہ گرفتار

کرنے پر مردان علی خاں رعنا کی شجاعت کی تعریف کی گئی تھی۔ مرزا صاحب کا واحد اردو خط بنام منشی نول کشور بھی اسی اخبار کے ۲۵/مارچ ۱۸۶۳ء کے شمارے سے ماخوذ ہے۔ علاوہ بریں 'برہانِ قاطع' اور 'قاطعِ برہان' کے قضیے سے متعلق بعض اہم تحریریں بھی 'اودھ اخبار' ہی کے ذریعے منظرِ عام پر آئی ہیں۔

غالب کے بعد سرسید دوسرے اہم نثر نگار ہیں، جن کا ذکر 'اودھ اخبار' میں بار بار آیا ہے۔ سرسید خود بھی اس اخبار کے مداحوں میں شامل تھے، چنانچہ 'تہذیب الاخلاق' کے یکم جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ (۱۸/اگست ۱۸۷۱ء) کے شمارے میں انھوں نے اس کے بارے میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کیے تھے:

> ''اودھ اخبار پہلے سے بھی نہایت باوقعت اخبار تھا اور اب تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ ہم کو یہ بھی امید ہے کہ ہمارے ہم عصر وقائع نگار بھی اودھ اخبار کی تقلید کریں گے اور منشی نول کشور سلمہ اللہ تعالیٰ کی عالی ہمتی سے یہ امید ہے کہ ان کا اخبار مثل بڑے بڑے باوقعت انگریزی اخبارات کے روزانہ جاری ہوا کرے گا۔''[۱۷]

یہاں بہ نظرِ اختصار سرسید کی صرف ایک تحریر کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جو ۱۶/فروری ۱۸۷۲ء کے اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ایک خط ہے جو غلام محمد خاں تپش دہلوی مدیرِ اخبار کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ آیا ''نکتہ کی بات'' کا محاورہ صحیح ہے یا غیر صحیح؟ کیونکہ ''ایک صاحب'' اس پر مصر تھے کہ یہ صریحاً غلط ہے، اگرچہ مدیرِ اخبار کے بقول اس معاملے میں ''لکھنؤ کے اہلِ زبان سب'' ان کے ''موید'' تھے اور ''دہلی کے اکثر نامی گرامی زباں آور عالموں کے چند خط بھی'' اس تائید میں آئے تھے کہ ''یہ محاورہ صحیح ہے۔'' تاہم انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ سرسیّد جیسے ''مسلم الثبوت، عالم، فاضل، محقق، اہلِ زبان'' سے بھی اس بارے میں استفسار کر لیا جائے، چنانچہ ۲۴/جنوری ۱۸۷۲ء کو اس سلسلے میں انھیں خط لکھا گیا۔ موصوف نے اس کا جو ''جوابِ باصواب'' تحریر فرمایا وہ حسبِ ذیل ہے:

''مخدومِ بندہ منشی غلام محمد خاں صاحب سلامت۔

آپ کا عنایت نامہ پہنچا، ممنونِ یادآوری کیا۔ جب کہ آپ خود اہلِ زبان ہیں، جو آپ کے قلم وزبان سے نکلے، وہی سند ومحاورہ ہے۔ بہارِ عجم کی سند کی نہ احتیاج ہے اور نہ کسی قاعدے کی دلیل ضروری ہے۔ صرف اتنا کافی ہے کہ اہلِ زبان بولتے ہیں یا نہیں اور جب کہ خود آپ اہلِ زبان ہیں تو آپ ہی اپنی سند ہیں۔ نکتہ وبات کو ہر جگہ ملا دینا البتہ صحیح نہ ہوگا، الّا بعض موقعوں پر جو بے ساختہ اہلِ زبان کی زبان سے نکلا کرتے ہیں، صحیح ہے۔ پس جس عبارت میں کہ آپ نے ان کو ملایا ہے، میری دانست میں صحیح وبا محاورہ ہے۔ کچھ غلطی ان میں نہیں۔ باقی رہا اس کی وجوہات، اس کا لکھنا بے فائدہ ہے۔

خاکسار سید احمد خاں از بنارس

مورخہ ۳۱/جنوری ۱۸۷۲ء''

یہاں 'اودھ اخبار' میں شائع شدہ تحریروں کی باز آفرینی یا ان کی فہرست سازی مقصود نہیں، صرف ان کی طرف اشارہ کرنا اور اس حوالے سے اس اخبار کی علمی وادبی اہمیت واضح کرنا مقصود ہے، اس لیے اس گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے صرف دو تحریروں کا اور ذکر کیا جاتا ہے، جو بالترتیب ۳۰/جنوری ۱۸۶۶ء اور ۲۵/اکتوبر ۱۸۷۰ء کے شماروں میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ دونوں بھی خطوط ہیں جو منشی نول کشور کے نام لکھے گئے تھے۔ پہلا خط دہلی سوسائٹی کے سکریٹری رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوبؔ دہلوی کا ہے، جس کے ذریعے منشی جی کو سوسائٹی کا رکن منتخب کیے جانے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں ملکی سطح پر علمی، تہذیبی اور معاشرتی حلقوں میں ان کی خدمات کی کیا اہمیت تھی۔ یہ خط اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس سے دہلی سوسائٹی کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی فراہم کردہ معلومات پر اضافہ ہوتا ہے۔[۱۸] خط حسبِ ذیل ہے:

''مکرمِ بندہ منشی نول کشور صاحب۔ سلامت

بعد سلام و نیاز کے عرض ہے کہ اس سے پہلے کئی اشتہار دہلی سوسائٹی کے آپ کی خدمت میں ارسال کیے گئے تھے۔ یقین ہے کہ پہنچے ہوں گے۔ چونکہ آپ نے ہندوستان میں علم کی ترویج میں بہت کوشش کی ہے، اس واسطے سوسائٹی نے جلسۂ عام واقعہ ۱۲/دسمبر ۱۸۶۵ء میں آپ کو ممبر سوسائٹی انتخاب کیا۔ لہٰذا آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ آپ موافق قاعدۂ سوسائٹی کے تین روپیہ بابت چندہ ششماہی عنایت کریں۔ سوسائٹی کو امیدِ قوی ہے کہ آپ ہر طرح سے اس کے ساعی رہیں گے اور ان تدابیر کے بتانے میں جن سے ہندوستان میں علم کی ترقی ہو، دریغ نہ فرمائیں گے۔ مکرر یہ کہ سوسائٹی سے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے، اگر کچھ کتابوں سے مدد کریں تو بڑی عنایت ہو۔

رقیمہ خاکسار پیارے لال
سکریٹری دہلی سوسائٹی''

'دوسرا خط ہندی' اردو قضیے کی ایک اہم شخصیت اور موجودہ ہندی نثر کے بانی بھارتیندو ہریش چندر کا ہے۔ یہ خط اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ انھوں نے اردو سے اپنا رشتہ توڑ کر اس کے خلاف محاذ آرائی شروع نہیں کی تھی۔ اس خط میں بھارتیندو نے مہاراجہ مان سنگھ صدرِ انجمن تعلقہ دارانِ اودھ کی وفات پر ان کی کسی یادگار کے قیام کے لیے اپنے تعاون کی پیشکش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''منشی صاحب مظہرِ لطف و کرم منشی نول کشور صاحب زادلطفہٗ

بعد نیاز مندی ہائے فراوان و سلام واضحِ رائے شریف باد۔ جنابِ من!
بہ استماعِ خبرِ وفاتِ جناب مہاراجہ سرمان سنگھ بہادر ازبس ملال و رنج ہوا۔ نیاز مند کو اگرچہ جناب مہاراجہ صاحب کی خدمت میں کچھ تعلق نہ تھا، لیکن مہاراجہ صاحب کے اوصافِ حمیدہ ایسے عمدہ اور موجب ترقی

اور بہبودِ خلائق کے تھے کہ جس کا ایک عالم مدّاح ہے، اگر مہاراجہ صاحب کی یادگاری کے لیے کوئی کام کیا جائے اور اس کے لیے چندہ جمع کیا جائے تو آپ بندہ کی جانب سے مبلغ پچاس روپیہ فرد چندہ میں لکھا دیجیے اور نیاز مند کو مطلع فرمایئے۔ بفور پہنچنے سامی نامہ مشعرِ امورِ متذکرہ روپیہ ارسالِ خدمتِ سامی درجت کیا جاوے گا۔ فقط زیادہ نیاز۔

نیاز مند ہریش چندر ۱۵/ اکتوبر ۱۸۷۰ء''

'اودھ اخبار' کی ادبی قدر و قیمت کا یہ جائزہ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۹ء تک یعنی صرف اٹھارہ سال کے درمیان شائع شدہ چند منتشر شماروں کے مطالعے پر مبنی ہے۔ اس اعتبار سے اس کی حیثیت صحیح معنی میں 'مشتے نمونہ از خروارے' سے زیادہ نہیں، تاہم اس کی بنیاد پر پورے اطمینان کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس اخبار کے مکمل فائل دستیاب ہو جائیں تو ان کی مدد سے ہماری ادبی تاریخ کے بہت سے گوشے مزید روشن ہو سکتے ہیں۔ بہ ظاہر اس کوشش میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن امکانات کی دنیا بہت وسیع ہے، اس لیے اس سے صرفِ نظر بھی مناسب نہیں۔

حواشی

۱۔ ہندوستانی پریس، از نادر علی خاں، یوپی اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص ۳۲۵
۲۔ اردو صحافت انیسویں صدی میں، از ڈاکٹر طاہر مسعود، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۴۷۸
۳۔ ایضاً اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص ۹۹۶
۴۔ ایضاً اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص ۹۹۷
۵۔ ماہ نامہ 'نیا دور' لکھنؤ، نول کشور نمبر، شمارہ نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء، ص ۱۸۸
۶۔ خطباتِ گارسین دی تاسی بہ حوالہ ماہ نامہ 'نیا دور'، شمارہ مذکور الصّدر، ص ص ۲۶ و ۲۷
۷۔ ماہ نامہ 'نیا دور'، شمارہ مذکور الصّدر، ص ۲۷
۸۔ اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص ص ۱۰۱۱ و ۱۰۱۲
۹۔ تلامذۂ غالب، طبعِ ثانی، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۳۶
۱۰۔ بزمِ غالب، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ص ۱۶۱ تا ۱۶۳
۱۱۔ تذکرۂ ماہ و سال، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۶۳
۱۲۔ ایضاً، تذکرۂ ماہ و سال ص ۳۸۷
۱۳۔ متعلقاتِ غالب، وِل پبلکیشنز، بمبئی، ۱۹۷۸ء، ص ۶۶ و غالب۔ درونِ خانہ، ساکار پبلشرز، بمبئی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۵
۱۴۔ ایضاً، متعلقاتِ غالب، ص ۶۹ و غالب۔ درونِ خانہ، ص ۱۳۸
۱۵۔ ہفت روزہ 'نیرِ اعظم'، مراد آباد، مورخہ ۷/نومبر ۱۸۸۱ء
۱۶۔ شش ماہی 'غالب نامہ'، دہلی، شمارہ جنوری ۱۹۸۱ء
۱۷۔ ماہ نامہ 'نیا دور'، نول کشور نمبر، ص ۴۴

۱۸؎ احوالِ غالب، طبعِ ثانی، انجمن ترقیِ اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، مقالہ بہ عنوان 'دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب'

(نول کشور اور ان کا عہد، مرتبہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی و پروفیسر وہاج الدین علوی، شائع کردہ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء)

مولانا محمد علی جوہرؔ کے خاندان کا رام پور سے تعلق

(دو اہم شہادتیں)

مولانا محمد علی جوہرؔ صدی کے آغاز کے ساتھ مولانا کے آبائی وطن اور جاے پیدائش کے سلسلے میں جو بحث اٹھ کھڑی ہوئی ہے، وہ زعماے ملک وقوم اور اساطینِ شعروادب کے مستند سوانحِ حیات کی ترتیب واشاعت سے ہماری بے اعتنائی پر تازیانۂ عبرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ گذشتہ ایک سال میں اس موضوع پر کئی حضرات اظہارِ خیال کر چکے ہیں، لیکن ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے محمد علی نمبر میں شبیر علی خاں شکیبؔ کا مضمون 'محمد علی کا وطن' اور ماہ نامہ 'نگار' دہلی کے نومبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں جناب رئیس منظر کا مضمون 'حکومتِ ہند نے مولانا محمد علی جوہرؔ کا وطن بدل دیا'، جس محنت اور سلیقے سے لکھے گئے ہیں، وہ قابلِ داد ہے۔ ان تحریروں سے زیر بحث مسئلے کے تمام پہلو واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔ مولانا محمد علی خود اپنی تحریروں میں ایک سے زائد مقامات پر بالاعلان یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ وہ رام پور میں پیدا ہوئے۔ اس امرِ واقعہ کو نہ تو محکمۂ ڈاک وتار کا شائع کردہ بروشر ہی بدل سکتا ہے اور نہ کسی یادگاری کمیٹی کے صدر یا سکریٹری کی تحریر اسے کالعدم کر سکتی ہے۔ مولانا کے اس بیان کو اس وقت تک سند کی حیثیت حاصل رہے گی جب تک دوسرے زیادہ مستند ومعتبر ذرائع سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے

کہ انھوں نے اس معاملے میں کسی خاص مصلحت کے تحت دانستہ طور پر اخفائے حال یا غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اس کے بعد ہی نجیب آباد یا مراد آباد میں تولّد سے متعلق کسی روایت پر غور کیا جا سکتا ہے۔

شکیبؔ صاحب اور رئیس منظرؔ صاحب نے اپنے مضامین میں بجا طور پر یہ رائے قائم کی ہے کہ نجیب آباد میں مولانا کی ولادت سے متعلق غلط فہمی دراصل رئیس احمد جعفری کی تصنیف 'سیرتِ محمد علی' پر انحصار و اعتبار کا نتیجہ ہے، جس میں مولانا کے والد عبدالعلی خاں مرحوم کی نسبت یہ غلط اطلاع فراہم کی گئی ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹوں کے ساتھ نجیب آباد سے رام پور آئے تھے۔ ان دونوں حضرات نے مولانا کے برادرِ عم زاد حافظ احمد علی خاں شوقؔ رام پوری کی تصنیف 'تذکرۂ کاملانِ رام پور' کے حوالے سے اس امر کے کافی ثبوت بہم پہنچا دیے ہیں کہ دراصل مولانا کے دادا علی بخش خاں نجیب آباد سے ترکِ سکونت کے بعد تقریباً ایک سال لکھنؤ میں گزار کر ۱۸۴۲ء میں نواب محمد سعید خاں کے حسب الطلب رام پور چلے آئے تھے۔ عبدالعلی خاں جو اپنے پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، اپنے والد کے رام پور آنے کے چھے سال بعد ۱۸۴۸ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ علی بخش خاں کے رام پور سے توسّل کا دوسرا ثبوت جناب رئیس منظر نے مولانا محمد علی جوہرؔ کی والدہ کی ایک تحریر سے فراہم کیا ہے جو 'انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام' کے شائع کردہ کتابچے 'شوکت علی، محمد علی کی نظر بندی' میں شامل ہے۔ یہ کتابچہ مارچ ۱۹۱۸ء میں اور 'تذکرۂ کاملانِ رام پور' مارچ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا۔ علی بخش خاں اس سے بہت پہلے ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۹۷ء میں وفات پا چکے تھے۔ وقت کے اس قابلِ لحاظ تفاوت کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نزاع کے تصفیے کے لیے قدیم تر مآخذ کی طرف بھی رجوع کیا جائے۔ اسی خیال کے تحت سطورِ ذیل میں دو ایسی شہادتیں پیش کی جا رہی ہیں جو علی بخش خاں کے ہم عصر اور ان کے خاندان سے غیر متعلق افراد کے بیانات پر مشتمل ہیں۔

علی بخش خاں کے رام پور سے توسّل کے پہلے شاہد مرزا غالبؔ ہیں۔ ریاست رام پور سے مرزا صاحب کا باقاعدہ تعلق اگرچہ مولانا فضل حق خیر آبادی کی تحریک و توسّط سے

فروری ۱۸۵۷ء میں قائم ہوا [۱]، لیکن وہ اس توسّل کے لیے نواب یوسف علی خاں کی مسندنشینی (اپریل ۱۸۵۵ء) کے بعد سے مسلسل سرگرمِ عمل تھے۔ مولانا عرشی کے قیاس کے مطابق اس سلسلے میں انھوں نے علی بخش خاں کے اثر ورسوخ سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ۶/فروری ۱۸۵۶ء کو خان صاحب موصوف کی معرفت سرکاری کتب خانے کے لیے 'مہرِ نیم روز' کی خریداری بہ گمانِ غالب اسی حکمتِ عملی کا ایک حصّہ تھی۔ اپنی ان کوششوں میں کامیابی کے بعد غالبؔ نے نواب یوسف علی خاں کے حسب خواہش ۱۸۶۰ء کے اوائل میں پہلی مرتبہ رام پور کا سفر کیا اور ۲۷/جنوری سے ۱۷/مارچ تک وہاں مقیم رہے۔ اس قیام کے دوران انھیں علی بخش خاں سے جو بہ حیثیت خان ساماں ملازمینِ خاص کے زمرے میں شامل تھے، قریب تر آنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ چنانچہ ۲۲/جولائی ۱۸۶۱ء کو نواب یوسف علی خاں کے نام لکھے ہوئے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کچھ پہلے انھوں نے خان صاحب موصوف کو خط لکھ کر ان سے میرن صاحب اور میر سرفراز حسین کو حصولِ ملازمت میں مدد دینے کی درخواست کی تھی [۲]۔ 'مہرِ نیم روز' کی خریداری کا واقعہ اور اس خط کے مندرجات صرف علی بخش خاں کی رام پور میں موجودگی ہی کی تصدیق نہیں کرتے، ریاست میں ان کے اثر واقتدار کی بھی نشاں دہی کرتے ہیں۔

مرزا غالبؔ دوسری مرتبہ ۱۸۶۵ء کے اواخر میں نواب کلب علی خاں کے جشن مسند نشینی میں شرکت کی غرض سے رام پور تشریف لے گئے اور ۱۷/اکتوبر سے ۲۸/دسمبر تک ریاست کے مہمان رہے۔ رام پور کے اس قیام کے دوران انھوں نے وہاں سے اپنے احباب وتلامذہ کو جو خطوط لکھے، ان میں سے ایک خط موسومہ حکیم غلام رضا خاں میں علی بخش خاں کا ذکر بھی موجود ہے۔ ریاست کے نئے حکمراں کے اوصافِ حسنہ کا تذکرہ کرتے ہوئے غالبؔ لکھتے ہیں کہ:

> ''نواب صاحبِ حال بہ مقتضائے اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ حسن اخلاق میں نواب فردوس آرام گاہ کے برابر بلکہ بعض شیوہ وروش میں ان سے بہتر ہیں۔ بہ مجرد مسند نشینی کے غلّے کا محصول یک قلم معاف کیا۔ علی

بخش خاں خان ساماں کو تیس ہزار روپیہ بابت مطالبۂ سرکاری بخش دیا۔''

غالبؔ کی تحریروں میں علی بخش خاں کا حوالہ تیسری مرتبہ ۱۴رمئی ۱۸۶۷ء کے ایک مکتوب میں ملتا ہے، جو نواب کلب علی خاں کے نام ہے۔ اس خط میں غالبؔ نے خان صاحب موصوف اور صاحبزادہ محمد حسن خاں کے انتقال پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ ''ادائے مدارجِ تسلیم'' اور استیلائے رنج و ملال کی کیفیت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''دوسری محرم کو علی بخش خاں خان ساماں مرے، تیسری کو یہ واقعۂ ہوش ربا (وفاتِ صاحبزادہ محمد حسن خاں) پیش آیا۔ یہ تو آپ کا فرزندِ دلبند تھا، جو اس کا غم ہو وہ بجا ہے، پر فقیر جانتا ہے کہ علی بخش خاں کے مرنے کا بھی حضرت کو بڑا رنج ہوا ہوگا۔ ایسے دیانت دار، کارگزار، ہوش مند، مزاج داں کہاں پیدا ہوتے ہیں؟''[۴]

ان دونوں خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں کے عہد میں بھی علی بخش خاں کا اعتبار و امتیاز برقرار رہا اور انھوں نے ۱۴رمئی ۱۸۶۷ء سے قبل محرم کی دوسری تاریخ کو رام پور ہی میں وفات پائی۔

دوسرے ہم عصر شاہد جو علی بخش خاں کی رام پور میں موجودگی کا پتا دیتے ہیں، منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی (پ: ۱۸۱۵ء، ف: ۱۸۹۲ء) ہیں۔ تسلیم نے عنفوانِ شباب سے وفات تک عمر کا بیشتر حصہ مراد آباد میں بسر کیا۔ انھوں نے رام پور میں حصولِ ملازمت کے لیے غالباً کبھی کوشش نہیں کی لیکن نواب محمد سعید خاں سے جو تخت نشینی (۱۸۴۰ء) سے قبل سہسوان میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے، ان کے خاندانی روابط تھے۔ اس تعلق کی بنا پر انھیں قیامِ مراد آباد کے ابتدائی زمانے ہی سے ریاست میں آمد و رفت کے مواقع اور فرماں روایانِ وقت سے تقرب کا شرف حاصل رہا۔ اس نسبت خاص کی یادگار ان کی تصنیف 'تاج المدائح' ہے جو ان کے اپنے الفاظ میں ''بہ ایمائے فیض پیرائے (نواب کلب علی خاں بہادر) فرماں روائے رام پور'' لکھی گئی تھی اور ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ء میں مطبعِ نول کشور، لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب دو ابواب

اورایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ بابِ اول فن شعراوراس کے اقسام کے بیان سے متعلق ہے، جب کہ بابِ دوم ''ہر آنچہ بہ ریاست لازم وملزوم ست'' کے زیرِعنوان لوازمِ ریاست ومتوسلینِ سرکار کے ذکر سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دونوں باب ۱۲۸۳ھ/ ۶۷-۱۸۶۶ء میں لکھے جا چکے تھے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہے:

چوں بہ تعریف جنابِ نکتہ سنج — در سخن دادیم دادِ انتظام
خامۂ دُربار در تاریخِ سال — زدرقم: تاج المدائح شد تمام

۱۲۸۳ھ

موخرالذکر باب کے تحت خاصانِ ریاست کے زمرے میں مولوی محمد عثمان خاں مدارالمہام، مولانا محمد سعداللہ مرادآبادی، منشی امیر احمد امیرؔ مینائی، نواب مرزا خاں داغؔ، حکیم ضامن علی جلالؔ، مرزا رحیم الدین حیاؔ، میر عوض علی خوش نویس اور شیخ وحیدالزماں، وکیل کے پہلو بہ پہلو شیخ علی بخش خاں، تحصیل دار کا ذکر بھی موجود ہے۔ ان کے بارے میں تسلیمؔ نے لکھا ہے کہ

> ''مشارٌ الیہ وموی الیہ سرکار، علی بخش خاں بہادر تحصیل دار کارسنج وخاطر جوست، مزاج دان ومزاج گوست، کارداں درہمہ کارداران ست وپیش رودر جملہ پیش کاران ست۔ نہ سخن آفرین ست، نہ سخن چین ست۔ ہاں مردِ خواندہ است، یارِ مردمِ درماندہ۔ حاجت روائِ منتشراں شعارش، دست گیریِ از پاافتادگاں کارش۔ ہر کسے کہ با او پیوست، بامحبوبۂ آرزو پیوست۔ شیخ کلال ست، صاحب اقبال ست، مآل اندیش ودوربین است، فکرش بر فلک، خوداوبر زمیں۔ سابق خان ساماں بود، حال تحصیل دار ست، درمقتبسانِ بساط فیض مناطِ اقتدار ست۔'' (ص ۶۳)

''تاج المدائح'' میں انشا پردازی وعبارت آرائی کے التزام کی بنا پر الفاظ کے استعمال اور تراکیب کے اختراع میں بعض رعایتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں، جن کی وضاحت

حاشیوں میں کر دی گئی ہے۔ ان حواشی کی روشنی میں اس عبارت کا مفہوم حسب ذیل ہے:

علی بخش خاں بہادر تحصیل دار سرکارِ رام پور کے انتہائی معتبر اور معتمد علیہ ملازم ہیں۔ وہ بے حد معاملہ فہم، خوش اخلاق اور مزاج داں ہیں اور مخاطب سے اس کی کیفیت طبعی کے مطابق گفتگو کے فن سے بہ خوبی واقف ہیں۔ کارپردازانِ ریاست میں وہ سب سے زیادہ کار آگاہ اور خدمت گارانِ خاص میں سب پر سابق و فائق ہیں۔ سخن سازی اور عیب جوئی سے مبرا ہیں، پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ چنانچہ پریشاں حالوں کی حاجت روائی ان کا شعار اور بے سہاروں کی دست گیری ان کا شغل ہے۔ جس شخص کو ان کا تقرب حاصل ہو گیا، وہ گویا اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ (نسباً) شیخ کلال اور (مراتب ظاہری کے لحاظ سے) صاحب اقبال ہیں۔ مآل اندیشی و دور بینی ان کا خاصۂ طبیعت اور بلند خیالی و سادہ روی ان کی شخصیت کا جوہر ہے۔ پہلے خان ساماں تھے، آج کل تحصیل داری کے عہدے پر فائز اور اختیار و اقتدار کی بساطِ فیض مناط سے روشنی حاصل کرنے والوں میں شامل ہیں۔

غالبؔ اور تسلیمؔ کے ان بیانات سے مندرجۂ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

(۱) علی بخش خاں ورودِ رام پور کے بعد سے اپنی وفات تک برابر متوسلینِ ریاست میں شامل رہے۔

(۲) انھیں والیانِ ریاست کے انتہائی کارگزار، قابلِ اعتماد اور مزاج شناس ملازم کی حیثیت حاصل تھی۔

(۳) انھوں نے ۲؍محرم ۱۲۸۴ھ مطابق ۶؍مئی ۱۸۶۷ء کو رام پور ہی میں انتقال کیا۔

(۴) ان کا نسبی تعلق شیوخِ کلال سے تھا، اس لیے ان کے نام کے ساتھ ''خان'' اور بہ روایت تسلیمؔ ''بہادر'' کا لاحقہ ان کی شخصی عزت و وجاہت پر دلالت کرتا ہے۔

یہاں ضمناً اس امر کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مولانا محمد علی جوہرؔ کو غالبؔ کی شخصیت اور شاعری سے جو غیر معمولی دلچسپی تھی، اس کا سرچشمہ بہ ظاہر ان کے دادا علی بخش خاں اور غالبؔ کے درمیان وہ رابطۂ اتحاد معلوم ہوتا ہے جس کی شہادت موخر الذکر کے خطوط سے ملتی ہے۔ غالباً مولانا محمد علی ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قیامِ کلکتہ کے زمانے میں اپنے اخبار 'کامریڈ' کی ۱۷؍جون ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں ایک مضمون لکھ کر غالبؔ کے

قدر دانوں کو ان کے مزار پر ایک مناسب یادگار کی تعمیر، ان کی تصانیف نظم ونثر کے عمدہ ایڈیشنوں کی اشاعت اور اسی قسم کے دوسرے مقاصد کی تکمیل کے لیے غالب سوسائٹی کے قیام کی جانب متوجہ کیا تھا۔

حاصلِ کلام یہ کہ غالبؔ اور تسلیمؔ کی ان دو معاصر شہادتوں کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا محمد علی جوہرؔ کے دادا شیخ علی بخش خاں نے نجیب آباد سے ترکِ سکونت کے بعد رام پور کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا تھا۔ وہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۶۷ء تک مستقلاً رام پور ہی میں رہے اور تقریباً پچیس سال ریاست کی خدمات انجام دے کر بالآخر اسی خاک کا پیوند ہو گئے۔ اس کے بعد مولانا محمد علی کی رام پور میں ولادت کے متعلق کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

حواشی

۱؎ مکاتیبِ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، رام پور، ۱۹۴۹ء، ص ۱۹۷
۲؎ مکاتیبِ غالب، ص ۲۱و۲۲
۳؎ اردوے معلیٰ، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۹ء، ص ۴۵۳
۴؎ مکاتیبِ غالب، ص ۱۷ (ماہ نامہ 'نگار'، دہلی، شمارہ اپریل، مئی ۱۹۸۰ء)

اقبالؔ سے منسوب ایک غزل

اکتوبر ۱۹۸۹ء کی ساتویں تاریخ تھی، حیدرآباد میں محبِّ مکرم ڈاکٹر مجاور حسین رضوی کے دولت کدے پر قیام کے دوران ان کی ایک شاگردہ عائشہ خاتون کا ایم۔فل کا مقالہ 'اردو غزل کے معروف اشعار کی تحقیق و تصحیح' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مقالہ ۸۴-۱۹۸۳ء کے تعلیمی سال کے دوران حیدرآباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے زیرِنگرانی لکھا گیا تھا۔ مقالہ نگار نے ان اشعار کے بارے میں جو زباں زدِ خاص و عام ہیں اور جن کے لکھنے والوں کے نام عام طور پر معلوم نہیں، تحقیق کر کے ان کا صحیح متن متعیّن کرنے اور ان کے مصنفین کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی یہ کوشش کامیاب ہے اور ان کی تلاش و جستجو کے نتیجے میں کئی اشعار کی ملکیت پہلی بار صحیح طور پر متعین ہوئی ہے، لیکن جیسا کہ اس قسم کے کاموں میں عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے، ان کا ہر فیصلہ اور ان کی ہر دریافت تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ بعض اشعار کے معاملے میں انھوں نے صرف سنی سنائی روایتوں پر انحصار کیا ہے جو عام طور پر قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔ یہاں ایسی ہی ایک روایت کا جائزہ مقصود ہے، جس کی بنیاد پر مندرجہ ذیل اشعار علامہ اقبالؔ سے منسوب کیے گئے ہیں:

کب ہنسا تھا کہ جو کہتے ہو کہ رونا ہوگا — ہو رہے گا مری قسمت میں جو ہونا ہوگا
خندۂ گل پہ مجھے آج تو ہنس لینے دو — پھر اسی بات پہ رولوں گا جو رونا ہوگا

ہم کو اقبالؔ مصیبت میں مزا ملتا ہے ہم تو اس بات پہ ہنستے ہیں کہ رونا ہوگا
ایسے دریا پہ سلامت روی موج نہ ڈھونڈ پار ہونا ہے تو کشتی کو ڈبونا ہوگا
اک طرف دوست کا اصرار کہ آنکھیں کھولو اک طرف موت تھپکتی ہے کہ سونا ہوگا

ان میں سے پہلے تین اشعار 'باقیاتِ اقبالؔ' مرتبہ سید عبدالواحد معینی مع ترمیم واضافۂ محمد عبداللہ قریشی کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔ باقی دو شعروں کے بارے میں عائشہ خاتون کا بیان ہے:

''آخر کے دو شعر اقبالؔ کے غیر متداول کلام میں بھی درج نہیں۔ ۱۹۳۸ء میں استادِ محترم ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے دہلی میں کلن قوال سے یہ پانچوں شعر سنے تھے، چنانچہ انھوں نے یہ دو شعر اقبال اکیڈیمی (حیدرآباد) میں 'باقیاتِ اقبالؔ' کے حاشیے پر درج کر دیے ہیں۔ اسی سند پر ان اشعار کو یہاں درج کیا گیا۔''[۱]

'باقیاتِ اقبالؔ' کے پہلے ایڈیشن میں جو تنہا سید عبدالواحد معینی کا مرتب کردہ تھا اور ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا، یہ اشعار موجود نہیں۔ دوسرا ایڈیشن جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا، ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں آئینۂ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس کے دوسرے حصے 'غزلیں' کے تحت صفحہ ۴۵۵ پر یہ تینوں اشعار موجود ہیں۔ کلام کی تقسیم وترتیب کے مطابق یہ شعر طبعِ ثانی کے وقت اس مجموعے میں شامل کیے گئے تھے۔ سید عبدالواحد معینی نے باقیات کے اس دوسرے ایڈیشن کو اپنے شریکِ کار محمد عبداللہ قریشی کی مساعیِ جمیلہ کا مرہونِ احسان قرار دیا ہے۔[۲] مجموعے کے دوسرے بہت سے اشعار کی طرح ان شعروں کے بارے میں بھی فاضل مرتبین نے یہ بتانے کی زحمت نہیں فرمائی ہے کہ انھیں یہ کس ذریعے سے حاصل ہوئے اور ان کے فرمودۂ اقبالؔ ہونے کا کیا ثبوت ہے۔ محض اس بنا پر کہ ان میں سے تیسرے شعر کے مصرعِ اول میں اقبالؔ بہ طور تخلص نظم ہوا ہے، انھیں بلا تامل علامہ اقبالؔ سے منسوب کر دینا حد درجہ سہل پسندی اور بے احتیاطی پر دلالت کرتا ہے۔ تحقیق اس قسم کی سہل انگاریوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

مقالہ نگار نے 'باقیاتِ اقبالؔ' میں پیش کردہ ان تین اشعار پر اپنے استادِ محترم کے

حوالے سے مزید دو شعروں کا اضافہ کرتے ہوئے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ موصوف نے یہ پانچوں اشعار ۱۹۳۸ء میں کلن نامی قوال کی زبان سے دہلی میں سنے تھے۔ ان کے اس بیان کے پیشِ نظر ضروری معلوم ہوا کہ میزبانِ محترم ڈاکٹر مجاور حسین رضوی سے گفتگو کر کے اس سلسلے کی ضروری تفصیلات دریافت کی جائیں۔ چنانچہ اگلے روز میں نے ان سے درخواست کی کہ اس غزل کے بارے میں اور علامہ اقبالؔ سے اس کے انتساب کے متعلق انھیں جو کچھ معلوم ہے، اسے اپنے قلم سے تحریر کر کے مجھے عنایت فرما دیں۔ میری اس خواہش کے جواب میں موصوف نے قلم برداشتہ جو کچھ تحریر فرمایا، وہ من وعن درجِ ذیل ہے:

''اکیاون برس گزر گئے۔

میں اپنی بڑی بہن اور بہنوئی کے ساتھ کُنڈر کی ضلع مرادآباد میں رہتا تھا۔ مرادآباد میں بھائی اختر حسین مرحوم (ظہیر محسن ایڈوکیٹ کے والد) رہتے تھے، جو میرے بہنوئی کے بہنوئی تھے۔ اکثر ہم لوگ مرادآباد جاتے تھے اور وہاں رہتے تھے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اسی زمانے میں فلم 'جیلر' ریلیز ہوئی تھی، جگہ جگہ اشتہار لگے ہوئے تھے 'ہم تو جیلر دیکھیں گے'۔ سردیاں تھیں۔ میں اکرام بھائی (میرے بہنوئی نصیرالحسن مرحوم کے ماموں زاد بھائی) کے ساتھ دہلی گیا تھا۔ مرحوم کو قوالیاں سننے کا ذوق تھا۔ میں نے کئی قوالیاں اسی زمانے میں سنی تھیں۔ اتنا یاد ہے کہ جمعرات کا دن تھا۔ جو قوالیاں سنی تھیں، ان کے مکھڑے یاد ہیں: ''محمد حشر کے میداں میں دولھا بن کے نکلیں گے''، ''رخسار سے زلفوں کو ہٹا کیوں نہیں دیتے''، ''جب سے سودا زلف عنبر فام ہے۔'' انھیں کے ساتھ یہ غزل بھی (بطرزِ قوالی) سنی تھی۔ غزل کا مطلع اور آخر کے تین شعر یاد ہو گئے تھے۔ اس کا سبب بھی تھا۔ شاعری سے فطری دلچسپی، گھر میں بیت بازی کا رواج اور پھر ادائیگی اور طرز، میں نہیں کہہ سکتا کہ جو محترم قوال تھے وہ کون بزرگ تھے۔ میں نے 'کلن' نام سنا تھا۔

اکرام بھائی اکثر کلن یا کالو قوال صاحبان کا تذکرہ کرتے تھے اور سننے بھی جاتے تھے۔ اس وقت بھی علامہ اقبالؔ سے وابستگی تھی۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' پرائمری اسکول میں یاد کرایا گیا تھا۔ ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' گھر پر یاد کرایا گیا اور ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے'' خود سے یاد کیا۔ دو تین ہم جماعت ایسے تھے، جنھیں یاد تھا۔ اقبالؔ تخلص کی وجہ سے ان اشعار کو علامہ اقبالؔ ہی کی فکر سمجھا۔ سنہ ۴۴ء میں اقبالؔ صفی پوری اسلامیہ کالج، گورکھپور کے مشاعرے میں آئے تھے۔ مشاعرے میں ان کی غزل بہت کامیاب رہی۔ ایک شعر درج ہے:

بہار آنے تو دو چمن میں، گھٹائیں چھائیں تو میکدے پر
پئیں گے ہم یا رہے گی توبہ یہ بعد کو فیصلہ کریں گے

اسی زمین میں جگرؔ صاحب کی بھی غزل تھی۔ بہرحال اقبالؔ صفی پوری صاحب کی طرف ذہن بھی نہیں گیا کہ یہ اشعار ان کے ہوں گے۔ ہائی اسکول میں اس طرح کے تجسس کا امکان بھی نہ تھا۔ پھر یہ اشعار بیت بازی میں یا احباب کی نشست میں بھی پڑھے گئے۔

سنہ ۸۰ء میں حیدرآباد میں اقبال اکیڈیمی میں عزیزی ڈاکٹر رحمت (علی خاں، یوسف زئی) اور (مصلح الدین) سعدیؔ صاحب کے ہمراہ گیا۔ 'باقیاتِ اقبال' میں یہ اشعار نظر آئے، آخر کے دو شعر نہ تھے۔ مجھے غزل ہی یاد تھی۔ خوشی ہوئی کہ یہ اشعار علامہ ہی کے ہیں۔ حیرت ہوئی کہ علامہ ایسے شعر بھی (خصوصاً مقطع) کہہ سکتے تھے۔ سعدی صاحب سے مشورہ کے بعد 'باقیاتِ اقبالؔ' کے حاشیے پر دونوں شعر لکھ دیئے۔

۸/اکتوبر ۱۹۸۹ء۔''

مجاور صاحب کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ انھوں نے محض 'اقبالؔ تخلص کی وجہ

سے ان اشعار کو علامہ اقبالؔ کی فکر سمجھا تھا۔ خود کلن قوال نے بھی انھیں علامہ اقبالؔ ہی کا کلام کہہ کر پیش کیا تھا یا کسی دوسرے اقبالؔ سے منسوب کیا تھا، یہ انھیں مطلق یاد نہیں۔ اس کے باوجود زیادہ احتمال اسی کا ہے کہ متذکرہ محفل قوالی میں بھی یہ غزل اقبالؔ ہی کے نام سے پیش کی گئی ہوگی، کیونکہ غیر معروف شعرا کا کلام مشہور و ممتاز شاعروں کے نام سے پیش کرنا تاکہ سامعین اسے احترام و عقیدت کے ساتھ سنیں اور مختلف شعرا کے ایک ہی زمین کے منتخب اشعار یکجا کر کے ایک اچھی غزل تیار کر لینا قوالوں کے معمولات میں داخل رہا ہے۔ میرؔ کے نام سے مشہور غزل جو اس مقطعے سے شروع ہوتی ہے:

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

اور اس مقطعے پر تمام ہوتی ہے:

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

اس کی بہترین مثال ہے۔[۳] غالبؔ نے بھی اپنے ایک خط میں شکوہ کیا ہے کہ ''گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیتے ہیں۔'' اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

مقطع یہ:

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اس نے، ذرا میرے پانو داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر، اس مقطع اور بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے۔''[۴]

خود راقم الحروف نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں گورنمنٹ حمیدیہ کالج، بھوپال میں منعقد ایک محفل قوالی میں ایسی ہی ایک غزل سنی تھی جو علامہ سیمابؔ کے نام سے پیش کی گئی تھی۔ اس غزل کا مطلع اور دو شعر اب بھی یاد ہیں جو سطورِ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں ایک آئنہ تھا، ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں
اب تم کو بھول جانے کی کوشش کریں گے ہم تم سے بھی ہو سکے تو نہ آنا خیال میں
کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے لا اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال میں

اس میں پہلے دو شعر واقعی علامہ سیمابؔ کی تصنیف ہیں، لیکن تیسرا شعر ان کا نہیں، سراجؔ لکھنوی کا ہے۔ باقی تین چار شعر اب یاد نہیں، اس لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انھی دونوں شاعروں میں سے کسی ایک یا دونوں کے تھے یا ان دونوں کے علاوہ کنھی اور شاعروں کے طبع زاد تھے۔ 'باقیاتِ اقبالؔ' میں علامہ اقبالؔ کے غیر متداول کلام کی حیثیت سے پیش کیے گئے زیر بحث تین اشعار بھی ممکن ہے کہ عبدالواحد معینی یا عبداللہ قریشی نے ایسے ہی کسی قوال کی زبانی سنے ہوں اور ڈاکٹر مجاور حسین کی طرح محض تخلص کی وجہ سے انھیں علامہ اقبال کے نتائجِ فکر سمجھ کر اس مجموعے میں شامل کر لیا ہو۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ غزل علامہ اقبالؔ کے ایک ہم تخلص شاعر خواجہ غلام محمود اقبالؔ بنارسی کی تصنیف ہے۔ اس غزل کے بیشتر اشعار بنارس کے متعدد اربابِ ذوق کو زبانی یاد ہیں۔ خود میں نے جن لوگوں کی زبانی اس غزل کے متفرق اشعار سنے ہیں، ان میں جناب آغا منظرؔ کاشمیری مرحوم (متوفّٰی ۲ر نومبر ۱۹۸۳ء) جناب عبدالقدوس نیرنگؔ مرحوم (متوفّٰی ۳۰ر مئی ۱۹۸۳ء) جناب نذیرؔ بنارسی، جناب آغا جمیلؔ کاشمیری اور ڈاکٹر ناظمؔ جعفری کے نام بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ بہ استثنائے ڈاکٹر ناظمؔ جعفری یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے خواجہ اقبالؔ مرحوم کو دیکھا تھا اور بنارس کے مشاعروں میں ان کی زبانی ان کا کلام سنا تھا۔ ان زبانی روایتوں کے علاوہ مرزا عباس بیگ محشرؔ بنارسی ۵ کے مرتبہ تذکرۂ شعرا 'سخنورانِ بنارس' اور ڈاکٹر امرت لال عشرتؔ کی تصنیف 'سلسلۂ مصحفی کے سخنورانِ بنارس' سے بھی اس انتساب کی تائید ہوتی ہے۔ جناب عرفانؔ عباسی کا 'تذکرۂ شعرائے اتر پردیش' تیسری معلوماتی کتاب ہے، جس میں اس غزل کے چار شعر خواجہ اقبالؔ کے کلام میں شامل کیے گئے

ہیں۔(جلد نمبر ۷، صفحہ ۳۲) چونکہ جناب عباسی نے خواجہ صاحب کے حالات اور کلام کے سلسلے میں ڈاکٹر عشرتؔ کی کتاب سے استفادہ کیا ہے اور عشرتؔ صاحب کا اصل ماخذ مرزا عباس بیگ محشرؔ کا تذکرہ ہے، اس لیے موخرالذکر دونوں کتابوں سے صرفِ نظر کر کے 'سخنورانِ بنارس' سے خواجہ اقبالؔ کے حالات کا اقتباس سطورِ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

''خواجہ غلام محمود نام، اقبالؔ تخلص۔۶ والد کا نام خواجہ غلام نبی۔ معززین بنارس میں سے تھے۔ خواجہ غلام نبی بنارس کے مشہور وکیل تھے۔ اقبالؔ نے بی.اے. پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں عدالت دیوانی، بنارس میں ملازمت کی۔ پھر وکالت پاس کر کے کام شروع کیا۔ وکالت اقبالؔ کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتی تھی، اس لیے اس میں زیادہ توجہ اور محنت نہیں کی۔ طبیعت کا لگاؤ تجارت کی طرف تھا۔ تجارت میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے بڑے بڑے نقصانات اٹھائے۔

محمد عمر کلیمؔ سے تلمذ تھا۔ اقبالؔ نہایت خوش طبع، خلیق، بذلہ سنج اور آشنا پرست تھے۔ ان کے کلام میں میرؔ کے کلام کی چاشنی ہے۔ ریاضؔ۸ سے دوستانہ نہیں، عزیزانہ تعلقات تھے۔ فرصت کے اوقات زیادہ تر ریاضؔ اور حکیم ابوالحسن نسیمؔ۹ کے یہاں صرف کرتے۔ عمدہ اور لطیف کھانوں سے خاص رغبت تھی۔ خوردوں سے بھی دوستانہ تعلقات رکھتے اور اشاروں اشاروں میں ان کی کمزوریوں کی اصلاح فرمادیا کرتے۔

راقم الحروف کو ان کی خدمت میں بے تکلفانہ نیاز حاصل تھا۔ ایک بار ان کی ایک غزل ان کی اجازت کے بغیر لاہور کے کسی ادبی پرچے میں بہ عرضِ اشاعت بھیج دی اور ان کو اس سے مطلع کیا۔ فرمانے لگے: ''ایسا کیوں کیا۔ دوسرا ہوتا تو کچھ کہتا، تمھیں کیا کہوں۔'' شب کے وقت اپنی بیاض جس میں تیس برس کا کلام تھا، نذرِ آتش کر دی۔ صبح جب مجھے اطلاع ملی، سخت افسوس ہوا۔ میں

نہایت افسردہ حاضرِ خدمت ہوا۔ ہنس ہنس کر شب کے واقعہ کا تذکرہ فرمانے لگے۔ میں نے کہا: مجھے سخت افسوس ہے۔ ایسا کیوں کیا؟ فرمانے لگے: ''کیا کرتا؟ آپ مانتے نہیں، مجھے اچھالنے کے لیے آپ غزلیں پرچوں میں بھیجتے رہتے۔ میں آپ کو منع نہیں کرسکتا تھا۔ آپ کی دل شکنی گوارا نہیں، اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ نہ بانس رہے، اور نہ بانسری بجے۔'' میں نے کہا کہ مجھے ان جواہر ریزوں کے ضائع ہونے کا دلی قلق ہے۔ ہنس کے فرمایا: ''میں تو زندہ ہوں، پھر کہہ دوں گا۔ کچھ دنوں آپ اشاعت ملتوی رکھیے۔'' اس دن کے بعد سے میں نے ان کا کلام جن جن احباب کے پاس تھا، تلاش کر کے جمع کرنا شروع کیا۔ بہت سی غزلیں دستیاب ہوگئیں، مگر افسوس کہ رباعیوں کا قیمتی مجموعہ اور تاریخِ عرب منظوم دستیاب نہ کرسکا، جس کا عمر بھر قلق رہے گا۔

مرضِ ذیابیطس نے اقبالؔ کی صحت کا خاتمہ کردیا۔ جب سے کاربنکل نکلا، خانہ نشین ہوگئے۔ طبیعت اداس اور پژمردہ رہنے لگی۔ ریاضؔ اور عزیزؔ[10] (اقبالؔ کے بہنوئی) کی موت نے اور اثر ڈالا۔ (تقسیمِ ملک کے بعد) ترکِ وطن کر کے ڈھاکہ (پاکستان) چلے گئے۔ اقبالؔ کے تینوں صاحبزادے ہونہار اور پدر پرست ہیں اور مشرقی پاکستان میں معزز عہدوں پر ہیں۔ اقبالؔ انھیں کے ساتھ گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے لگے۔ ۱۹؍دسمبر ۱۹۴۹ء کو، پیر کے دن ڈھاکہ میں انتقال ہوا۔ بنارس کی موجودہ شاعری اقبالؔ کے مشاعروں اور ان کی شاعری کی صدائے بازگشت ہے۔''[11]

زیرِ بحث غزل کے وہ اشعار جو اس تذکرے میں اقبالؔ کے انتخابِ کلام میں شامل ہیں، درجِ ذیل ہیں:

کب ہنسا تھا جو بگڑتے ہو کہ رونا ہوگا ہو رہے گا مری قسمت میں جو ہونا ہوگا
خندۂ گل پہ ہمیں آج تو ہنس لینے دو کل اسی بات پر رولیں گے جو رونا ہوگا
اک طرف دوست کا اصرار کہ آنکھیں کھولو اک طرف موت تھپکتی ہے کہ سونا ہوگا
شوق سے آپ نقابِ رخِ زیبا الٹیں ہو رہے گا مری قسمت میں جو ہونا ہوگا
ایسے دریا میں سلامت روئ نوح کہاں پار ہونا ہے تو کشتی کو ڈبونا ہوگا
ہم کو اقبالؔ مصیبت میں مزا ملتا ہے ہم تو یہ سوچ کے ہنستے ہیں کہ رونا ہوگا

اسی تذکرے کے حوالے سے خواجہ اقبالؔ کی کچھ اور غزلوں کے مقطعے اور جن غزلوں میں مقطعے موجود نہیں ان کے مطلع سطورِ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

بے ہوش جو نہیں تھا وہ اس کے اثر میں تھا جادو یہ کس بلا کا تمھاری نظر میں تھا

☆☆☆☆☆

ہنس کے فرما رہے ہیں وہ اقبالؔ تو کوئی مدعا نہیں رکھتا

☆☆☆☆☆

دیکھنے والے محبت کا قرینا دیکھیں قیس کی موت تو دیکھی مرا جینا دیکھیں

☆☆☆☆☆

تو ہی بتا دے نامہ بر! تجھ سے پیام کیا کہیں جو نہیں جانتا ہمیں، اس کو سلام کیا کہیں

☆☆☆☆☆

انبساطِ چہرۂ اقبالؔ دیکھ موت کیا آئی، مرادیں مل گئیں

☆☆☆☆☆

یہ مردہ پرستی دنیا کی اقبالؔ کو کیوں کر چھوڑے گی برباد ہوا، دل شاد ہوا، اب گور پہ کیوں تعمیریں ہیں

☆☆☆☆☆

اقبالؔ نکتہ چینوں کے علم و مذاق کو تم جانتے نہیں ہو کہ ہم جانتے نہیں

☆☆☆☆☆

اقبالؔ شامِ عمر تو اب تک ہوئی نہیں دل کہہ رہا ہے صبحِ قیامت ہوئی نہ ہو

☆☆☆☆☆

اقبالؔ مال و دولتِ دنیا نہیں، نہ ہو سرمایۂ محبت آلِ عبا تو ہے

☆☆☆☆☆

اپنی نہ کچھ کہی، نہ کچھ اقبالؔ کی سنی نیچی نظر کیے وہ ادھر دیکھتے رہے

☆☆☆☆☆

عشق میں کچھ برا نہیں اقبالؔ جس سے جو بن پڑے وہ کر بیٹھے

☆☆☆☆☆

مصلحت یہ ہے، چپ رہو اقبالؔ وہ نظر آ رہے ہیں برہم سے

☆☆☆☆☆

ان معروضات کا مقصد اہلِ علم کو اس امر کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ محض شہرتِ عام کی بنا پر یا قوالوں جیسے غیر معتبر راویوں کی شہادت پر اعتبار کر کے کسی غزل یا نظم کو کسی خاص شاعر کے مجموعۂ کلام میں شامل کر دینا انتہا درجے کی بے احتیاطی پر دلالت کرتا ہے۔ شاعر کے ساتھ عقیدت مندانہ وابستگی تحقیق کے تمام تقاضوں سے صرفِ نظر کر کے اس طرح کی بے احتیاطیوں کو روا رکھتی ہے۔ غالبؔ کے کلام کے سلسلے میں اس قسم کے الحاق والتباس کی کئی مثالیں سامنے آ چکی ہیں۔ شہرتِ عام اور حلقۂ ارادت کی وسعت کے اعتبار سے اقبالؔ کا مقام غالبؔ سے بھی بلند ہے، اس لیے ان کے کلام میں دوسروں کے کلام کی شمولیت کے امکانات بھی زیادہ قوی ہیں۔ زیرِ بحث غزل کی صورت میں اس التباس کی جو شہادت سامنے آئی ہے، اس کو نظر میں رکھتے ہوئے ایسے تمام اشعار اور منظومات کو جن کے مآخذ معلوم اور محقق نہیں، اس وقت تک کے لیے باقیاتِ اقبالؔ کے زمرے سے خارج کر دینا چاہیے جب تک کہ ان کا کلامِ اقبالؔ ہونا تحقیقی طور پر ثابت نہ ہو جائے۔

حواشی

۱ 'اردو غزل کے معروف اشعار کی تحقیق و تصحیح'، نسخۂ قلمی مملوکہ ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی، ص ص ۳۰۴ و ۳۰۵

۲ باقیاتِ اقبال، دیباچۂ طبعِ دوم، مشمولہ طبعِ سوم، ص ۱۵

۳ اس غزل کا مطلع منور خاں غافلؔ لکھنوی کا ہے اور مقطع میر صاحب کے فرزند میر کلو عرشؔ کا جس کے مصرعِ اول میں تصرف کر کے میرؔ کا تخلص داخل کر دیا گیا ہے۔

۴ مکتوب بنام نواب علاؤالدین خاں علائیؔ، مورخہ ۲۷ر جولائی ۱۸۶۲ء

۵ مرزا عباس بیگ محشرؔ دسمبر ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ مختاری کا امتحان پاس کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ بنارس میونسپل بورڈ کے ممبر اور سینیر وائس چیرمین رہے۔ ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو وفات پائی۔ نظموں کا ایک مجموعہ 'نگارِ فطرت' اکاڈمی پنجاب، لاہور سے جولائی ۱۹۵۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ تذکرہ 'سخنورانِ بنارس' جنوری ۱۹۴۷ء میں مکمل ہوا۔ مرزا طاہر بخش طاہرؔ نے 'حیاتِ نکتہ سنجانِ بنارس' سے اس تذکرے کا سالِ ترتیب (۱۳۷۱ھ) نکالا۔ ۱۹۵۵ء میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔ یہ تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

۶ بعض غزلوں میں جہاں اقبالؔ نظم نہیں کیا جا سکتا تھا، خواجہؔ تخلص کیا ہے۔ مثلاً:

خواجہؔ کلیمؔ کا کلام نازشِ صد کلیم ہے
طرزِ بیان کیا کہیں حسنِ کلام کیا کہیں

آغا منظرؔ کاشمیری مرحوم یہ مقطع اکثر پڑھا کرتے تھے:

وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں آج، خواجۂ خواجگاں ہے تو
یار کے منہ کی بات ہے جھوٹ نہ ہو خدا کرے

۷۔ محمد کلیم مولوی محمد عبداللہ کے بیٹے اور ذاکر بنارسی (شاگردِ مصحفی) کے بھتیجے تھے۔ بنارس میں اپنے زمانے کے خوش فکر اور قادرالکلام شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ دو دیوان مرتب کیے تھے۔ 'سخنورانِ بنارس' کی ترتیب کے وقت تک ان میں سے ایک دیوان ضائع ہو چکا تھا۔ سالِ وفات معلوم نہیں ہوسکا۔

۸۔ میر ریاض علی ریاضؔ ابن میر فدا علی۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا میر نادِ علی کی حقیقی بہن میر انیسؔ کے چھوٹے بھائی میر نواب مونسؔ سے منسوب تھیں۔ ریاضؔ اکثر اتوار کو یا کسی تعطیل کے موقعے پر احباب کو اپنے ہاں مدعو کر کے محفل مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

۹۔ حکیم ابوالحسن محمد باقر نسیمؔ حکیم ابوعلی محمد جعفر کے سب سے بڑے صاحبزادے اور حکیم محمد کاظم بنارسی (متوفّٰی ۳۱ر جنوری ۱۹۸۸ء) کے برادرِ بزرگ تھے۔ اپنے مکان پر اکثر محفل مشاعرہ منعقد کرتے جس میں پابندیِ وقت پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا اور کسی شخص کو گیارہ سے زیادہ اشعار پڑھنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ نسیمؔ کا انتقال ۱۹۳۹ء میں ہوا۔

۱۰۔ خواجہ عزیز الدین عزیزؔ سیر و شکار کے بے حد شوقین تھے۔ شعر کم کہتے تھے۔ خاص خاص مواقع پر مشاعروں میں شرکت کی غرض سے غزل کہہ لیا کرتے تھے۔ سالِ وفات معلوم نہیں ہوسکا۔

۱۱۔ 'سخنورانِ بنارس' کے اس اقتباس کے لیے راقم السطور محشرؔ مرحوم کے داماد اور محشر اکاڈمی، بنارس کے جنرل سکریٹری سید عباس حسین زنگی پوری (متوفّٰی ۳ر فروری ۱۹۹۲ء) کا رہین منت ہے۔

(ماہ نامہ تیر نیم کش، مراد آباد، اقبال نمبر، اپریل ۱۹۹۶ء)

اقبالؔ کے ایک فارسی قطعے کی تضمین

میرے نانا مرحوم منشی شاکر حسین نکہتؔ سہسوانی[1] فارسی زبان وادب کے ان متبحّر عالموں اور رمز شناسوں میں سے تھے جو فی الواقع اپنے میدان میں مغتنمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ فنِ تاریخ گوئی کے یگانۂ عصر استاد منشی انوار حسین تسلیمؔ سہسوانی کے حقیقی بھتیجے اور شاگرد تھے۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، لیکن فارسی شاعری بالخصوص قصیدہ گوئی سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ مشہور اساتذہ کی زمینوں میں ان کے قصائد، طویل بیانیہ نظمیں اور غزلیات جو ہنوز اشاعت سے محروم ہیں، فارسی زبان سے ان کے غیر معمولی شغف اور اس کے اسالیبِ بیان پر حاکمانہ قدرت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ منشی احمد علی شوقؔ قدوائی[2] اپنے ایک خط مورخہ ۴؍اگست ۱۹۲۰ء میں ان کے ایک فارسی قصیدے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حضرت کرم فرمائے بندہ! سلامِ شوق۔ خط مع قصیدے کے مجھے پہنچا، شکریہ۔ رسید مع الخیر سے اطمینان ہوا۔ قصیدہ بہت عمدہ ہے۔ پروفیسر اولاد حسین شاداںؔ[3] نے بھی دیکھا، پسند کیا۔ منشی واحد علی صاحب ابرؔ[4] نے تو مجھ سے لے ہی لیا.....
>
> اب میری رائے، پروفیسر صاحب کی رائے اور ابرؔ صاحب کی رائے،

غرض آپ کے نیاز مندوں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ فارسی میں آپ اپنی حد تک کمال حاصل فرما چکے ہیں۔ اب آپ کو اپنی زبان اردو پر توجہ فرمانا چاہیے۔ اپنی قابلیت کا صرف اپنے ہی ملک کے لیے بہت زیادہ مفید ہے۔ اردو کو آپ سے قابل مصنفوں کی ضرورت بھی بے حد ہے۔ یہ رائے ہے اور سچی محبّانہ اور دوستانہ رائے ہے۔''[۵]

ہندوستان میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے اربابِ کمال کو مناسب ذرائع و وسائل عموماً خود ہی تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ یہاں جس نے شہرت طلبی یا نام و نمود سے گریز کی یا نامور معاصرین میں سے کسی کے ساتھ بالارادہ کسی مباحثے میں الجھ کر دوسروں کو اپنی صاحب نظری اور دیدہ وری کے اعتراف پر مجبور نہیں کیا، وہ ہمیشہ کے لیے گمنامی اور کس مپرسی کا شکار ہو گیا۔ نکہتؔ بھی اسی بنا پر روشناسِ خلق ہونے سے محروم رہے۔ انھوں نے ماہ نامہ شمع (آگرہ)، خیاباں (لکھنؤ)، جامعہ (دہلی) اور امین الادب (لوہارو) کے لیے ان کے مدیروں کی فرمائش پر بعض معلومات افزا علمی و تحقیقی مضامین بھی لکھے، لیکن ان کی تعداد اتنی کم اور ان کے زمانۂ اشاعت کے درمیان تفاوت اتنا زیادہ ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن پر ان کی شخصیت کا کوئی مستقل اور پائدار نقش نہ بن سکا۔ ان کے مذاقِ شعر گوئی سے واقفیت رکھنے والوں کا دائرہ اس سے بھی محدود تر تھا۔ چنانچہ ان مخصوص احباب و معاصرین کے ساتھ جو نجی صحبتوں میں ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے، رفتہ رفتہ ان کی فن کارانہ عظمت کے قدر شناسوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

نامور معاصرین میں جن لوگوں سے نکہتؔ کے مخلصانہ روابط اور برابری کے تعلقات تھے، ان میں مرزا ثاقبؔ لکھنوی کے بعد سید محفوظ علی بدایونی[۶] کا نام سرِ فہرست ہے۔ سید صاحب اپنے زمانے کے مشہور ادیبوں اور صحافیوں میں شمار کیے جاتے تھے اور مزاح نگاری میں ایک خاص طرز کے موجد تھے۔ کامریڈ اور ہمدرد کی ادارت اور انتظامی امور میں انھیں مولانا محمد علی جوہرؔ کے دست راست کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا محمد علی شروع ہی سے ایک شعلہ بار مقرر اور تحریک آزادی کے زبردست مبلغ و مجاہد کی حیثیت سے

شہرت حاصل کر چکے تھے، لیکن خلافت تحریک کی کامیاب قیادت نے ان کی شخصیت کو اس طرح ''مرجعِ ثقات وکرام'' بنا دیا کہ ان کی ذات شمعِ آزادی کے ہر پروانے کے لیے سر چشمۂ فیضان اور مرکز عقیدت بن گئی۔ نکہت بھی اپنے سیاسی مسلک کے اعتبار سے شروع ہی سے انگریزوں کے سخت مخالف اور نیشنلسٹ خیالات کے حامل تھے۔ اس لیے تحریکِ خلافت وعدم وتعاون کے زمانے میں وہ بھی مولانا محمد علی کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے اور سید صاحب کے واسطے سے رفتہ رفتہ یہ تعلق خاطر براہِ راست روابط میں تبدیل ہو گیا۔ چنانچہ دہلی میں جامعہ ملّیہ کے جلسۂ تاسیس کے لیے انھوں نے فارسی میں قصیدے کے انداز پر ایک نہایت پر جوش اور بلند آہنگ نظم لکھی، جو اسی زمانے میں ماہ نامہ ''جامعہ'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے قبل ایک اور قصیدہ نما نظم میں بھی، جو دراصل خلافت عثمانیہ کے زوال کا مرثیہ ہے، وہ مولانا محمد علی کی ملّی خدمات کو خراج عقیدت پیش کر چکے تھے۔

۱۹۳۰ء کے اواخر میں مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن پہنچے اور طبیعت کی شدید خرابی کے باوجود اس کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیا۔ اسی کانفرنس کے ہال میں ان کی وہ پر جوش صدائے حریت بلند ہوئی، جس میں انھوں نے ایک غلام ملک (ہندوستان) کی طرف واپسی پر ایک غیر مگر آزاد ملک میں مرنے کو ترجیح دی تھی۔ آزادیِ ہند کی منزل بہت قریب ہوتے ہوئے بھی ابھی کافی دور تھی اور ان کے قویٰ ان کا ساتھ دینے سے قاصر ہو چکے تھے۔ تمنّا کی بے تابی کو حالات کی صبر طلبی سے حریف نبرد رہنے کا حوصلہ کھوتے ہوئے دیکھ کر ان کے آقا ومولا نے جس سے وہ کسی بھی حالت میں اپنا ناتا توڑنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کے اس آبرومندانہ فیصلے کو اس طرح شرفِ قبولیت عطا کیا کہ انھوں نے ۴؍جنوری ۱۹۳۱ء کی صبح کو لندن کی آزاد سرزمین پر زندگی کی آخری سانس لی اور بیت المقدس میں، جو اولوالعزم پیغمبروں کا وطن ہے، دفن کے لیے جگہ پائی۔

مولانا محمد علی کی موت مجاہدین آزادی اور خاص طور پر ملت اسلامیہ کے لیے ایک زبردست سانحہ ثابت ہوئی۔ کوئی حساس اور دردمند دل ایسا نہ تھا جس نے اس صدمے کی خلش نہ محسوس کی ہو اور کوئی ذی حس آنکھ ایسی نہ تھی جس نے غریب الوطنی کی اس موت پر

آنسو نہ بہائے ہوں۔ ملک کے گوشے گوشے میں تعزیتی جلسے ہوئے۔مقررین نے تقریروں کے ذریعے،صحافیوں نے اخبارات کے اداریوں میں، ادیبوں نے مضامین کی صورت میں اورشعرا نے مرثیے اور نوحے لکھ کر مادرِ ہند کے اس جیالے فرزند کوخراجِ عقیدت پیش کیا۔نظموں میں علاّمہ اقبالؔ کا مندرجہ ذیل فارسی قطعہ عام طور پر پسند کیا گیااور دیکھتے دیکھتے اس کے اشعار مرنے والے کے نام کی طرح اس کے چاہنے والوں کے وردِ زباں ہوگئے:

قطعہ۸

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ — تامژہ برہم زنیم، ازماہ و پرویں درگزشت
اے خوشامشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم — ازکنارِ اندلس واز ساحلِ بربر گزشت
خاکِ قدس اورا بہ آغوشِ تمنا درگرفت — سوے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت
می نگنجد جزبہ آں خاکے کہ پاک ازرنگ وبوست — بندۂ کو از تمیز اسود و احمر گزشت
جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست — گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گزشت

سید محفوظ علی کے لیے محمد علی کی موت ایک ذاتی غم کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ صرف اپنے ایک دیرینہ رفیق یا عزیز بھائی کی رفاقت ومحبت ہی سے عمر بھر کے لیے محروم نہیں ہوئے تھے، ترغیب وتحریک کے اس سرچشمے سے بھی محروم ہو گئے تھے جس نے ان کے قلم کوتوانائی اورتحریر کوزندگی عطا کی تھی۔انھوں نے خود بھی مرنے والے کو اپنا آخری نذرانۂ عقیدت پیش کیااوراس کے دوسرے مدّاحوں اور نیازمندوں کوبھی اس ماتم میں شریک کرنے کی کوشش کی تا کہ مرحوم کی ملکی وملّی خدمات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو سکے اور وقت کی ہوائے تند اس کی یادوں کے چراغ بجھانے میں کامیاب نہ ہو۔قومی تحریکات سے براہِ راست وابستگی اورشعروادب سے طبعی مناسبت نے سید صاحب کوعلاّمہ اقبالؔ سے بھی قریب تر کر دیا تھا۔اس دوگونہ تعلق کی بنا پران کا یہ قطعہ جس میں شاعر کے دلِ دردمند کی صدا نفاستِ زبان ولطافتِ بیان کے پورے اہتمام کے ساتھ الفاظ ومعانی کے قالب میں ڈھل کرخود ان کے دل کی آواز بن گئی

تھی، ان کے لیے خاص دلچسپی اور کشش کا سبب ثابت ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک فاضل ہم وطن قاضی غلام امیر[9] سے اس قطعے پر مصرعے لگانے کی فرمائش کی۔ قاضی صاحب سید صاحب کے رفیقِ انیق ہونے کے علاوہ مولانا محمد علی کے مداح اور علامہ اقبال کے شیدائی بھی تھے، اس لیے انھوں نے اس فرمائش کی تعمیل میں مجوزہ تضمین مکمل کر کے ایک مختصر وضاحتی خط کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی۔ قاضی صاحب کی یہ تضمین مع اس خط کے سطورِ ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

''۲۶/فروری ۱۹۳۱ء

عزیزی مولانا سید محفوظ علی صاحب بالقابہ۔ بہ تعمیل ارشاد ڈاکٹر اقبال کے اطلسی قطعے میں گاڑھے کا پیوند لگا دیا۔ مجھے اردو شعر بھی کہنا نہیں آتا چہ جائے کہ میں نے شعرائے عجم کی روح پر شدید حملہ کر دیا۔ یہ آپ کے حکم کی تعمیل ہے ورنہ اس جرأت کا موقع نہیں تھا۔ اردو میں ان قوافی پر تخمیس نہیں ہو سکتی تھی۔ جو کچھ ہو سکا حاضر ہے۔ اگر آپ کو پسند ہو تو کسی اخبار میں شائع کرا دیجیے یا حوالہ چراغ علی کے کیجیے:

رفت آں غواصِ بحرِ عشق تا ثمس زگنگ — روحِ پاکش درجسد از دردِ قومی بود تنگ
ناگہاں بیروں برآمد چوں شرر خیزد زسنگ — یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تامژہ برہم زنیم ازماہ وپرویں درگزشت

گشت چوں غم خوارِ ملت راہی ملکِ عدم — اللہ اللہ آں غریبے راچہ ساماں شد بہم
بیت مقدس گفت خاکش را کہ جایت دردلم — اے خوشامشتِ غبارِ او کہ از جذبِ حرم
ازکنارِ اندلس وز ساحلِ بربرگزشت

جاں نثارِ قوم و ملت دید ایں روزِ سعید — آنکہ ازادراک بالابُد، بہ آں منزل رسید
قابلِ رشک است عزّ وشانِ معراجِ شہید — خاکِ قدس اورا بہ آغوشِ تمنا درکشید
سوے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

راست گویم، بے نیاز از مدح وذم وزہاوہوست — جوہر ملت نواز از این و آں بیگانہ خوست

از ازل ارضِ مقدس منزلِ زیبائے اوست　　می نگنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیز اسود و احمر گزشت
حاصلِ مرگ و حیاتش خلق را شمعِ ہداست　　روحِ پاکش مستنیر از قربِ نورِ کبریاست
تا بکے شکوہ امیر خستہ! کواز ما جداست　　جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خادر گزشت
نامہ سیاہ امیر نقاد بدایونی''

تضمین نگار کا اصل کمال یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ شاعر کی فکر کے نہاں خانے میں داخل ہو کر اس کے خیال کی اس طرح توسیع کرے کہ اصل شعر تضمین کے مصرعوں کے بغیر نامکمل معلوم ہو۔ اس کے ساتھ ہی تضمین کے مصرعوں کو زبان، اسلوب اور لہجے کے اعتبار سے بھی اصل مصرعوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ قاضی صاحب فارسی میں فکرِ شعر پر قادر نہ تھے، چنانچہ انھوں نے اقبال کے اشعار پر جو مصرعے لگائے ہیں، ان میں سے بیشتر میں زبان کی لطافت، محاورے کی صحت، بیان کی دلکشی اور بندش کی چستی مفقود ہے۔ سید صاحب نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اشاعت سے قبل ان خامیوں کی اصلاح ضروری ہے، قاضی صاحب کا مسودہ نکہت کے پاس بھیج دیا، جو دونوں کے مشترک دوست تھے اور جن کا دونوں یکساں احترام کرتے تھے۔[۱۰] سید صاحب نے اس کے ساتھ ایک خط بھی لکھا تھا جو حسب ذیل ہے:

> ''برادرِ محترم! السلام علیکم۔ امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ سنا ہے اس عرصے میں آپ بدایوں تشریف لائے تھے۔ نہ ملنے کی شکایت ہے۔
>
> حضرت قاضی صاحب راس کلاں نے اس مرتبہ فارسی کی ٹانگ توڑی ہے، یعنی سر اقبال نے مولانا محمد علی کی وفات پر پانچ شعر لکھے ہیں، حضرت قاضی صاحب نے ان کا خمسہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اشاعت سے پہلے آپ نہایت غور و فکر سے اصلاح فرمائیں اور نہایت خوش خط لکھ کر

میرے پاس بھیج دیں، تاکہ کسی اخبار میں چھپوادوں۔ اصلاح سرسری نہ ہو بلکہ تضمین اقبالؔ کے کلام کے شایانِ شان ہوجائے۔
جلد بھیج دیں۔ کیا اس عرصے میں ملاقات نہ ہوگی؟ کارخانہ مشکبار کی جنتری بھجوا دیجیے۔ انھیں کہلا بھیجیے کہ ایک جنتری میرے پاس بھیج دیں۔

امید کہ بیوی بچے بخیر ہوں گے۔

خاکسار
سید محفوظ علی

۳/ مارچ ۱۹۳۱ء

برادرِ مکرم! بعد اصلاح فوراً واپس بھیجیے تاکہ الایمان، دہلی کو جس کا محمد علی نمبر عنقریب نکلنے والا ہے، بھیج دوں۔ اگر مولانا محمد علی کے متعلق کوئی نظم یا تاریخ لکھ سکیں تو وہ بھی بھیج دیجیے، مگر جلد۔

محفوظ''

قاضی صاحب کے مصرعے اپنے چند در چند اسقام کی بنا پر غیر معمولی اصلاح وترمیم کے طالب تھے اور سید صاحب کا ارشاد تھا کہ تضمین کلامِ اقبالؔ کے شایانِ شان ہونا چاہیے، اس لیے نکہتؔ نے ایک دو مصرعوں کے علاوہ باقی تمام مصرعے از سرِ نو نظم کر کے مخمس کی ابتدائی شکل یکسر تبدیل کر دی۔ فکر کے سیلِ رواں کو کسی دوسرے شاعر کے تخیل، زبان اور اسلوب کا تابع بنا کر مخصوص قوافی کی پابندی کے ساتھ شعر کہنا کسی موضوع پر آزادانہ طبع آزمائی سے زیادہ دقت طلب ہوتا ہے۔ نکہتؔ نے یہ مرحلۂ دشوار جس فن کارانہ مہارت اور خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا ہے، اس کا اندازہ خمسے کی اس بدلی ہوئی شکل سے کیا جا سکتا ہے:

گوہر درجِ معالی، جوہر ناموس و ننگ — باخت کو در عشقِ ملک وقوم جاں را بے درنگ
داشت بالِ ہمّتش یارب چہ مایہ تاب وسنگ — یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ

تامژہ برہم زنیم از ماہ وپرویں درگزشت

گشت درغربت روانش چوں سبک سیر عدم　　خاکِ پاکش یافت جا در قلب ارضِ محترم
حبذا بر آں کمالِ سعی و ایں فوزِ اتم　　اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ از جذبِ حرم
از کنارِ اندلس وز ساحلِ بربر گزشت

در رہِ حسن عمل از یاریِ بختِ سعید　　پایۂ اوجش کجا بود و کجا در دم رسید
درخورِ دیدست آرے شانِ معراجِ شہید　　خاکِ قدس اورا بہ آغوشِ تمنا در کشید
سوے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

جوہر ملت نواز از ایں وآں بیگانہ خوست　　زاں بہ قلبِ قدس از روزِ نخستیں جاے اوست
راست می گویم کہ حرفِ راست مطبوع و نکوست　　می نگنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیز اسود و احمر گزشت

بس کہ روحش مستنیر از نورِ فیضِ انبیاست　　باز از مرگ وحیاتش تابش شمع ہداست
اے امیؔر خستہ ایں طرفہ بقا اندر فناست　　جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گزشت

سید صاحب نے قاضی صاحب کی تضمین کی بہ نظرِ غائر اصلاح کی فرمائش کے ساتھ یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ نکہتؔ خود بھی مولانا محمد علی کے متعلق کوئی نظم یا قطعۂ تاریخ لکھیں۔ غالباً عجلت تمام کی شرط کے باعث وہ کوئی ایسی نظم تو نہ کہہ سکے جو ان کی فکر شاعرانہ کی نمائندگی کے قابل ہو، البتہ قاضی صاحب ہی کی طرف سے تین اشعار کا ایک قطعۂ تاریخ بھی نظم کر دیا جو درجِ ذیل ہے:

بر محمد، بر علی دل دادہ، بطلِ حریت　　رفت در غربت بہ ملکِ جاوداں واحسرتا
چوں بہ لندن شد وفاتش، سرزمینِ قدس گفت　　تو کجا وبومِ کفر؟ ایں جا بیا، ایں جا بیا
ریخت درِّ اشک در سالِ غمش کلکِ (امیؔر)　　یافتہ جوہر جوارِ دل کشاے انبیا
۱۳۴۹ھ

نکہتؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو مسودہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے، اس میں تضمین

کے اشعار سیاہ روشنائی سے اور یہ قطعہ آخر میں نیلی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ مسودے میں اس قطعے کا پانچواں مصرع ''کلک'' پر ختم ہو جاتا ہے۔ وزن کے اعتبار سے اس کے بعد لفظ نکہت کے اضافے کی گنجائش نہیں، صرف امیر یا اس کا ہم وزن کوئی لفظ موزوں ہو سکتا ہے، اس لیے ہمارا یہ قیاس غلط نہیں معلوم ہوتا کہ یہ قطعہ بھی قاضی صاحب ہی کی طرف سے موزوں کیا گیا تھا اور اس مصرعے میں ان کا تخلص بر بنائے سہو شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ تضمین کے بعض مصرعوں پر بھی اس مسودے میں نظر ثانی کی گئی ہے۔ مثلاً ابتدا میں پانچویں بند کا پہلا مصرع قاضی صاحب کے دوسرے مصرعے میں الفاظ کے معمولی الٹ پھیر کے ساتھ اس طرح نظم کیا گیا تھا:

روحِ پاکش مستنیر از نورِ قربِ کبریاست

بعد میں ''قرب کبریاست'' کو قلم زد کر کے اس کی جگہ ''فیض انبیاست'' اور ''روح پاکش'' کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھتے ہوئے اس کے اوپر ''بسکہ روحش'' لکھا گیا ہے۔ اس بند کے مصرعِ ثانی کے نیچے ''ہم حیات و ہم مماتش'' تحریر ہے، جسے ''باز از مرگ و حیاتش'' کا متبادل کہا جا سکتا ہے۔ انھی دو مصرعوں کے مقابل یہ دو مصرعے بھی لکھے ہوئے ہیں:

بسکہ جوہر، جوہر فردِ جہانِ اہتداست
در بقا و در فنا یکساں وجودش رہنماست

اسی طرح پہلے بند کے پہلے اور دوسرے بند کے تیسرے مصرعے کے اوپر بعض متبادل الفاظ لکھے ہوئے ہیں، لیکن ہم نے آخری بند کے مصرعِ اول کے علاوہ جس کا ایک حصہ واضح طور پر قلم زد کر دیا گیا ہے، باقی تینوں مصرعے بجنسہٖ برقرار رکھے ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک یہ زیادہ بامعنی، خوش آہنگ اور رواں ہیں۔

'الایمان' کا متذکرۂ بالا محمد علی نمبر یا اس زمانے کا ایسا کوئی رسالہ جس میں یہ تضمین شائع ہوئی ہو، اس وقت ہماری دسترس سے باہر ہے۔ محمد انصار احمد صدیقی کے مرتبہ مجموعے ''غم کے آنسو'' میں بھی، جو مولانا محمد علی کی وفات پر مشہور شعرا کے لکھے ہوئے نوحوں، مرثیوں اور نظموں پر مشتمل ہے، یہ مخمس شامل نہیں ہے، اس لیے یقین کے ساتھ نہیں

کہا جا سکتا کہ سید صاحب کو بھیجنے کے لیے اس مسودے کی ''خوش خط'' نقل تیار کرتے وقت اس میں سے کون کون سی ترمیمیں قبول کی گئیں، کون سی رد کی گئیں اور مزید کوئی ردو بدل ہوا یا نہیں؟ تاہم موجودہ صورت میں بھی اس لعلِ گم شدہ کی بازیافت یقیناً اہل نظر اور اربابِ ذوق کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی۔ اس تضمین سے جہاں ماضیِ قریب کے ایک غیر معروف فارسی گو شاعر کی قدرتِ کلام اور شیرینیِ گفتار کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے باکمالوں کی بھی کمی نہیں جن کی روشنیِ طبع نے خود ان کی ذات کو اندھیرے میں رکھ کر دوسروں کی شہرت کے چراغ روشن کیے ہیں۔

حواشی

۱ نکہتؔ ۱۰؍ربیع الآخر ۱۲۸۸ھ مطابق ۲۹؍جون ۱۸۷۱ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ/۸۰-۱۸۷۹ء میں اپنے والد اور اہل خاندان کے ہمراہ بھوپال پہنچے۔ وہاں مولوی محمد عمر ولایتی شاگردِ مولانا امام بخش صہبائیؔ، مولانا محمد بشیر محدّث سہسوانی اور شیخ حسین عرب وغیرہ سے تحصیل و تکمیل علم کی۔ اردو میں سید جمیل احمد جمیلؔ سہسوانی شاگردِ منیرؔ شکوہ آبادی سے اور فارسی میں اپنے عمِ محترم منشی انوار حسین تسلیمؔ سہسوانی سے اصلاح لی۔ کم وبیش اڑتیس سال کی عمر تک بھوپال میں قیام رہا، بعد ازاں شعبان ۱۳۲۷ھ مطابق اگست ۱۹۰۹ء میں ملازمت سے مستعفی ہوکر سہسوان چلے آئے اور ۲۳؍دسمبر ۱۹۵۲ء کو وہیں وفات پائی۔

۲ منشی احمد علی شوقؔ قدوائی (پ:۱۸۵۳ء، ف:۱۹۲۵ء) نے یہ خط رام پور سے لکھا ہے۔ اس سے قبل وہ ایک عرصے تک ریاست بھوپال سے منسلک رہ چکے تھے۔ نکہتؔ سے اسی زمانے میں روابط قائم ہوئے۔ شوقؔ بہ اعتبارِ عمر اگرچہ نکہتؔ سے بڑے تھے لیکن ان کی فضیلتِ علمی کے معترف تھے اور ان کے کلام کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے تھے۔

۳ پروفیسر اولاد حسین شاداںؔ بلگرامی (پ:۱۸۶۹ء، ف:۱۹۴۸ء) فارسی زبان وادب کے جیّد عالم اور اپنے زمانے کے نامور استاد تھے۔ عرصے تک مدرسۂ عالیہ رام پور سے وابستہ رہے اور صدہا طلبہ کو فیض یاب کیا۔ اردو کے مشہور محقق، ناقد اور استاد ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیبؔ انھی کی نسبت سے خود کو ''شادانی'' لکھتے تھے۔

۴ منشی واحد علی آبرؔ (متوفّٰی ۹؍فروری ۱۹۲۸ء)، منشی احمد علی شوقؔ کے حقیقی

چھوٹے بھائی تھے۔

۵ بہ حوالہ ماہ نامہ ''آج کل''، دہلی، شمارہ ماہ دسمبر ۱۹۵۷ء

۶ سید صاحب ۸/مئی ۱۸۷۰ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ بریلی سے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد علی گڑھ پہنچے، جہاں ۱۸۹۵ء میں مولوی عبدالحق، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ بی.اے. کیا۔ علی برادران سے ۱۸۸۸ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی کے بورڈنگ ہاؤس میں ان کے داخلے کے وقت پہلی بار ملاقات ہوئی، جو آہستہ آہستہ دوستانہ روابط اور بعد ازاں عمر بھر کی رفاقت میں تبدیل ہوگئی۔ بی.اے. کرنے کے بعد سید صاحب تقریباً ۵ برس بہ حیثیت سکریٹری ریاست خیر پور میں، تقریباً تین برس بہ حیثیت جج صمالی لینڈ (صومالیہ) میں اور تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے دو بار بمبئی اور ایک بار حیدرآباد میں مقیم رہے۔ باقی عمر کا بیشتر حصّہ یا تو بدایوں میں یا مولانا محمد علی کی رفاقت ومعیت میں بسر ہوا۔ مولانا محمد علی کی عمر کل باون برس ہوئی۔ سید صاحب کے اپنے الفاظ میں ''باون برس کی اس مدت میں سے اکتیس برس کی مولانا کی کتابِ زندگی پوری ان کے پیشِ نظر تھی بلکہ اس کے اکثر باب ان کے سامنے لکھے گئے تھے۔'' سید صاحب نے ۲۰/اکتوبر ۱۹۴۳ء کو بہ عارضۂ فالج بدایوں میں وفات پائی۔ مولانا ضیا احمد بدایونی نے سالِ وفات ۱۹۴۴ء لکھا ہے (مباحث ومسائل ص ۴۸۷) جو درست نہیں۔

۷ مولانا محمد علی ۱۰/دسمبر ۱۸۷۸ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں بہ عرضِ تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی.اے. کیا۔ ۱۴/جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے کامریڈ جاری کیا۔ دارالحکومت کے کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد ۱۲/اکتوبر ۱۹۱۲ء سے کامریڈ بھی دہلی سے شائع ہونے لگا۔ اس زمانے میں مولانا، سید صاحب

کو بدایوں سے دلّی لے آئے۔ ۲۳؍فروری ۱۹۱۳ء کو ہمدرد کا یک ورقہ ایڈیشن شائع ہوا، جسے عرفِ عام میں 'نقیب ہمدرد' کہتے ہیں۔ یکم جون ۱۹۱۳ء کو اصل ہمدرد شائع ہوا۔ سید صاحب ان اخبارات کی ادارت سے دفتر کی تنظیم تک اور بعد ازاں تحریکِ خلافت کی سرگرمیوں میں برابر مولانا کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

۸ یہ قطعہ سب سے پہلے روز نامہ 'انقلاب' میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت اس میں صرف تین شعر تھے۔ آخر کے دو اشعار اس کے بعد اضافہ کیے گئے۔ تیسرے شعر کا پہلا مصرع ابتدا میں علامہ اقبالؔ نے اس طرح نظم کیا تھا: مشتِ خاکش را بہ خاکِ پاکِ قدس آمیختند۔ بعد میں اسے بھی موجودہ مصرعے سے تبدیل کر دیا۔ (بہ حوالہ 'سرودِ رفتہ' مرتبہ غلام رسول مہرؔ و صادق علی دلاوری، ص ۱۹۲) زیرِ بحث تضمین میں اس بدلے ہوئے مصرعے کے آخری لفظ ''گرفت'' کو ''کشید'' سے بدل دیا گیا ہے۔ یہ تبدیلی ارادی ہے یا اتفاقی؟ یہ بتانا مشکل ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے اس مصرعے کی بلاغت و معنویت کچھ اور بڑھ گئی ہے۔

۹ قاضی غلام امیرؔ صاحب بدایوں کے شیوخِ صدیقی کے ایک ممتاز گھرانے کے فرد، ثقہ اور باوضع بزرگ، مقتدر رئیس اور صفِ اول کے مختار تھے۔ عمر میں سید صاحب سے کچھ بڑے تھے۔ تعلیم بالکل مشرقی انداز پر ہوئی تھی، لیکن ذہن کشادہ اور مطالعہ وسیع تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کے درمیان معاصرانہ رقابتیں اور حریفانہ گروہ بندیاں ہر دور اور ہر شہر میں عام رہی ہیں۔ بدایوں بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں، لیکن قاضی صاحب کو اپنے ہم عصر اربابِ فضل و کمال میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ مشاعروں کی صدارت کے لیے ان کی شخصیت اور متنازعہ فیہ ادبی مسائل میں ان کا فیصلہ ہر گروہ کے لیے قابلِ قبول ہوتا تھا۔ قاضی صاحب کو شاعری کے پہلو بہ پہلو نثر

نویسی بالخصوص تنقید نگاری سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ انھوں نے لفظ ''نقاد'' کو اسی طرح اپنے نام کا جز بنالیا تھا جس طرح مشہور انشا پرداز مہدی حسن خود کو ''افادی الاقتصادی'' لکھنے لگے تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں ماہ نامہ 'الناظر' لکھنؤ کی طرف سے ''بہترین غزل گو'' کے زیر عنوان انعامی مقابلے کے لیے ذوقؔ کی شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھا تھا، جو اولاً اس رسالے کے اکتوبر، نومبر ۱۹۲۶ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ اس کے بعد الناظر پریس ہی سے مئی ۱۹۲۷ء اور جون ۱۹۴۱ء میں کتابی صورت میں اس کے دو ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ اس سے قبل ان کی دو اور کتابیں 'اسلام بہ جوابِ ردِّ اسلام' اور 'ریویو' کے ناموں سے شائع ہو چکی تھیں۔ 'اسلام بہ جوابِ ردِّ اسلام' میں قرآنی تعلیمات پر عبدالغفور دھرم پال کے اعتراضات کا مفصل و مدلّل جائزہ لیا گیا ہے اور 'ریویو' میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کی سوانح عمری ان کے مذہبی نظریات و تعلیمات پر ''فلسفیانہ تنقید'' کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ غزلوں اور نظموں کا ایک انتخاب بھی نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکا ہے۔ قاضی صاحب تاعمر بدایوں ہی میں مقیم رہے۔ وہیں ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ نکہتؔ نے ''غلام امیرم'' سے تاریخِ وفات نکالی۔

۱۰؎ سید صاحب نکہتؔ سے عمر میں ایک سال اور قاضی صاحب اس سے بھی کچھ زیادہ بڑے تھے، لیکن دونوں ان کے علم و فضل کے اعتراف میں انھیں ہمیشہ اپنے بزرگ کی حیثیت سے مخاطب کرتے تھے۔

(ماہ نامہ جامعہ دہلی، شمارہ مئی، جون ۱۹۸۰ء)

کچھ کالڑا صاحب کے بارے میں

تحقیق تلاشِ حق اور اعلانِ حق کا عمل ہے جس سے صرف وہی لوگ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو ہر قسم کے تحفظات وتعصّبات سے بالاتر ہوں اور کافی ثبوت وشہادت نیز مناسب جرح وتعدیل کے بغیر کسی بھی دعوے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، خواہ اس قسم کا دعویٰ کسی ایسے شخص ہی کی طرف سے کیوں نہ کیا گیا ہو جس کا علم، جس کی بصیرت اور جس کی حق گوئی ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ علوم وفنون کے میدان میں سو فی صد کھرے اور قابل اعتبار محققوں کی ہر دور میں کمی رہی ہے۔ پروفیسر شیام لال کالڑا، عابدؔ پیشاوری (متوفّٰی ۲۶ رجنوری سنہ ۱۹۹۹ء) اردو کے ان اساتذہ میں سے تھے جنھیں ان کے تحقیقی کارناموں کی بنا پر عصرِ حاضر کے نمائندہ محققین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی وسعتِ مطالعہ، ان کی صاحب نظری، ان کی خوش ذوقی اور ان سب سے بڑھ کر ان کے استحضارِ علم اور برہنہ گوئی پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان تمام اوصاف کے باوجود جس چیز نے انھیں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشیؔ اور رشید حسن خاں کی صف تک رسائی سے محروم رکھا وہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی عجلت پسندی اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی تھی جو انھیں کسی بھی مسئلے پر کما حقہ، غور وفکر کا موقع نہ دیتی تھی۔ چنانچہ اکثر وہ کسی بھی معاملے میں باریکی کے ساتھ اس کی تمام جزئیات کا احاطہ کیے بغیر کوئی فیصلہ کر لینے کے باوجود اس سے

پلٹنا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے تھے اور ایک اکھڑ پٹھان کی طرح تاحدِ امکان اس کا دفاع کرتے رہتے تھے۔

موصوف بہ اعتبارِ عمر اگرچہ مجھ سے سال دو سال بڑے تھے لیکن ایم.اے. کے طالب علم کی حیثیت سے مجھے ان پر ایک سال کی سبقت حاصل تھی اور استادِ محترم پروفیسر گیان چند سے نسبتِ شاگردی کے لحاظ سے میں ان سے کئی سال سینیر تھا۔ اسی رشتے سے وہ مجھے اپنا ''گرو بھائی'' کہتے اور خطوں میں کبھی کبھی بہ نظرِ احترام ''حنیف بھائی'' لکھ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس خصوصی تعلق کی بنا پر میں بھی گاہ بہ گاہ اپنے خطوط میں انھیں ان کی عجلت پسندی اور جلد بازی پر ٹوکتا رہتا تھا۔ کبھی وہ بات مان جاتے اور کبھی لاکھ دلائل وشواہد کے باوجود مان کر نہ دیتے۔ غالباً ۱۹۹۶ء کے اواخر کی بات ہے کہ میری ایک ایسی ہی تحریر کے جواب میں انھوں نے ''برادرم! سند جہالت ملی۔ شکریہ!'' سے خط کا آغاز کر کے کچھ اس طرح اپنی ناگواری کا اظہار کیا کہ باہمی تعلقات کے پیشِ نظر مجھے اس سلسلۂ کلام کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینے میں ہی عافیت نظر آئی، چنانچہ اس کے بعد ہم لوگوں کے درمیان کوئی نزاعی مسئلہ زیرِ بحث نہیں آیا۔ البتہ دسمبر ۱۹۹۸ء میں جب وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب انعام برائے تحقیق حاصل کرنے کے لیے اور میں انٹرنیشنل غالب سیمنار میں شرکت کی غرض سے دہلی پہنچا ہوا تھا، ایک شام کو بالکل ذاتی نوعیت کے ایک معاملے میں فی مابین کچھ تلخ قسم کی گفتگو ضرور ہوگئی تھی لیکن تلخی کا یہ اظہار بھی یک طرفہ تھا اور اس کی ذمہ داری کلّیتاً میری تھی۔ محترم رشید حسن خاں صاحب بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ موصوف بعض فقہی تاویلات سے کام لے کر تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں کو راہ پر لے آئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔

کالڑا صاحب کی موت بھی اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ ان کے چاہنے والے بہ مشکل اس کا یقین کر سکے۔ مختلف عوارض وشکایات کے سلسلے میں دوستوں کو نوع بہ نوع ہدایات اور مشورے دینے والا اور تداوئ امراض کے لیے طرح طرح کے تیر بہ ہدف چٹکلے بتانے والا اتنی خاموشی اور سرعت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جائے گا، کسی کو اس کا سان گمان بھی نہ تھا۔ تفصیلات تو میرے علم میں نہیں لیکن جتنا کچھ معلوم ہے، اس کی بنا پر قیاس یہ

ہے کہ یہاں بھی کام ان کی طبعی عجلت پسندی اور خود اعتمادی ہی کی وجہ سے بگڑا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص انواعِ معالجات میں بہ زعمِ خود محقق و مجتہد کے درجے پر فائز ہو، وہ کسی دوسرے کی تشخیص و تجویز سے کس طرح مطمئن اور متفق ہوسکتا ہے، چہ جائے کہ اس پر پوری توجہ کے ساتھ اور بے چون و چرعمل پیرا ہو۔ بہرحال تقدیر کا جو فیصلہ تھا وہ روبہ عمل آیا اور اردو دنیا ایک نہایت فعال، نہایت پرجوش، نہایت بے باک اور تمام کوتاہیوں کے باوجود نہایت پیاری شخصیت سے محروم ہوگئی۔ رہے نام اللہ کا۔

گذشتہ سطور میں کالڑا صاحب کی ادّعائیت اور عجلت شعاری کی طرف اشارہ کیا چکا ہے اور بالواسطہ یہ بات بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اگر یہ کوتاہیاں ان کے مزاج میں دخیل نہ ہوتیں تو بہ حیثیت محقق ان کا مقام یقیناً زیادہ بلند ہوتا۔ استادِ محترم پروفیسر گیان چند کو راقم کے اس مشاہدے سے اختلاف ہے۔ چنانچہ موصوف اپنے ایک تازہ مضمون میں جو ''شیام لال کالڑا کی یاد میں'' کے عنوان سے 'ہماری زبان' کے ۸/جولائی اور ۱۵/جولائی کے دو شماروں میں شائع ہوا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

> ''ڈاکٹر حنیف احمد نقوی کا خیال ہے کہ اپنے سیمابی مزاج کے باعث وہ (کالڑا صاحب) بعض اوقات عجلت میں کچھ نتیجہ نکال لیتے تھے جس سے بعد میں رجوع کرنا پڑتا تھا۔ یہ سچ ہوسکتا ہے لیکن میں نے ان کے کسی ایسے سہو پر انگلی نہیں رکھی۔''

یاد نہیں آتا کہ راقم نے کب اور کہاں استادِ محترم کے سامنے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا لیکن یقین ہے کہ یہ بات انھی یا تقریباً انھی الفاظ میں کسی نہ کسی وقت کہی ضرور ہوگی کیونکہ یہ میری بہت پرانی اور سوچی سمجھی رائے ہے۔ چونکہ اس بیانِ واقعہ میں ''ہوسکتا ہے'' کی وجہ سے شک کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے اور معاملہ تحقیق اور اہلِ تحقیق کا ہے، بلکہ موضوعِ گفتگو ایک ایسی شخصیت ہے جس کی فضیلتِ علمی سے ہم سب واقف ہیں، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند مثالوں کے ذریعے اس اجمال کی تفصیل پیش کردی جائے تاکہ راقم السطور پر معاندانہ عیب جوئی یا بے جا حرف گیری کا الزام عائد نہ ہو۔ اپنے

مشاہدات پیش کرنے سے پہلے میں اس سلسلے میں استادِ محترم کے مذکورۂ بالا مضمون ہی سے ایک مثال پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ (اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ مضمون کے باقی مندرجات سے مجھے پوری طرح اتفاق ہے۔) کالڑا صاحب نے اپنی تصنیف 'ذوقؔ اور محمد حسین آزادؔ' میں عبداللہ خاں اوجؔ سے متعلق آزادؔ کے ایک بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اوجؔ کا زمانہ ۱۸۵۳ء کے آس پاس کا ہے'' (اور بیان کردہ واقعہ اس کے بعد کا ہے۔) پھر لکھتے ہیں کہ ''آزادؔ نے اوجؔ کے اشعار میں یہ بھی لکھا ہے:

میں کالا پانی پڑا ناپتا ہوں مدت سے　　زمیں کا گز ہے مرا کلک میل دریائی

''کالا پانی'' ۱۸۵۷ء سے پہلے کا محاورہ نہیں۔'

استادِ محترم کالڑا صاحب کے اس ارشاد کی تائید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میں نے اوجؔ کا سنہ وفات جاننے کے لیے 'خم خانۂ جاوید' کو دیکھا تو اس میں ان کا سنہ وفات ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) دیا ہے۔ ثابت ہوا کہ یہ شعر اوجؔ کا نہیں ہوسکتا۔'' حیرت ہوتی ہے کہ کالڑا صاحب نے کسی معقول بنیاد کے بغیر کس طرح یہ دعویٰ کر ڈالا کہ ''کالا پانی ۱۸۵۷ء سے پہلے کا محاورہ نہیں،'' اور استادِ محترم نے ان کے اس دعوے کو کسی ثبوت اور شہادت کے بغیر بلا چوں و چرا کیوں کر تسلیم کر لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ''کالا پانی'' کا اپنے معروف معنی میں استعمال اس سے بہت پرانا ہے۔ غالبؔ کے عزیز قریب اور شاگردِ رشید زین العابدین خاں عارفؔ غدر سے پانچ برس پیشتر مئی ۱۸۵۲ء میں فوت ہو چکے تھے۔ ان کا یہ شعر بہ طورِ ثبوت ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

خوگرِ مے کدہ کو چشمۂ حیواں نہ دکھا　　اے خضر! وہ تو مرے حق میں ہے کالا پانی

راسخؔ عظیم آبادی کا زمانہ اس سے بھی قدیم تر ہے۔ وہ ۱۸۲۳ء میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کا یہ شعر بھی ہمارے موقف کی تائید کرتا ہے:

ہم غریبوں کی شب ہجر کا کوسانہ ٹلے　　کالا پانی ہو تجھے چرخِ کہن آج کی رات

میرؔ کا سالِ وفات ۱۸۱۰ء ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دیوانِ ششم کا یہ شعر بھی ملاحظہ طلب ہے:

یہ لہر آئی گئی زور کالے پانی تک　　محیط اس مرے رونے کو دیکھ تر آیا

ظاہر ہے کہ اس قسم کے بے اصل دعوے کی بنیاد پر کسی راوی کو غلط بیانی سے متّہم کرنا تحقیق نہیں، تحقیق کا خون کرنا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاؔد بیانِ واقعات میں محتاط نہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ اپنے نقطۂ نظر سے ہم آہنگی کے لیے یا محض زیبِ داستان کی خاطر کسی واقعے کی صورت بدل دینا ان کے معمولات میں شامل رہا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ جھوٹ اور صرف جھوٹ بولتے ہیں اور ہر جگہ افسانہ طرازی سے کام لیتے ہیں۔ کالڑا صاحب کا موقف کچھ اسی قسم کا تھا۔ ۱۹۹۵ء میں انھوں نے 'ہماری زبان' میں 'آبِ حیات کے افسانے' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو کئی شماروں میں مسلسل شائع ہوا۔ اس مضمون کی پہلی قسط (مطبوعہ شمارہ یکم اپریل ۱۹۹۵ء) میں موصوف نے دہلی کے ایک مشاعرے کو موضوعِ تحقیق بنایا ہے، جو بقولِ آزاد کرامت علی شہیدیؔ کے ورودِ دہلی کے زمانے میں نواب عبداللہ خاں صدر الصدور کے حسب فرمائش انھی کے دولت کدے پر منعقد ہوا تھا اور جس کے لیے ناسخؔ کی زمین 'چمن کی شاخ، یاسمن کی شاخ' بہ طورِ طرح تجویز کی گئی تھی۔ یہ بحث 'ہماری زبان' کے پورے دو صفحات کو محیط ہے۔ حاصل تحقیق یہ ہے کہ (۱) دہلی میں صدر الصدور منشی صدر الدین آزردہ تھے، اس لیے کسی دوسرے شخص (عبداللہ خاں) کو صدر الصدور قرار دینا درست نہیں۔ (۲) عبداللہ خاں صدر الصدور سے عبداللہ خاں المخاطب بہ مشتاق علی خاں متخلّص بہ مشتاؔق مراد ہیں، جن کا انتقال ۱۲۲۱ھ سے پہلے ہو چکا تھا۔ (۳) مشاعرے کی بنیاد ناسخؔ کی جس غزل پر رکھی گئی تھی، اس کی تصنیف ۱۲۲۱ھ سے پہلے کسی طرح ممکن نہیں۔ (۴) ذوؔق کی شعر گوئی کا آغاز مشتاؔق کے انتقال کے بعد ہوا۔ ۱۲۲۱ھ میں ان کی شاعری گھٹنیوں چلتی تھی۔ لہٰذا عبداللہ خاں مشتاؔق (متوفّی قبل ۱۲۲۱ھ) کی محفل میں شہیدیؔ کا شریک ہونا اور ناسخؔ کی ۱۲۲۱ھ کے بعد کہی ہوئی غزل کا سنانا، بعد ازاں عبداللہ خاں کا اس غزل کی زمین میں طرحی مشاعرہ منعقد کرنا اور ذوؔق کا اس میں ''سیر قوافی'' غزل پڑھنا سب کچھ افسانۂ محض قرار پاتا ہے۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج تا ثریّا می رود دیوار کج

والی بات ایسے ہی مواقع پر صادق آتی ہے۔ پہلے تو یہ طے کرلیا گیا کہ دہلی میں مفتی صدرالدین آزردہ کے علاوہ کسی دوسرے صدرالصدور کی موجودگی خارج از بحث ہے۔ بعد ازاں عبداللہ خاں کی تلاش شروع ہوئی تو تذکروں میں اس نام کے ایک ایرانی نژاد شاعر متخلص بہ مشتاق ہاتھ آ گئے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ 'مجموعۂ نغز' کی تالیف یعنی ۱۲۲۱ھ سے قبل فوت ہو چکے تھے۔ اب ناسخ کی غزل اور ذوق کی شعر گوئی پر غور وخوض شروع ہوا تو نتیجہ یہ نکلا کہ یہ غزل کسی بھی صورت میں ۱۲۲۱ھ سے پہلے کی نہیں ہوسکتی اور چونکہ یہ ذوق کی شعر گوئی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا، اس لیے ان کا اس زمین میں ''معرکے کی'' غزل کہنا اور مشاعرے میں پڑھنا یکسر بعید از امکان ہے۔ تحقیق کے تمام مراحل نہایت آسانی کے ساتھ اور انتہائی خوش اسلوبی سے طے ہو گئے اور یہ حقیقت واشگاف طور پر سامنے آ گئی کہ آزاد نے حسبِ عادت یہاں بھی غلط بیانی اور افسانہ طرازی سے کام لیا ہے۔ اب آزاد کا یہ بیان جو کالڑا صاحب کے اس مضمون ہی کے حوالے سے نقل کیا جا رہا ہے، ملاحظہ کیجیے:

> ''خوانینِ رام پور میں سے نواب عبداللہ خاں ایک امیر دلّی میں رہتے تھے، پھر میرٹھ میں صدرالصدور ہو گئے تھے۔ شعر وسخن کے شیدا تھے اور خود بھی اچھا کہتے تھے۔''

نواب عبداللہ خاں متوطّنِ رام پور، صدرالصدورِ میرٹھ کوئی مجہول یا غیر معروف شخص نہ تھے۔ وہ نواب محمد سعید خاں والیِ رام پور کے چھوٹے بھائی اور نواب یوسف علی خاں ناظم کے حقیقی چچا تھے۔ غالب اور دوسرے معاصر مصنّفین کے یہاں کئی بار ان کا ذکر آیا ہے۔ غدر کے کچھ دنوں بعد ۱۲۷۴ھ (۵۸-۱۸۵۷ء) میں بہ عمر ستتر سال ان کا انتقال ہوا۔ ان حالات میں انھیں ایرانی نژاد عبداللہ خاں مخاطب بہ مشتاق علی خاں مشتاق متوفّی قبل ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء سے ملتبس کرنے کی غلطی اگر کسی نومشق ریسرچ اسکالر یا نوجوان محقق سے سرزد ہوئی ہوتی تو یقین ہے کہ کالڑا صاحب اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیتے۔

'ہماری زبان' میں مضمون کی اس پہلی قسط کی اشاعت کے فوراً بعد میں نے اسی

جریدے میں ایک مراسلہ لکھ کر کالڑا صاحب کی توجہ ان تمام امور کی طرف منعطف کرائی تھی اور خاتمۂ کلام کے طور پر آخر میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ''پیش کردہ معلومات کی روشنی میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کا یہ حصّہ دوبارہ لکھا جائے۔ کیا عابدؔ صاحب یہ زحمت گوارا فرمائیں گے؟'' مرحوم پیچھے پلٹ کر دیکھنے کے عادی نہ تھے، اس لیے ان سے اس زحمت کی توقع فضول تھی۔ مقصود صرف انھیں چھیڑنا اور مزا لینا تھا چنانچہ تھوڑے دنوں کے بعد کسی جگہ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے: تم نے مجھے کیوں نہ لکھ دیا، 'ہماری زبان' میں مراسلہ بازی کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے عرض کیا: یہ اس لیے ضروری تھا کہ آپ قیامت تک مان کر نہ دیتے اور پڑھنے والے بیچارے آپ پر اعتبار کر کے گمراہ ہوتے رہتے۔ سن کر زیرِلب مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔ ان کے کسی بیان کی تردید میں یہ میری پہلی اور آخری تحریر تھی جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی اور یہ بھی جیسا کہ عرض کیا گیا محض شرارتاً لکھی گئی تھی۔

قیامت تک مان کر نہ دینا بھی ایک پس منظر رکھتا ہے۔ اس واقعے سے دس گیارہ سال قبل کالڑا صاحب کی کوئی کتاب (غالباً انشا۔ حریف اور حلیف) چھپ کر آئی تھی۔ اس میں کسی جگہ مصحفیؔ کا یہ شعر بھی نقل ہوا تھا:

حیران رہا دیکھ کے گل ہائے معانی حافظؔ نے جو کی سیر مصلائے طبیعت

کالڑا صاحب نے اس شعر میں لفظ 'مصلا' کے استعمال پر اعتراض کرتے ہوئے اس کی صحت سے انکار کیا تھا۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے انھیں لکھا کہ جنابِ والا مصحفیؔ ہم آپ سے زیادہ پڑھا لکھا شخص تھا۔ اردو پر حاکمانہ قدرت کے علاوہ عربی و فارسی میں بھی اسے خاصا درک حاصل تھا، اس لیے اس کے استعمال کردہ کسی لفظ کو موردِ اعتراض ٹھہرانے سے پہلے ضروری تھا کہ اس پر بار بار غور کر لیا جائے۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں۔ مرحوم نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ہم نے غور و خوض کے بعد ہی فیصلہ کیا ہے کہ یہ استعمال درست نہیں۔ اس کے بعد میں نے حافظؔ شیرازی سے جوشؔ ملیح آبادی تک فارسی و اردو کے تین چار شاعروں کے کلام سے مثالیں پیش کر کے یہ بات ذہن نشیں کرانے کی کوشش کی کہ یہ لفظ اپنے معروف معنی (جاے نماز) کے علاوہ باغیچے

یا سیر گاہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور اس اعتبار سے مصحفی نے ''مصلائے طبیعت'' لکھ کر کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انھی مقامات میں سے ایک مقام تھا جہاں شیخ شیراز نے ''سپر باید انداختن'' کا مشورہ دیا ہے، چنانچہ کالڑا صاحب نے مجبور ہو کر اپنی غلطی تو مان لی لیکن یہ لکھ کر اپنے دفاع کا ایک پہلو بھی نکال لیا کہ مصحفی کے شعر میں اس معنی کی طرف انتقالِ ذہن کا کوئی واضح قرینہ موجود نہیں۔

جون ۱۹۹۷ء میں کالڑا صاحب تقریباً ایک ماہ بنارس میں مقیم اور پروفیسر قمر جہاں کے مہمان رہے۔ تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ موصوف اس وقت 'رانی کیتکی کی کہانی' کی تدوین کا کام کر رہے تھے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جو لکھنؤ سے غالباً ڈاکٹر سید سلیمان حسین کی معرفت جموں یونیورسٹی کی لائبریری کے لیے خریدا گیا تھا، ان کے پیش نظر تھا۔ مرمت شدہ ہونے کی وجہ سے اس نسخے کی عبارات جا بجا ناقص اور غیر مربوط ہو گئی تھیں۔ ان کھانچوں کو پر کرنے کے سلسلے میں ہم لوگوں کے درمیان موقع بہ موقع اتفاق بھی ہوا اور اختلاف بھی لیکن اب اس کی تفصیلات مطلقاً یاد نہیں۔ انھی دنوں 'سب رس' کی تدوین کے مسئلے پر بھی گفتگو ہوئی اور کالڑا صاحب نے فرمایا کہ 'رانی کیتکی کی کہانی' کا کام نبٹانے کے بعد وہ یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ تصحیحِ متن کی بات نکلی تو اس کتاب کا پہلا جملہ ہی ہم لوگوں کے درمیان مابہ النزاع بن گیا۔ یہ جملہ مطبوعہ نسخوں میں اس طرح نقل ہوا ہے:

''تمام مصحف کا معنی الحمد للہ میں ہے مستقیم ہو رتمام الحمد للہ
کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم.....''

میں نے عرض کیا کہ اس عبارت کے آخری لفظ ''قدیم'' پر اگرچہ تمام مرتبینِ متن متفق ہیں لیکن میرے نزدیک صحیح لفظ ''قدیم'' (دال کے ساتھ) نہیں، ''قویم'' (واؤ کے ساتھ) ہے جس کے معنی راست، استوار اور محکم ہوتے ہیں۔ ''قدیم'' یہاں اس اعتبار سے بھی بے محل ہے کہ جس سیاق وسباق میں گفتگو ہو رہی ہے، اس میں اس لفظ کا اطلاق ذاتِ الٰہی کے علاوہ اور کسی شے پر نہیں کیا جا سکتا۔ ''قویم'' چونکہ غریب اور نامانوس لفظ ہے اور ''قدیم'' تحریر وتقریر میں بہ کثرت استعمال ہونے والا بالکل سامنے کا لفظ ہے، اس لیے قرأت

یا کتابت کے کسی مرحلے پر سہواً واؤ کا دال سے بدل جانا اور اس غلطی کا سلسلہ بہ سلسلہ جاری رہنا عینِ ممکنات سے ہے۔ کالڑا صاحب ان میں سے کسی دلیل سے مطمئن نہ ہوئے اور اس پر مصر رہے کہ ''قدیم'' یہاں بالکل صحیح ہے۔ جیسا سب نے لکھا ہے، ہم بھی لکھیں گے۔ اس کام کے سلسلے میں وہ اتنے پرعزم تھے کہ 'سب رس' کے مخطوطات کا جائزہ لینے کے لیے یہیں سے حیدرآباد روانہ ہو گئے تھے۔ وہاں سے جمّوں پہنچنے کے بعد ایک خط میں بھی انھوں نے اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن اس کے بعد معلوم نہ ہو سکا کہ یہ منصوبہ ان کے زیرِعمل رہا یا سردخانے کی نذر ہو گیا۔ 'رانی کیتکی کی کہانی' کا کام تقریباً مکمل ہو گیا تھا، اس کا انجام بھی نامعلوم ہے۔

مرحوم کے عاجلانہ اور فیصلہ کن اندازِ گفتگو کی ایک اور مثال بے محل نہ ہوگی 'غالب نامہ' نئی دہلی کے جولائی ۱۹۹۶ء کے شمارے (سلور جوبلی نمبر ۲) میں ''تنقید غالب کا ایک فقرہ'' کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شامل ہے۔ موضوعِ گفتگو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ مشہور قول ہے کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوانِ غالب۔'' اس سلسلے میں پہلی بات تو موصوف نے یہ فرمائی ہے کہ 'محاسنِ کلامِ غالب' 'مقدمۂ شعروشاعری' کے بعد مستقل کتابی صورت میں شائع ہونے والا دوسرا مقدمہ ہے جو ''بجنوری نے غالبؔ کے قدیم دیوان پر لکھا'' تھا۔ اہل علم ایک بار نہیں، بار بار اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ 'محاسنِ کلامِ غالب' غالبؔ کے قدیم دیوان کا نہیں، متداول دیوان کا مقدمہ ہے، لیکن کالڑا صاحب خواہ مخواہ ہر مضمون کو پڑھنے اور اس کے مندرجات کو ذہن میں محفوظ رکھنے کے عادی نہ تھے، اس لیے انھوں نے وہی لکھا جو جمہور کے مذہب کے عین مطابق تھا اور جسے ماننے والوں کی تعداد نہ ماننے والوں کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ان کا یہ ارشاد ہے کہ:

> ''آج تک کسی نے 'محاسنِ کلامِ غالب' کا یہ ابتدائی جملہ سمجھا نہ سمجھایا..... مجھے اپنی کم فہمی اور نادانی کا اعتراف ہے، کیونکہ میرے سوا غالباً سب اہل اردو اس فقرے کو بہ خوبی سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو

اس کے متعلق شک پیدا ہوتا اور جب شک پیدا ہوتا تو اس پر (کوئی) کچھ لکھتا بھی۔ میری معلومات میں ایسا کوئی مضمون آج تک سامنے نہیں آیا۔''

اس قسم کا دعویٰ صرف اسی شخص کو زیب دے سکتا ہے جس نے غالبیات کا تمام ذخیرہ چھان مارا ہو۔ اعترافِ لاعلمی کے پردے میں یہ ادّعا اور اظہارِ علم بھی دراصل اسی جلد بازی کا نتیجہ ہے جو موصوف کو سلیقے کے ساتھ کوئی کام کرنے یا کسی کام کا حق ادا کرنے کا موقع ہی نہ دیتی تھی۔ اگر موصوف نے واقعی سنجیدگی کے ساتھ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوتی کہ اس سلسلے میں اس سے پہلے بھی کچھ لکھا جا چکا ہے یا نہیں تو یقیناً انھیں ناکامی نہ ہوتی اور یہ حقیقت ان پر منکشف ہو جاتی کہ غالب شناسوں نے اس موضوع کو بھی اچھوتا نہیں چھوڑا ہے۔ اس ضمن میں استاذی پروفیسر ابو محمد سحرؔ کا مضمون 'دیوانِ غالب، وید مقدس اور بجنوری' بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے، جو اولاً ۱۹۷۳ء میں 'ہماری زبان' کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا اور اب ان کے مجموعۂ مضامین 'غالبیات اور ہم' (مطبوعۂ ۱۹۹۴ء) میں شامل ہے۔ بعض اہم نکات ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے مضمون 'بجنوری اور نقدِ غالب' میں بھی آ گئے ہیں جو 'غالب نامہ' کے جولائی ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تحقیق کے جراثیم تو کالڑا صاحب کے اندر بہ افراط موجود تھے لیکن ان کی جلد بازی اور سیماب صفتی ان جراثیم کو پنپنے اور پھولنے پھلنے کا موقع نہ دیتی تھی۔ کوئی نکتہ ذہن میں آتے ہی اسے فوراً سپردِ قلم کر دینا اور پھر پیچھے پلٹ کر نہ دیکھنا ان کی عادتِ ثانیہ بن گیا تھا۔ دوسری طرف ان کے مزاج کی پٹھانیت انھیں برابر مبارز طلبی اور معرکہ آرائی پر اکساتی رہتی تھی، چنانچہ ایسا کوئی موقع ہاتھ آتے ہی وہ اپنی تمام تر فکری توانائی اور زورِ قلم کے ساتھ میدانِ کارزار میں اتر پڑتے تھے اور اپنے حریف کو بہ زعمِ خود ٹھکانے لگا کر ہی چین لیتے تھے۔ اس ہنگامۂ جدال وقتال میں ضمناً بعض کام کی باتیں بھی سامنے آ جاتی تھیں اور کسی حد تک تحقیق کا حق بھی ادا ہو جاتا تھا۔

(ہفت روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی، شمارہ ۱۵/اگست ۱۹۹۹ء)

پروفیسر مختار الدین احمد

پروفیسر مختار الدین احمد کی رحلت اردو ادب کے لیے یقیناً ایک بڑا سانحہ ہے۔ وہ محققین کی اس دوسری نسل کے آخری فرد تھے جس نے اردو تحقیق و تدوین کے بنیاد گزاروں اور نظریہ سازوں کے زیرِ تربیت اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ ان کی شہرت کا آغاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میگزین کے ''غالب نمبر'' کی اشاعت سے ہوا جو ۴۹-۱۹۴۸ء کے تعلیمی سال کے دوران شائع ہوا تھا اور جس میں اس دور کے تمام معروف غالب شناسوں کے مضامین شامل تھے۔ چونکہ اس خاص نمبر کا معیار طالب علمانہ نہیں، عالمانہ اور محققانہ تھا، اس لیے اسے علمی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے ''احوالِ غالب'' اور ''نقدِ غالب'' کے ناموں سے غالبؔ سے متعلق نہایت بلند پایہ اور وقیع مضامین کے دو مجموعے مرتب کر کے شائع کیے، جن کی اشاعت کے بعد غالب شناس کی حیثیت سے ان کی پہچان قائم ہوئی، لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنی اس پہچان کو آئندہ زندگی میں برقرار نہیں رکھ سکے۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے اس میدان میں کوئی ایسا قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا جس کی کسی خاص موضوع کے ایک ماہر سے توقع کی جاتی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں ان کا اہم ترین کارنامہ جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گا، ''کربل کتھا'' کی بازیافت اور تدوین واشاعت ہے۔انھوں نے اس کتاب کے نایاب قلمی نسخے کو ڈھونڈ نکالنے میں جس غیر معمولی ذوق وشوق اور تگ ودو کا مظاہرہ کیا، وہ مثالی حیثیت کا حامل ہے اور ان لوگوں کے لیے جو تحقیق کی صبر طلبی اور حوصلہ آزمائی سے ہمت ہار جاتے ہیں، ہمیشہ مہمیز کا کام دیتا رہے گا۔ اگر چہ ان کی شرافتِ نفس اور سادہ مزاجی کے باعث پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ان کی اس دریافت پر شب خون مار کر اور اس کی اشاعت اور رسمِ اجرا کا جشن منعقد کر کے اخباری اعلانات کی حد تک ان پر سبقت لے جانے میں کامیاب رہے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ اس معاملے میں ہر اعتبار سے شرفِ اولیت کے مستحق پروفیسر مختار الدین احمد ہی ہیں اور کوئی بھی غیر جانب دار مورخ اس کتاب کی بازیافت کا سہرا ان کے علاوہ کسی اور کے سر باندھنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوگا۔

علمی نقطۂ نظر سے ''کربل کتھا'' کے بعد پروفیسر مختار الدین احمد کا دوسرا اہم کارنامہ ''تذکرۂ آزردہ'' کی دریافت ہے۔ شیفتہ کے ''گلشنِ بے خار'' اور لالہ سری رام کے ''خم خانۂ جاوید'' کے علاوہ اس تذکرے کا حوالہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ پروفیسر صاحب نے اپنے قیامِ انگلستان کے زمانے میں کورپس کرسٹی کالج، کیمبرج کی لائبریری میں اس تذکرے کا بھی ایک ناقص الآخر نسخہ ڈھونڈ نکالا اور ہندوستان آنے کے بعد اسے ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کر کے اس سے استفادے کی راہ ہموار کر دی۔ حیدر بخش حیدری کے تذکرے ''گلشنِ ہند'' کی بھی کم وبیش یہی کیفیت ہے۔ موصوف کی شائع کی ہوئی بعض اور کتابیں بھی اہم اور مفیدِ مطلب ہیں لیکن علمی درجہ بندی کے لحاظ سے انھیں وہ مقام حاصل نہیں جو ''کربل کتھا'' کو اور اس کے بعد ''تذکرۂ آزردہ''، ''گلشنِ ہند'' اور علی گڑھ میگزین کے ''غالب نمبر'' کو حاصل ہے۔

یہ بات شاید کم لوگوں کے علم میں ہو کہ مختار الدین احمد صاحب کا پسندیدہ ترین مشغلہ خطوط نویسی اور خطوط کی جمع آوری تھا۔ انھوں نے اپنی بانوے سال کی طویل عمر کا بیشتر حصہ اسی ''کارِ خاص'' کی انجام دہی میں صرف فرمایا۔ وہ بڑی باقاعدگی اور نہایت مستعدی سے خط

لکھتے تھے اور اتنی ہی احتیاط اور اشتیاق کے ساتھ اپنے پاس آئے ہوئے اور دوسروں سے حاصل کردہ خطوط جمع بھی کرتے رہتے تھے۔ان کی خطوط نویسی بھی دراصل علمی اعتبار سے ان کی فیض رسانی کا ایک وسیلہ تھی۔دوستوں کی فرمائشوں کی بجا آوری اور نومشق تحقیق کاروں اور طالب علموں کے استفسارات کی جواب دہی اس خطوط نویسی کا بنیادی محرّک اور مقصد ہوتا تھا۔ ایک بار ڈاکٹر حسن عباس سے جو ان کے مضامین اور کتابوں کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور اشاعت کے سلسلے میں برابر ان کی معاونت کرتے رہتے تھے، مختارالدین صاحب نے از خود فرمایا کہ کیا آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے اب تک کل کتنے خط لکھے ہوں گے؟ حسن عباس صاحب نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ ان خطوط کی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔فرمایا کہ آپ کا اندازہ درست نہیں۔میں اب تک کم از کم پچاس ہزار خطوط ضرور لکھ چکا ہوں۔ان خطوط کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی تھی کہ یہ نہایت خفی اور گٹھے ہوئے خط میں لکھے جاتے تھے اور بالعموم طویل ہوتے تھے۔قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان میں نادر علمی معلومات اور دیگر عصری کوائف کا کتنا وسیع خزانہ محفوظ ہوگا۔

معاصرین کے خطوط کا جتنا بڑا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا اور وہ اسے جس اہتمام اور سلیقے کے ساتھ محفوظ کیے ہوئے تھے، اس کی دوسری مثال شاید مشفق خواجہ مرحوم کے علاوہ کسی اور کے ہاں نہ ملے۔ان میں سے بعض حضرات کے خطوط انھوں نے کتابی صورت میں اور بعض کے رسالوں میں مجموعی طور پر یا بالاقساط شائع بھی کیے۔مشفق خواجہ مرحوم کے خطوط کا مجموعہ جسے ڈاکٹر حسن عباس نے مرتّب کیا ہے، ابھی حال میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔یہ تین سو چوہتر صفحات اور ایک سو چونتیس خطوط پر مشتمل ہے۔اس کی ایک جلد جو ان کا ذاتی نسخہ تھی، انھوں نے ۲۸ر جون کو یعنی انتقال سے صرف دو دن پہلے ڈاکٹر حسن عباس کو بھیجی تھی۔اکبر الہ آبادی کے خطوط کا ایک جامع مجموعہ بھی تقریباً تیار تھا۔اس کے علاوہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے خطوط بھی زیرِ ترتیب تھے۔قاضی عبدالودود کے ایک ہزار سے زائد خطوط ان کے ذخیرے میں موجود تھے۔عرشی صاحب کے خطوط کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔میں نے کئی بار عرض کیا کہ قاضی صاحب اور عرشی صاحب کے خطوط اگر

ترجیحی بنیاد پر دوسرے اکابر کے خطوط سے پہلے شائع کر دیے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا مگر مسلسل اصرار کے باوجود یہ عرض داشت شرفِ قبولیت سے محروم رہی۔ قاضی صاحب اور عرشی صاحب کے خطوط بڑے نادر علمی دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اگر ضائع ہو گئے تو یہ ایک بڑا خسارہ ہوگا۔

مختارالدین صاحب کے مضامین بھی بڑی تعداد میں مختلف علمی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے مگر انھوں نے انھیں مجموعوں کی صورت میں مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں فرمائی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بہ ظاہر ان سے استفادے کے در بند ہوتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ عطا خورشید اور مہر الٰہی صاحبان نے ''مختار نامہ'' میں ان مضامین کی فہرست شائع کر دی ہے تاہم اوّلاً تو یہ ''مختار نامہ'' عام نہیں، ثانیاً جن رسالوں میں یہ مضامین شائع ہوئے ہیں، ان تک رسائی کوئی آسان کام نہیں۔ میں نے ایک بار عرض کیا کہ اتر پردیش اردو اکیڈمی، فخرالدین علی احمد کمیٹی اور قومی اردو کونسل جیسے ادارے کتابوں کی اشاعت میں خاصا تعاون کرتے ہیں، تین چار مجموعے ان اداروں کی مدد سے شائع کیے جا سکتے ہیں۔ غالبؔ سے متعلق مضامین کے مجموعوں کی اشاعت غالب انسٹی ٹیوٹ اور غالب اکیڈمی سے بہ آسانی ہو سکتی ہے، بس اس طرف تھوڑی سی توجہ درکار ہے۔ فرمانے لگے مضامین کا جمع کرنا اور انھیں ترتیب دینا بھی ایک بڑا کام ہے۔ ان کے بعد ان کے اعقاب اور تلامذہ اگر اس ''بڑے کام'' کی ذمہ داری سنبھال لیں تو یہ مرحوم کو ان کے شایانِ شان خراجِ عقیدت بھی ہوگا اور ایک قابلِ قدر ادبی خدمت بھی۔

گذشتہ سطور میں راقم نے مختارالدین صاحب کی عمر بانوے سال بتائی ہے۔ یہ تخمینہ عام تخمینے سے مختلف ہے۔ ان کی وفات پر مختلف اخبارات و رسائل میں جو تعزیتی نوٹ شائع ہوئے ہیں، ان میں اور اس سے پہلے بھی کئی تحریروں میں ان کی تاریخِ ولادت بالاتفاق ۱۴؍نومبر ۱۹۲۴ء لکھی گئی ہے۔ اس حساب سے انتقال کے وقت ان کی عمر کل چھیاسی سال ہوئی لیکن یہ روایت صریحاً غلط ہے۔ مزید برآں غلطی صرف تاریخِ ولادت اور اس کی رو سے عمر کے بیان ہی میں نہیں پائی جاتی، نام اور مقامِ ولادت کے تعین میں بھی پائی جاتی

ہے۔ یہ سارا فساد دراصل ہائی اسکول سرٹیفکٹ کا پیدا کردہ ہے۔ غالباً اسی سرٹیفکٹ کی بنیاد پر مالک رام ''نذرِ مختار'' میں شامل اپنے مضمون ''ذکرِ مختار'' میں لکھتے ہیں:

> ''مختارالدین احمد صاحب کی ولادت ۱۴؍نومبر ۱۹۲۴ء کو پٹنہ میں ہوئی۔ ان کے والد مولانا ظفرالدین کے دو بیٹیاں تھیں، بیٹا گھر میں کوئی نہ تھا۔ ایک پیدا ہوا تھا، وہ چند دنوں بعد وفات پا گیا۔ مولانا اجمیر گئے تو درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی میں حاضر ہوکر انھوں نے دعا مانگی۔ اس کے بعد ان کے ہاں ولادت ہوئی تو بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ''غلام معین الدین'' رکھا گیا بعد کو ''مختار الدین احمد'' نام تجویز ہوا۔'' (ص ۱۸)

''تذکرۂ ماہ وسال'' (مرتبہ مالک رام) میں پیدائش کے وقت رکھے گئے نام ''غلام معین الدین'' کا کوئی ذکر نہیں۔ باقی دونوں اندراجات یعنی تاریخِ ولادت اور مقامِ ولادت ''ذکرِ مختار'' کے عین مطابق ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ پیدائش کے بعد ہفتے عشرے کے اندر ہی ان کے دو نام رکھے گئے تھے، ایک ''غلام معین الدین'' اور دوسرا ''مختارالدین''۔ یہ دونوں نام تاریخی ہیں، جن سے ۱۳۳۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ پہلا نام مرحوم کے والدِ محترم کا تجویز کردہ تھا، دوسرا نام مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے تجویز فرمایا تھا۔ اس دوسرے نام سے متعلق حوالہ ''تذکرۂ علمائے اہلِ سنت'' (مرتبہ مولانا محمود احمد قادری) میں موجود ہے۔ اس تذکرے سے یہ اہم اطلاعات بھی ملتی ہیں کہ مرحوم کی ولادت سہسرام میں اور ماہِ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ میں ہوئی تھی۔ (ص ۱۳۴) ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ از روے تقویم اگست، ستمبر ۱۹۱۸ء کے مطابق ہے۔

جائے پیدائش سہسرام کی بجائے پٹنہ قرار دینے کی وجہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ مختارالدین احمد صاحب کے والدِ محترم ظفرالدین قادری ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء کے درمیان حضرت شاہ سید ملیح الدین سجادہ نشین خانقاہِ کبیریہ، سہسرام کے مدرسے میں مدرسِ اول کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے تھے لیکن ۱۹۲۱ء میں وہاں سے ترکِ ملازمت کرکے

مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ چلے آئے تھے۔ اس لیے سالِ ولادت بدل کر ۱۹۱۸ء کی بجائے ۱۹۲۴ء کردینے کی صورت میں سہسرام کو جائے ولادت قرار دینے کا کوئی منطقی جواز باقی نہیں رہا تھا۔

''تذکرۂ علمائے اہلِ سنت'' ۱۹۷۱ء میں مطبعِ رزّاقی، کان پور میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ''نذرِ مختار'' اس کے سترہ سال بعد ستمبر ۱۹۸۸ء میں اور ''تذکرۂ ماہ وسال'' بیس برس کے بعد نومبر ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ حیرت ہے کہ اس تفاوتِ زمانی کے باوجود نہ تو ان دونوں کتابوں میں اس تذکرے کے اندراجات کی تردید کی گئی اور نہ انھیں تسلیم کرکے صحیح اطلاعات بہم پہنچانے کا فریضہ انجام دیا گیا۔ مختصر یہ کہ پروفیسر صاحب مرحوم کا اصل نام ''مختارالدین احمد'' نہیں، صرف ''مختارالدین'' تھا، ان کی ولادت پٹنہ میں نہیں، سہسرام میں ہوئی تھی اور وہ ۱۴؍نومبر ۱۹۲۴ء کو نہیں، اگست، ستمبر ۱۹۱۸ء کی کسی تاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔

(ہفت روزہ 'ہماری زبان' نئی دہلی، شمارہ ۱۵ تا ۲۱؍ستمبر ۲۰۱۰ء)